رجسٹرڈ ..... ایل ۲۴۸۲ .....

۷۸۶

"ادبی دنیا" جلد ۴ — "ادبی دنیا" نمبر ۱

فہرست مضامین

بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء

تصاویر:۔ (۱) سہ رنگی حسین قیدی۔ (۲) یک رنگی سرونیکٹ رامن جنہیں نوبل پرائز ملا ہے۔ (۳) مولانا نعیم الرحمٰن صاحب ایم اے پروفیسر الٰہ آباد یونیورسٹی۔ (۴) مولانا احسن مارہروی اردو لیکچرار مسلم یونیورسٹی۔ (۵) پرستارِ نغمہ۔ (۶) سر عبدالقادر۔ (۷) معصوم دوست۔ (۸) مایوسی۔

حال وقال

ادبی دنیا کو جاری کر کے ہم جس پُرخطر اور دشوار گزار راستہ پر گامزن ہوئے تھے، سچ تو یہ ہے کہ اس کی تین کٹھن منزلوں کو اس آسانی کے ساتھ ہنستے کھیلتے طے کر دینا ہمارے بس کی بات نہ تھی، اگر خدائے بزرگ کا فضل شامل حال نہ ہوتا۔

جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

اب اس سے ہماری التجا ہے کہ آئندہ بھی وہ اسی طرح اپنے کرم ہائے بے پایاں کو ہمارا رفیق سفر بنا کر ہمیں راستے کے خطرات سے بچائے۔

اصنافِ ادب سے متعلق مضامین گزشتہ جنوری سے لے کر دسمبر تک بارہ پرچوں میں اصنافِ ادب سے متعلق حسب ذیل مضامین شائع ہوئے۔

(۱) افسانے -	۸۰	(۶) تاریخی مضامین -	۴۰
(۲) تازہ نظمیں -	۷۵	(۷) علمی مضامین -	۳۵
(۳) تعلیمی مضامین -	۵۲	(۸) ڈرامے -	۱۳
(۴) اخلاقی مضامین -	۴۸	(۹) یک رنگی و سہ رنگی تصاویر -	۱۰۰
(۵) تنقیدی مضامین -	۳۵	(۱۰) مشرق و مغرب کے لٹریچر سے بہترین مضامین کے دلکش حصوں کا اقتباس اور ترجمہ -	۸۰

(۱۱) آئینۂ عالم کے تحت میں دنیا بھر کے علمی ارتقا - ایجادات - تحریکات - اصلاحات اور تعلیمی رفتار کی بابت تازہ ترین معلومات پر مضامین ۳۰

یہ دلچسپ اور بلند پایہ مضامین ادبی دنیا کے نو سَو صفحات کی وسعت میں سمائے ہیں - لیکن اگر انہیں مضامین کو کتابی طرز تحریر میں کتابی سائز پر لکھا جائے تو یہ یقیناً ساڑھے تین ہزار صفحات سے کم میں نہ سما سکیں گے۔

تصاویر سہ رنگی تصاویر بارہ کی بجائے چودہ ہیں جن کے بلاک آرٹ پیپر اور طباعت پر ڈھائی ہزار روپیہ کے لگ بھگ خرچ ہوا ہے - یک رنگی تصاویر چھیاسی ہیں - سال بھر کے پرچوں سے سہ رنگی و یک رنگی سنولڑی بڑی تصویروں کا البم بن جاتا ہے - ادبی دنیا کا تصویری معیار جتنا بلند ہے دوست و دشمن سب تسلیم کرتے ہیں کہ اس پہلو میں ادبی دنیا بے نظیر ہے - ادبی دنیا کی اکثر تصاویر رسالہ سے نکال کر فریم میں لگائی جاتی ہیں۔

مضامین کی حیثیت ادبی دنیا کے علمی و تنقیدی مضامین اربابِ علم کے حلقوں میں نہایت وقعت اور پسندیدگی کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں - اور اُن کی سنجیدگی، متانت اور عظمت کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

ادبی دنیا کے افسانے عریانی، حیاسوزی اور بے باکی سے کلیۃً پاک اور عموماً اخلاق آموز، عبرت آموز اور انسانیت آموز ہوتے ہیں۔ اِس بارے میں اتنی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے کہ اگر کسی افسانے میں ایک جملہ بلکہ ایک لفظ بھی متانت اور سنجیدگی کے دائرہ سے خارج نظر آتا ہے تو اُسے قلمزد کر دیا جاتا ہے - لیکن بایں ہمہ قیود و احتیاط وہ بہت دلکش اور پُرکیف ہوتے ہیں - اہل الرائے اِس کا اعتراف کرنے لگے ہیں کہ ادبی دنیا سب سے پہلا رسالہ ہے جس نے حسن و عشق کے عُریاں افسانوں کے مقابلہ میں بلند پایہ اخلاقی اور اصلاحی افسانوں کو عام پسند بنا کر ذوقِ عامّہ کی اصلاح کی ہے۔

نظمیں ادبی دنیا کی نظموں کا معیار شروع ہی سے نہایت ارفع اور اعلیٰ رکھا گیا ہے، اور رطب و یابس سے رسالہ کے صفحات کو پُر کرنے سے ہمیشہ اجتناب کیا گیا - نظموں کے بلند معیار کو قائم رکھنے کے لئے ہم نے انتہائی کوشش صرف کر دی ہے۔ ابتدا میں اِس معیار کو قائم رکھنا ہمارے لئے بہت مشکل تھا۔ اس لئے جس نمبر میں کوئی معیاری نظم نہ مل سکی، اُس میں ہم نے شعرائے ماضی و حال کی بہترین پُرانی نظمیں شائع کر دیں۔ اور اس بارے میں کسی طعن و تشنیع اور انگشت نمائی کی شمہ بھر پروا نہیں کی - ہماری اِس اصول پسندی اور ثابت قدمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ایک سال سے ادبی دنیا کے ہر نمبر

میں چار پانچ تازہ معیاری نظمیں شائع کی جا رہی ہیں، اور ادبی دنیا کے حلقۂ اشاعت میں خاص قسم کی بلند پایہ اور خرد افروز نظمیں کہنے والے متعدد سحر طراز پیدا ہو گئے ہیں۔ یقیناً اس پہلو میں بھی ادبی دنیا سب سے خوش نصیب اور ممتاز ہے۔

حضرت فاخر۔ اختر۔ روش، عدم۔ شرما وغیرہ کی سحر طرازیوں کے نمونے سامنے رکھ کر ہمارے اس دعوے کی تصدیق کیجئے۔ سید عابد علی ادبی دنیا میں آنے سے پہلے بھی ایک مشہور نظم نگار تھے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ادبی دنیا میں آ کر وہ کچھ سے کچھ بن گئے ہیں۔ عابد نے ادبی دنیا کے لئے جو نظمیں کہی ہیں ہمیشہ غیر فانی رہیں گی۔

فاخر لاہور کی ادبی مجلسوں میں ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے روشناس رہ چکے ہیں، لیکن ادبی دنیا کا فاخر جس جاہ و جلال سے اس میدان میں اُترا ہے اُس کے تیور دیکھ کر حریفانِ فن میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ فاخر جس بلندی پر کھڑا ہو کر اپنا منظوم الہام دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جوش ملیح آبادی کی نگاہیں بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتیں۔

ادبی دنیا کی اشاعت آجکل ادبی دنیا پانچہزار چھپ رہا ہے۔ ڈیڑھ سال کی قلیل مدت میں اس کی اشاعت کا پانچہزار تک پہنچ جانا۔ موجودہ عالمگیر بے کاری اور بے روزگاری کو دیکھتے ہوئے بلاشبہ بہت کچھ حوصلہ افزا ہے، لیکن ....

لیکن کے آگے کچھ لکھتے ہوئے قلم جھجکتا ہے کہ اپنی دشواریوں اور مصیبتوں کو رسوا کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

"خود کردہ را علاجے نیست"

اگر رواجِ عام کے مطابق ادبی دنیا بھی تجارتی اصول پر جاری رکھا جاتا تو پانچ ہزار کی اشاعت سے کم از کم پانچ سو روپیہ نفع تو ضرور ہی مل جایا کرتا۔ لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ ہمیں موجودہ صورت میں پانسو روپیہ ماہوار سے زیادہ کا نقصان ہو رہا ہے۔ اب ہم سخت کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اسے نہ ہمارا ہی دل گوارا کرے گا کہ ادبی دنیا کی موجودہ صوری اور معنوی شان و عظمت میں کوئی کمی کی جائے، اور نہ خریدار ہی مانیں گے اور ایسی شان پر اسے جاری رکھنے کے لئے دو ہزار روپیہ ماہوار نقد یا کسی خدا رسیدہ بزرگ کی کرامت درکار ہے۔ روپیہ ہمیں بنانا نہیں آتا۔ اور رسائی ہماری خدا چھوڑ انسان تک بھی نہیں۔ پھر ظہورِ کرامت کی توقع بھی کیوں کریں۔

دیتے ادبی دنیا کے معزز خریدار۔ اُن سے یہ درخواست کرنا کہ وہ ایک ایک خریدار کی بھیک ہمارے دامن میں ڈالیں۔ ہماری غیرت اور خودداری تو اسے گوارا نہیں کرتی، اور ہمیں اس کی جرأت ہو بھی تو کس برتے پر جبکہ ہم جانتے ہیں کہ تعلیم یافتہ حضرات بھیک مانگنے سے زیادہ بھیک دینے کو جرم سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ادبی دنیا کے بلند معیار کو قائم رکھنے کے لئے ایک ایک جدید خریدار کا مہیا کرنا ضروری ہوگا تو وہ خود ہی اس آسان تجویز پر عمل کریں گے۔ اور ہماری احتیاج کو شرمندۂ سوال نہ ہونا پڑے گا۔

اہلِ نظر اہلِ نظر جو شروع ہی سے ہر آڑے وقت میں ادبی دنیا کی امداد کرتے رہے ہیں۔ ہماری نگاہ تو پھر پھر اکر اُنہیں پر پڑتی ہے۔ اِس لئے ہم اپنے دردِ دل کو عام رسوائی سے بچانے کے لئے کیوں نہ اُنہیں کے سامنے پیش کریں، جو درد آشنا بھی ہیں اور دردرُبا بھی۔

تعلیم و اہلِ تعلیم پنجاب کے محکمۂ تعلیم اور افسرانِ تعلیم کی بیش بہا امدادوں اور مفید مشوروں کا اعتراف نہ کرنا انتہا درجہ کی ناشکری ہوگی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رسالہ کو اِس بلند مقام پر پہنچانے میں افسرانِ محکمۂ تعلیم کی بہترین رہنمائی کو بڑی حد تک دخل ہے۔ یہ اُنہیں کی رہنمائیوں کا نتیجہ ہے کہ ادبی دنیا کا ½ حصہ بہترین قسم کے تعلیمی مضامین سے پُر ہوتا ہے۔ اور ادبی رسالوں میں صرف ادبی دنیا ہی ایک ایسا رسالہ ہے جسے خالص تعلیمی رسالہ کہا جا سکتا ہے۔ ہم نے تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کے ذوق کی سیرابی کے لئے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی رفتارِ تعلیم پر مفید مضامین شائع کرتے رہیں۔ طلبہ کے لئے ہم نے دو تین ایسے قابل ترین اہلِ قلم کی خدمات حاصل کر لی ہیں جو ادبی دنیا میں اِس قسم کے مضامین لکھا کریں گے جن سے طلبہ کے ذہنی نشوونما اور ارتقا کو بیحد مدد ملیگی۔ اِس کے علاوہ یورپ کے مشہور مصنفین کا بہترین لٹریچر بھی سات سو روپیہ خرچ کر کے خرید لیا گیا ہے۔ جس کے مفید اور دلچسپ حصوں کا ترجمہ بھی شائع کیا جایا کرے گا۔ اور رسالہ کا مستقبل تعلیمی مضامین کے اعتبار سے ماضی کی بہ نسبت کہیں زیادہ شاندار ہوگا۔ لیکن اِسی کے ساتھ ہم تعلیم کا تجربہ رکھنے والے حضرات سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے وسیع تجربہ سے اہلِ تعلیم کو فائدہ پہنچانے کے لئے عمدہ اور مفید مضامین ادبی دنیا میں ارسال فرماتے رہا کریں۔ ہم اِس زحمت کی تلافی کے لئے علاوہ دلی شکریہ کے اُن کی خدمت میں ادبی دنیا کی حیثیت کے مطابق نذرِ حقیر پیش کرنے سے بھی گریز نہ کریں گے۔

اہلِ قلم کا شکریہ

اخیر میں ہم اُن اہلِ قلم حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں جن کی توجہاتِ خصوصی نے ادبی دنیا کا علمی اور ادبی معیار اتنا بلند کر دیا ہے کہ دوسروں کی رسائی وہاں تک دشوار ہو گئی ہے۔ درحقیقت یہی وہ طبقہ ہے جسکی دماغ سوزیوں نے ادبی دنیا کو ادبی دنیا بنا دیا ہے۔ اور اب وہ ایک ممتاز حیثیت کا مالک نظر آتا ہے۔ ہمیں اپنے ان کرمفرماؤں سے توقع ہے کہ آئندہ بھی ادبی دنیا اُن کی توجہات کا مرکز بنا رہیگا۔ اُنہیں یقین رکھنا چاہیئے کہ ادبی دنیا بھی اپنی بساط کے مطابق ان کی خدمت کرنے میں کوتاہی نہ کرے گا۔

ادبی دنیا کے اہلِ نظر سے گزارش ہے کہ تھوڑا سا وقت نکال کر اس کی خامیوں سے کبھی کبھی ہمیں مطلع فرماتے رہیں، اور اس کے متعلق مفید عملی مشوروں سے وقتاً فوقتاً ہماری رہنمائی کرتے رہیں۔ اس گزارش کے مخاطب وہ حضرات نہیں ہیں جو ہندوستان میں بیٹھ کر آٹھ پہر یورپ اور امریکہ کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ یعنی اس خبط میں مبتلا ہیں کہ ہندوستان میں ہر کام اُسی پیمانے اُسی شان اور اُسی ٹھاٹ سے کیا جائے جس شان سے یورپ اور امریکہ میں ہوا کرتا ہے اور اگر ایک شمہ بھر بھی کمی ہوئی تو کام کرنے والا مجرم اور کام قابلِ نفریں ہے۔

اپنی حیثیت اور گنجائش کے مطابق ادبی دنیا کی طرف سے ہم اہلِ قلم کو اچھے مضامین کا معاوضہ پیش کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی اس اصول کو نباہنے کی نیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس قاعدے کو ہمہ گیر و ہمہ بیں بنانا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ لہٰذا اگر کسی صاحب کو اُن کے مضمون کا معاوضہ کبھی نہ پہنچے تو بس سمجھ لیں کہ بجٹ میں گنجائش نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جن مضامین پر ایڈیٹر کو زیادہ اصلاح کرنی پڑے یا جو مضامین قابلِ اندراج ہوں مگر قابلِ معاوضہ نہ سمجھا جائے ان پر بھی معاوضہ نہیں دیا جا سکیگا۔ ہم سے بعض معاصرین نے دوستانہ شکایت کی ہے کہ ادبی دنیا کی معاوضہ بخشی رسم نے اُن کے لئے مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ جو مضمون نگار پہلے صرف اس امر کو اپنے مضمون کا صلہ سمجھتے تھے کہ اُن کا مضمون شائع کر دیا جائے وہ بھی اب معاوضہ طلب کرنے پر مصر نظر آتے ہیں۔

ادبی دنیا کے محترم نگران آنریبل جسٹس سر عبدالقادر ادبی دنیا کی روز افزوں ترقی سے خاص طور پر دلچسپی لے رہے ہیں۔ ادبی دنیا کی ترتیب و تدوین بلکہ اس کی اشاعت کے متعلق بھی اُن کے مسلسل مفید مشوروں سے ہمیں بہت کچھ مدد ملتی رہتی ہے۔ اِس نمبر میں اُن کی تازہ ترین تصویر شائع کی جا رہی ہے۔

سر وینکٹ رامن مشہور ہندوستانی ماہرِ طبیعیات کو پچھلے دنوں "نوبل پرائز" ملا ہے۔ ہم ایک ہندوستانی اور علم و فن کے ایک خادم ہونے کی حیثیت سے اس اعزاز پر اظہارِ مسرت کرتے ہیں۔

افسوس ہے کہ مدر انڈیا کی مصنفہ کو ہندوستان کا تاریک پہلو ہی نظر آیا۔ اُس کی کم بیں اور عیب چیں نگاہ ہندوستان کے اِن تابناک ستاروں کو نہ دیکھ سکی۔

ادبی دنیا اپنی شان و صورت اپنی رنگین تصاویر اور اپنے دلچسپ مضامین کے سبب محکمۂ ڈاک کو بہت پسند آگیا ہے۔ ہر ماہ ایک سو پرچے شکایتوں کی تلافی کے لئے دفتر کو دوبارہ بھیجنے پڑتے ہیں۔ ہمارے دفتر سے تمام پرچے چیک ہو کر اور کئی کئی دفعہ چھان بین کے بعد ڈاک خانے کے سپرد کیے جاتے ہیں۔ ہمارے سامنے ڈاکخانے سے سب پرچے صحیح سالم روانہ کر دیئے جاتے ہیں مگر آگے جا کر خریداروں کے مقامی ڈاکخانوں پر لُٹس شروع ہو جاتی ہے۔ ہم برابر پوسٹ ماسٹر جنرل کو شکایات بھیجتے رہتے ہیں۔ حضرات خریداران کو بھی اپنے اپنے ڈاکخانے پر نگرانی رکھنی چاہیئے۔ اِس کے علاوہ اظہارِ حال پر یقین کر لینا چاہیئے کہ ہماری سب سے بڑی مسرت اور خواہش یہ رہتی ہے کہ ادبی دنیا کے معزز خریداروں کو رسالہ نہ پہنچنے کی شکایت باقی نہ رہے۔ رسالہ جب نہ پہنچے تو سمجھ لیجئے کہ راستے میں کہیں گم کر دیا گیا ہے۔ یہ بالکل سچی بات ہے کہ رسالہ گم ہو جانے اور نہ پہنچنے کا رنج اتنا خریدار کو نہیں ہوتا ہوگا جسقدر کوفت ہمیں ہوتی ہے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کی تصانیف میں سے چند الہٰی کتابیں جن کا مطالعہ ہر مذہب کے پیروؤں کیلئے یکساں طور پر مفید ہے۔ انتخاب کر کے انکا اشتہار دیا جا رہا ہے۔ ادبی دنیا کے قارئین سے گزارش ہے کہ وہ ان نہایت مفید کتابوں کو اپنے لئے اپنے بچوں اور اپنی مستورات کے مطالعہ کیلئے ضرور

تقریب

مَن کی ماہیت

مولانا نعیم الرحمٰن ایم اے، پروفیسر عربی الٰہ آباد یونیورسٹی کا محققانہ مقالہ تعریف سے مستغنی ہے۔ یوں تو ہم بہت سے مضامین کو "علمی مضامین" کہہ دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہت کم کوششیں اس تعریف کی مستحق ہوتی ہیں۔ "مَن کی ماہیت" مقالہ نگار کی قوتِ فکر اور اصابتِ رائے کا ایک شاہکار ہے۔

موٹر سائیکل

مسٹر لطیف الرحمٰن کو مزاحیہ مضامین لکھنے میں کمال حاصل ہے۔ اس قسم کے مضامین میں اکثر ایک ہلکا سا طنز کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ یہی ہلکا سا طنز ایسے مضامین کی جان ہوتا ہے۔ ذرا سی تلخی اس سے خوشگوار کو تند و تیز بنا دیتی ہے۔

نگہ از رم آبگینۂ دور ساغر انگنم

موٹر سائیکل میں مغربی معاشرت کے فقدانِ سکون و امن کی طرف ایک مزاحیہ انداز میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہی اشارہ اس مضمون کا "طنز" ہے۔

تاریخ کے تعلیمی فائدے

سید حسن برنی کے متنوع نوازشات کی دوسری قسط ہے۔ ہم نادم ہیں کہ پچھلی اشاعت میں اُن کے مضمون کے متعلق یہ لکھ گئے کہ وہ اناطول فرانس سے ماخوذ ہے۔ "تاریخ" جو گزشتہ اشاعت میں شائع ہوا ہے دراصل تاریخ کے متضاد نظریوں کے متعلق سید صاحب کی تنقید پر مبنی ہے۔

بہادر شاہ کی اولاد

حضرت خواجہ حسن نظامی کے مضامین کی دوسری قسط ہے، اور پہلی کی طرح دل آویز۔

چند دکنی مرثیہ گو

مولینا نصیر احمد ہاشمی مدت سے دکن کے مرثیہ گو شعرا کے متعلق ریسرچ کر رہے ہیں۔ اور اس ریسرچ کے ثمرات سے ادبی دنیا کا دامن مالا مال ہوتا ہے۔

سر جگدیش چندر بوس

اس مشہور و معروف سائنس دان کے نام سے تو اکثر ہندوستانی واقف ہونگے۔ لیکن شاید اکثر لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ بوس نے یہ ثابت کیا ہے کہ پودوں میں بھی زندگی ہوتی ہے۔ وہ بھی ہماری طرح بیرونی ہیجانات سے متاثر ہوتے ہیں۔

کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

محبت

موپساں کے ایک شاہکار کا ترجمہ ہے۔ انسان یہ خیال کرتا ہے کہ شاید اس دل افروز جذبے سے صرف وہی صحیح معنی میں متاثر ہوتا ہے۔ لیکن شاعر اور افسانہ نگار کی چشمِ بصیرت دیکھتی ہے کہ کوئی جاندار اس آگ سے خالی نہیں۔

آوازِ غیب

تخیل کی فریب کاری کی تصویر ہے۔ مصنف خود اس بات کا ادعا نہیں کرتا کہ حیرت انگیز واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ کردار اپنے اپنے عملِ تخیل کے مطابق واقعات یا تخیلات؟ میں اُلجھتے ہیں۔ اور اپنے اپنے تخیل کے مطابق متاثر ہوتے ہیں۔

غالب کے اس مصرع کی کیسی اچھی تعبیر ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال

کسان کی وصیت

انسان کمزوریوں کا آئینہ ہے۔ اور جس طرح فاضل مصنف نے افسانے کے آخری حصے میں ڈرامیائی تضاد اور صنعتی تقابل سے کام لیا ہے وہ تعریف سے بالاتر ہے۔ ایک طرف موت۔ سرد۔ خوفناک۔ دوسری طرف زندگی۔ ایک بچے کی صورت میں۔ بڑھتی ہوئی — موت سے ناآشنا۔

ادارہ

تصحیح

اِس سُرخی کے تحت میں مروجہ غلط الفاظ اور محاورات وغیرہ کی تصحیح شائع کی جایا کرے گی۔

رُجحان

بڑے بڑے تعلیم یافتہ حضرات بھی رُجحان کا تلفظ غلط استعمال کرتے ہیں، غلط تلفظ میں حرف کی ترتیب حسب ذیل ہے:۔

پہلے حرف "رُ" پھر حائے حطی اُس کے بعد ج۔ رُجحان

یہ اِس لفظ کا صحیح تلفظ نہیں۔ صحیح تلفظ حسب ذیل ہے:۔

رُ ج ح ان

یاد رکھئے رُجحان میں حائے حطی سے پہلے جیم ہے

رُ ج ح ا ن

رُجحان

ادارہ

آئینۂ عالم

آگ بجھانے والے ہوائی جہاز

نیویارک کی آبادی بڑھ رہی ہے۔ اور اس میں روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے، یہاں کی عمارتیں اسقدر بلند اور سر بفلک بنائی جاتی ہیں، کہ آتشزدگی کی صورت میں معمولی فائر بریگیڈ کام نہیں آسکتا۔ اگرچہ ان عمارتوں کے ہر حلقے میں آگ بجھانے والے آلات موجود رہتے ہیں۔ لیکن تحقیقات سے معلوم ہوا ہے، کہ یہ آلات بالکل ناکافی اور اس وجہ سے بے سود ثابت ہوئے ہیں۔ فائر بریگیڈ کے انجن اگرچہ بہت زیادہ بلندی پر پانی پھینک سکتے ہیں، لیکن یہاں کی عمارتوں کی بلندی کے سامنے یہ بھی اب ناکافی ثابت ہو رہے ہیں۔ نیویارک کا فائر ڈیپارٹمنٹ اس ضرورت کو پورا کرنے کی فکر میں تھا۔ سینکڑوں طریق سے تجربات کئے گئے۔ کوئی ناکام رہا۔ اور کسی میں قدرے کامیابی حاصل ہوئی۔ بالآخر ڈیپارٹمنٹ کے سامنے ایک تجویز آئی ہے کہ فائر بریگیڈ کے ہوائی جہاز بنائیں جائیں۔ ایک ماہر پرواز نے یہ کام اپنے ذمے لیا۔

اب معلوم ہوا ہے کہ اس مقصد کے لئے ایسے ہوائی جہاز بنائے گئے ہیں جو دیگر ہوائی جہازوں کی طرح پہلے زمین پر دوڑ کر اور پھر چکر کاٹتے ہوئے ہوا میں نہیں جاتے، بلکہ جہاں اُن کا قیام ہو۔ وہیں سے فوراً سیدھے بلندی کی طرف پرواز کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح چکر کاٹ کر اور پھر زمین پر دوڑ کر اترنے کی بجائے جس مقام پر انہیں اُترنا ہو۔ فوراً نیچے عین اُسی مقام پر اُتر بھی سکتے ہیں۔ اس ہوائی جہاز میں چند فائر مین فائر لمپ۔ اور پانی والی نالی ہوگی۔ جس عمارت میں آگ لگ رہی ہوگی اُس کے سامنے کی عمارت کے چھت پر ہوائی جہاز اتریگا۔ اور اس عمارت کے پانی والے نل سے آگ بجھانے کے لئے پانی حاصل کیا جائیگا۔ اِس کے علاوہ اس جہاز میں کلہاڑے۔ رسّے اور چوبی سیڑھیاں بھی ہونگی۔ جو حالات کے مطابق استعمال میں لائی جائینگی۔ لیکن سب سے زیادہ مفید اور کارآمد بات یہ ہوگی کہ یہ ہوائی جہاز آتشزدگی کی واردات کی خبر ملنے پر شہر کے دور سے دور مقام پر فوراً پہنچ سکیگا۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ دس یا پندرہ برس کے بعد نیویارک کے فائر بریگیڈ میں معمولی موٹروں کی بجائے ہوائی جہاز ہی کام میں آیا کریں گے۔

ڈاک کے ردی ٹکٹوں کی قیمت

ہمارے اور آپ کے نزدیک ڈاک کے ٹکٹوں کی جب وہ نئے ہوں اتنی ہی قیمت ہوتی ہے جو محکمۂ ڈاک ہم سے طلب کرتا ہے۔ اس پر مہر لگ جانے کے بعد ہمارے نزدیک یہ ٹکٹ ردّی ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان کی کوئی قیمت نہیں رہتی۔ لیکن یورپ اور خاص کر امریکہ میں بیشمار ایسے لوگ ہیں، جنھوں نے ردّی ٹکٹوں کو جمع کرنا اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ انہیں بڑے بڑے خوبصورت البموں میں چسپاں کرتے ہیں۔ اور ان کی اس طرح حفاظت کرتے ہیں جس طرح کوئی جوہری اپنے ہیروں الماسوں اور موتیوں کی۔ ہم اسے "پاگل پن"۔ کہینگے۔ لیکن امریکہ کے بڑے بڑے وکیل۔ ڈاکٹر۔ بینکر اور کروڑ پتی اس "دیوانگی" میں مبتلا ہیں۔ یہ "دیوانگی" صرف ان طبقوں تک ہی محدود نہیں۔ معمولی سے معمولی ہوٹل والا۔ اور غریب سے غریب موم بتی بنانے والا بھی اس سے محفوظ نہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ صرف ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دو لاکھ کے قریب آدمی ردّی ٹکٹ جمع کرتے رہتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ استعمال شدہ یا غیر مستعمل ٹکٹ جسقدر پرانا ہوگا۔ پرانی شراب کی طرح اس کی قیمت بھی گراں ہوگی۔ چنانچہ ایک ایسا ہی ٹکٹ دس لاکھ ڈالر کو فروخت ہوا۔

اس طرح کے ٹکٹ جمع کرنے والے اپنے آپ کو "فائی لیٹے لسٹس" کہتے ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور و معروف ڈاکٹر ہے۔ اس کے پاس ٹکٹ زیادہ تعداد میں نہیں، لیکن جتنے بھی ہیں، وہ اسقدر قیمتی تصوّر کئے جاتے ہیں۔ کہ اگر ڈاکٹر مذکور انہیں فروخت کرنا چاہے تو اسے چھ لاکھ ڈالر مل سکتے ہیں۔ ایک اخباری نمائندے سے ملاقات کے دوران میں اس نے کہا: "میں مستعمل اور نئے ٹکٹ صرف "شغل" کے طور پر

جمع کرتا ہوں۔ اگرچہ یہ "شغل" آمدنی بڑھانے والا ہے۔ لیکن میں اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ کیونکہ میں یہ ٹکٹ فروخت نہیں کرتا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں۔ کہ میرے مجموعے میں نادر ٹکٹ جمع ہوں۔ اور اسی خواہش کے زیر اثر میں نے یہ "شغل" اختیار کر رکھا ہے۔ اس ڈاکٹر کے پاس امریکہ کے وہ ٹکٹ بھی ہیں جو اول ہی اول اس ملک میں ۱۲ مئی ۱۸۴۷ء میں جاری کئے گئے تھے۔ اس زمانہ کے ۴۹ ٹکٹ اس کے پاس ہیں۔ جب نئے جاری ہوئے تھے تو ان کی قیمت ۵ سینٹ فی ٹکٹ تھی۔ لیکن آج ان میں سے ہر ایک ٹکٹ کی قیمت جو غیر مستعمل ہے۔ ۱۰۰ ڈالر ہے۔ اور جو استعمال شدہ ہیں۔ ۶۰ ڈالر۔

قطب شمالی کو آبدوز میں

انگلستان کے مشہور سیاح اور سائنسدان سر ہیوبرٹ ولکنس مئی ۱۹۳۱ء میں قطب شمالی کی سیاحت کو جانے والے ہیں۔ انگلستان سے سپٹز برگ تک تو آپ معمولی جہاز میں جائیں گے۔ اور سپٹز برگ سے آگے آپ ایک امریکن آبدوز میں سفر کریں گے۔ اس آبدوز میں اپنی پارٹی سمیت آپ الاسکا جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جو قطب شمالی کی دوسری جانب ہے۔ اور سپٹز برگ سے ۲ ہزار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ آبدوز میں یہ ۲ ہزار میل کا سفر ۵۰ دن میں طے ہوگا۔ ایک نمائندۂ اخبار سے ملاقات کے دوران میں آپ نے فرمایا۔ "یہ سفر معمولی جہاز میں طے نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قطب شمالی کا سمندر تقریباً ہر وقت منجمد رہتا ہے۔ اور معمولی جہاز کا ایسے سمندر میں چلنا ناممکن ہے۔ ہم آبدوز میں سمندر کی سطح پر سفر کریں گے۔ لیکن جب ہم دیکھیں گے کہ برف ہماری راہ میں حائل ہے تو ہم فوراً زیر آب ہو جائیں گے۔ اور اس طرح قدرت کے اس مانع کو جو آج تک انسانوں کی راہ میں سد سکندری بنا رہا ہے۔ ہم دھوکا دیکر برف کے نیچے ہی نیچے آگے کو نکل جائیں گے۔" سر موصوف کا خیال ہے۔ کہ اس سمندر میں برف کی تہ اوسطاً دس فٹ موٹی ہوتی ہے۔ لیکن مناسب یہی ہوگا۔ کہ آبدوز ۲۵ فٹ کی گہرائی تک سمندر میں چلی جائے۔ اس آبدوز کی ساخت میں اس بات کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے۔ کہ یہ بیک وقت ۲½ دن تک زیر آب رہ سکے۔ اس کی لمبائی ۱۷۵ فٹ ہے اور وزن ۵۰۳ ٹن۔ سطح سمندر پر اس کی رفتار ۱۴ ناٹ اور زیر آب ۹ ناٹ فی گھنٹہ ہوگی۔ اور قیاس کیا گیا ہے۔ کہ برف کے نیچے اس کی رفتار ۴ میل فی گھنٹہ سے کم ہوگی۔ یہ آبدوز امریکن ساخت کی ہے۔

سر ہیوبرٹ کی پارٹی ۱۸ افراد پر مشتمل ہوگی۔ اور اس میں یورپ کی تمام اقوام کے مشہور سائنسدان ہونگے۔ سر ہیوبرٹ کا دعویٰ ہے۔ کہ اس آبدوز میں انہیں اشیائے خورد و نوش کے متعلق کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو سکیگی۔ اس امر کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ کہ شروع سے آخر تک اس سفر کی بولنے والی فلم بنائی جائے۔ اس کے علاوہ سر ہیوبرٹ کا ارادہ یہ بھی ہے کہ وہ ہر روز اپنے سفر کے حالات "براڈکاسٹ" کیا کریں گے۔ یہ عمل صرف اس وقت ہی ہو سکیگا جب آبدوز سطح سمندر پر ہوگی۔ سر ہیوبرٹ نے اخباری نمائندے سے اس سلسلہ میں کہا۔ "اس وقت خوب لطف رہیگا جب ہم "براڈکاسٹ" کرتے ہوئے ساری دنیا سے کہیں گے۔" اچھا دوستو الوداع۔ اب ہم سمندر میں غوطہ لگانے کو ہیں۔"

سمندر کی تہ میں سکول

سیاسی (امریکہ) یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ایف ڈبلیو پرسن نے سمندر کی تہ میں لے جاکر ان لڑکوں کو تعلیم دینا شروع کی ہے جنہیں جہازرانی کی زندگی اختیار کرنی ہے۔ یہ طلبا ہر ہفتہ ایک خاص طرز اور ساخت کی کشتیوں میں بیٹھکر سمندر کی تہ میں جاتے ہیں۔ ان کشتیوں کے نیچے کا حصہ شیشے کا بنا ہوا ہے۔ جس میں سے وہ سمندری پیداوار اور مخلوق کو بآسانی دیکھ سکتے ہیں۔ ایسے موقع پر یہ طلبہ نہانے کا لباس پہن کر جاتے ہیں۔ اور جب سمندر کی تہ میں پہنچتے ہیں تو اپنے سروں پر غواصوں کا خود پہن کر تہ آب کی سطح پر کود جاتے ہیں۔ اور بآسانی تمام ادھر ادھر سیر کر مشاہدہ کرتے ہیں۔ سانس کے لئے ہوا کا بندوبست ان کشتیوں میں ہوتا ہے جو ان کے ساتھ آتی ہیں لیکن جب وہ نیچے جاتے ہیں، تو وہ سطح آب پر رہتی ہیں۔ اور مشین کے ذریعے انہیں ہوا پہنچاتی رہتی ہیں۔

بارہ سالہ انجنیر

فلیڈلفیا کے ایک بارہ سال کے لڑکے نے ایک چھوٹی سی موٹر کار خود بنائی ہے۔ اس پر صرف ایک ڈالر لاگت آئی تھی۔ اس کا انجن تین گھوڑے کی طاقت کا ہے۔

یوسف

مَنّ کی ماہیّت

یہودی قوم کی تاریخ اور اُس کے مذہب کے مطالعہ کرنے اور اُن سے واقفیت رکھنے والے عموماً مَنّ اور سَلوٰی ــــ مَنّ اور بٹیر ــــ کے نام سے آشنا ہیں، جن کے بارے میں عام عقیدہ یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں خدا نے یہودیوں کو خاص طور پر عطا کی تھیں۔ اور ایک معجزے کی شان سے ہر روز اُن کو نصیب ہوتی تھیں ــ آئندہ سطروں کا مقصد یہ ہے کہ مَنّ کے متعلق کچھ عرض کیا جائے۔ جو نہ صرف یہ کہ اِن دونوں میں زیادہ اہم اور عجیب چیز شمار ہوتا ہے ۔ بلکہ اِس کے بارے میں عجیب وغریب اور دلچسپ باتیں بھی بیان کی جاتی ہیں۔

مَنّ کا ذکر یوں تو انجیلِ مقدّس کے عہدِ عتیق میں بہت سے مقامات میں آتا ہے، مگر اِن سب میں جو زیادہ اہم ہیں وہ انجیل کے لفظوں میں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) کتابِ خروج[۱] کا سولھواں باب یوں شروع ہوتا ہے کہ

"پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت زمینِ مصر سے خارج ہو کر دوسرے مہینے کے پندرھویں دن سین کے بیابان میں، جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے، پہنچی اور ساری جماعت بنی اسرائیل کی اس بیابان میں موسیٰ اور ہارون پر جھنجھلائی۔ اور بنی اسرائیل بولے کہ کاش ہم خداوند کے ہاتھ سے زمینِ مصر میں جس وقت کہ ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھتے تھے اور روٹی من بھر کے کھاتے تھے، مارے جاتے۔ کیونکہ تم ہم کو اُس بیابان میں نکال لائے ہو کہ سارے مجمع کو بھوک سے ہلاک کرو۔"

اس "جھنجھلانے" کا جو نتیجہ ہوا وہ تیرھویں آیت سے اِس باب کے آخر تک یُوں بیان ہوا ہے:۔

"اور یوں ہوا کہ شام کو بٹیریں اِدھر آئیں اور پڑاؤ کو چھپا لیا، اور صبح کو لشکر کے آس پاس اوس پڑی۔ اور جب اوس پڑ چکی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیاباں میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز، ایسی سفید جیسے برف کا چھوٹا ٹکڑا، زمین پر پڑی ہے۔ اور بنی اسرائیل نے دیکھ کے آپس میں کہا کہ مَنّ ہے؟[۲] کیونکہ اُنھوں نے نہ جانا کہ وہ کیا ہے۔ تب موسیٰؑ نے کہا یہ روٹی ہے جو خداوند نے کھانے کو تمھیں دی ہے۔

"یہ وہ بات ہے جو خداوند نے تمھیں فرمائی تھی۔ ہر ایک اُس میں سے بقدر اپنے کھانے کے آدمی پیچھے ایک اُومر جمع کرے۔ ہر ایک اپنے لوگوں کا شمار کر کے اُن کے لئے جو اُس کے خیمے میں ہیں لے۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے یوں ہی کیا، اور اُن میں سے بعضوں نے زیادہ اور بعضوں نے کم جمع کیا۔ اور جب اُنھوں نے اُومر سے ناپا، تو جس نے بہت جمع کیا تھا۔ اور باوجودیکہ موسیٰؑ نے کہا کہ کوئی اُس میں سے صبح تک باقی نہ چھوڑے۔ وہ اُس کے سننے والے نہ ہوئے، اور بعضوں نے صبح تک کچھ رہنے دیا۔ سو اُس میں کیڑے پڑ گئے اور سڑ گیا۔ موسیٰؑ اُن پر غصے ہوئے، اور وہ ایک ایک ہر صبح بقدر اپنے کھانے کے چُنتے رہے، اور جب آفتاب گرم ہو گیا وہ پگھل گیا۔

"اور یوں ہوا کہ چھٹے دن اُنھوں نے روٹیوں سے دونی جمع کیں، دو دو اُومر ایک ایک کے لئے، اور جماعت کے سب سرداروں نے آ کے موسیٰؑ کو خبر دی۔ اُس نے اُنہیں کہا کہ یہ وہی ہے جو خداوند نے کہا تھا، کل سبت خداوند کا مقدس سبت ہے، جو تمھیں پکانا ہو پکا لو اور جو اُبالنا ہو اُبال لو۔ اور وہ جو بچ رہے اپنے لئے صبح تک محفوظ رکھو۔ چنانچہ اُنھوں نے جیسا موسیٰؑ نے کہا تھا، صبح تک رہنے دیا، وہ نہ سڑا نہ اُس میں کیڑے پڑے۔ اور موسیٰؑ نے کہا کہ اُسے آج کھاؤ۔ کیونکہ آج خداوند کا سبت ہے، آج تم میدان میں نہ پاؤ گے۔ چھ دن تک تم اسے جمع کرو گے، پر ساتویں دن، جو سبت ہے۔

[۱] میں عہدِ عتیق کا جو نسخہ استعمال کر رہا ہوں وہ اُس "کتابِ مقدس" میں شامل ہے جسے برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور نے امریکن پریس لدھیانہ میں چھپوا کر ۱۹۱۲ء میں شائع کیا ہے۔

[۲] عبرانی اور عربی زبانوں میں مَنّ اور مَن کے معنی "کون" اور "کیا" کے ہیں۔

کچھ نہ پاؤ گے۔

"اور یوں ہوا کہ بعضے ان لوگوں میں سے ساتویں دن جمع کرنے کو گئے اور کچھ نہ پایا۔ تب خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ کب تک تم میرے حکموں اور میری شریعتوں کے حفظ کا انکار کرو گے۔ دیکھو ازبسکہ خداوند نے تم کو سبت دیا، اس لئے وہ تمہیں چھٹے دن دو دن کی روٹیاں دیتا ہے، ہر ایک تم میں سے اپنی جگہ پر رہے۔ ساتویں دن کوئی اپنی جگہ سے باہر نہ جائے۔ چنانچہ لوگوں نے ساتویں دن آرام کیا۔ ....

.... اور اسرائیل کے گھرانے نے اس کا نام مَنّ رکھا۔ اور وہ دھنئے کے بیج کی طرح سفید اور مزا اس کا شہد میں ملی ہوئی پھلوری کا تھا"........ آخری آیتیں یہ ہیں کہ" اور بنی اسرائیل چالیس برس تک، جب تک کہ وہ زمینِ کنعان کی نواحی میں آئے مَنّ کھاتے رہے، اور ایک اومر ایفہ کا دسواں حصّہ ہے۔"

(۲) گنتی کی کتاب کے گیارھویں باب میں (آیت ۴ تا ۹) میں ہے کہ:-

"اور بعضوں نے اجنبی قوموں میں سے، جو ان میں ملے ہوئے تھے، حرص سے خواہش کی۔ اور بنی اسرائیل سے بھی پھر سے اور روئے اور بولے کون ہے جو ہمیں گوشت کھانے کو دیگا؟ ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مفت مصر میں کھاتے تھے، اور وہ کھیرے اور وہ خربوزے اور وہ گندنا اور وہ پیاز اور وہ لہسن۔ پر اب تو ہماری جان خشک ہو چلی، یہاں تو ہماری آنکھوں کے سامنے کچھ بھی نہیں مگر یہ مَن۔ اور مَن سوکھے دھنئے کے مانند تھا اور اس کا رنگ موتی کے دانے کا سا تھا۔ لوگ ادھر ادھر جا کے اُسے جمع کرتے تھے اور چکّی میں پیستے تھے یا اوکھلی میں کوٹتے تھے۔ اور تووں پر پکاتے تھے اور پھلکیاں بناتے تھے۔ اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا، اور رات کو جب خیموں پر اوس پڑتی تھی تو مَن بھی اُن پر پڑتا تھا۔"

(۳) کتاب استثنا (باب ۸) میں ہے:-

"اور اس نے تجھے عاجز کیا اور تجھے بھوکا رکھا، اور وہ مَنّ جسے تو نہ جانتا تھا اور نہ تیرے باپ دادا جانتے تھے، تجھے کھلایا، تاکہ یہ تجھ پر جتائے کہ انسان فقط روٹی ہی کے کھانے سے جیتا نہیں رہتا بلکہ ہر ایک بات سے جو خداوند کے منہ سے نکلتی ہے جیتا رہتا ہے۔" (آیت ۳)

"جس نے بیابان میں وہ مَنّ جسے تیرے باپ دادا نہ جانتے تھے تجھے کھلایا تاکہ تجھے عاجز کرے اور تیری آزمائش کرے کہ آخر میں تیرا بھلا ہو۔" (آیت ۱۶)

(۴) کتاب یشوع (باب ۵، آیت ۱۲) میں لکھا ہے کہ "جب انہوں نے اُس زمین کا دانہ کھایا، تو اُسی دن سے مَنّ موقوف ہو گیا اور آگے پھر بنی اسرائیل کو مَنّ نہ ملا۔ اور انہوں نے اُسی سال کنعان کی سرزمین کا حاصل کھایا۔"

(۵) زبور کے باب ۷۸، (آیت ۲۴، ۲۵) میں آیا ہے کہ "ان پر مَنّ برسایا کہ کھائیں اور اُن کو آسمانی غلہ بخشا۔ ایک ایک نے امیروں کی غذا کھائی۔ اُس نے انہیں خوراک بھیج کر آسودہ کیا۔"

عہدِ عتیق کی ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مَنّ سبت کے دن کے سوا باقی ہر روز صبح کو آتا تھا، یوں تو ہر روز مل سکتا تھا۔ مگر سبت کے دن وہ آسمان سے اُترتا ہی نہ تھا۔

اُس کی شکل دھنئے کے ایک دانے کی سی ہوتی تھی۔

یہ ضروری تھا کہ اُسے صبح تڑکے ہی جمع کر لیا جائے، ورنہ اُس کے بعد وہ سورج کی گرمی سے پگھل جاتا تھا۔

ہر روز اُس کی جتنی مقدار مل جاتی تھی، صرف اُسی کو اور محض اُسی دن کے لئے ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ سوا سبت کے دن کے اور کسی دن کے لئے اُس کا ذخیرہ اگر رکھا بھی جاتا تھا تو وہ ضائع ہو جاتا تھا، سڑ جاتا تھا اور اُس میں کیڑے پڑ جاتے تھے۔

اُسے آٹے کی صورت میں پیس کر روٹیاں تیار کی جاتی تھی۔

اُس کا ذائقہ بالکل تازہ تیل کا سا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا روٹی کو شہد میں تر کر کے کھایا جا رہا ہے ——— ہر شخص کو مرغوب ہوتا تھا۔

بنی اسرائیل کی کُل قوم چالیس سال کے عرصے تک اس پر گزارا کرتی رہی۔

اور جب سرزمینِ کنعاں سے اُن کو اناج ملنے لگا، تب سے نزول رُک گیا، اور سب سے بڑی بات یہ کہ اُس کا نزول بالکل معجزے کے طور پر آسمان سے ہوتا تھا۔ وہ بنی اسرائیل کے لئے خدا کی ایک خاص نعمت تھی، ایک خاص عطیہ تھا، وہ زمین کی پیداوار

نہ تھی، بلکہ آسمانی چیز تھی ؛

کتاب مقدس کے سبعینی[1] اور لاطینی[2] ترجموں اور جوزیفوس[3] کی تحریر میں کتاب خروج کی مذکورۂ بالا آیت (۱۵) کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس سے لفظ مَن کے معنی بہت کچھ واضح ہوتے ہیں ۔ لاطینی ترجمے میں ہے کہ "جب اسے بنی اسرائیل نے دیکھا تو ایک دوسرے سے کہا مَن ہذا جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کیا ہے ؟ کیونکہ وہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ وہ (مَن) کیا چیز ہے ۔" سبعین میں لکھا ہے :۔

"مگر بنی اسرائیل نے اُسے دیکھ کر ایک دوسرے سے کہا کہ یہ کیا ہے ؟ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے ۔" جوزیفوس لکھتا ہے :۔

"عبرانی لوگ اس غذا کو مَن کہتے ہیں، کیونکہ ہماری زبان میں لفظ مَن سوال کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ یہ کیا ہے ؟"

مختصر یہ کہ عبرانی لفظ مَن، جو اس چیز کا نام ہو گیا ہے، حقیقت میں استفہام (کیا ؟) ہے، اور اس چیز کا یہ نام اس سوال سے پیدا ہے کہ مَن ہذا (یہ کیا ہے ؟) اور یہ وہ سوال تھا جو اس چیز کو دیکھ کر بنی اسرائیل کے ذہن میں پیدا ہوا ۔ کیونکہ انہوں نے اُس وقت سے پہلے یہ چیز کبھی دیکھی ہی نہ تھی ۔ اس سوال کو چونکہ ہر شخص ایک دوسرے سے دُہراتا تھا، اس لئے ہوتے ہوتے یہی اُس کا نام قرار پا گیا ۔

ملک عرب کے صحرا اور فلسطین اور شام کے بعض مقامات میں (اور مقامات کے علاوہ جن کا ذکر ابھی آگے آئیگا) جو مَن پیدا ہوتا ہے اُس کے تمام خواص اُن تمام خاصیتوں سے پُوری طرح ملتے جُلتے نہیں ہیں ۔ جو ابھی انجیلِ مقدس کے حوالے سے بیان ہوئی ہیں ۔ اول تو یہ قدرتی پیداوار کا مَن غذا نہیں ہے، بلکہ (جیسا کہ آگے چل کے واضح ہوگا) محض ایک مسالہ یا دوائی ہے ۔ اس سے غذا کا نہیں بلکہ ایک ملیّن یا مُسہل دوائی کا کام لیا جاتا ہے ۔ پھر یہ کہ مَن سال کے تمام مہینوں میں نہیں، بلکہ عموماً اپریل یا مئی سے لے کر اگست کے مہینوں تک پیدا ہوتا ہے ۔ اس پیداوار کی مقدار بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتی ـــــ اور یہ یقینی امر ہے کہ اتنا ہرگز نہیں پیدا ہوتا کہ وہ بنی اسرائیل کی اُس وقت کی تعداد کے لئے کافی ہو سکتا ۔ حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو ہر ہفتہ کم سے کم ایک لاکھ اسی ہزار یا پانچ سو من کی ضرورت ہوتی ہوگی ! اور یہ مقدار قریب قریب ناممکن ہے کہ پیدا ہوتی ہو ۔ علاوہ اس کے مَن کی یہ کیفیت نہیں ہے کہ وہ ایک ہی دن میں سڑ جائے، بلکہ وہ زیادہ عرصے تک بھی رکھا جا سکتا ہے ۔ اور یہ بھی خاصیت اس میں نہیں ہے کہ وہ سبت کے دن نہ سڑے اور خراب نہ ہو ـــــ اس کے لئے سبت و نہ ایک ہی سا ہے، کوئی خصوصیت نہیں ہے اور نہ یہ صورت ہے کہ سبت کے دن وہ ملتا ہی نہ ہو، نہ یہ ہوتا ہے یا ہوا ہے کہ بنی اسرائیل کو دوسری (کنعانی) غذا مل جانے کے بعد سے آج تک پھر وہ پیدا ہی نہ ہوا ہو، کیونکہ یہ ایک عام تجربہ ہے کہ وہ برابر پیدا ہو رہا ہے ! غرض یہ کہ اگر کتاب مقدس کے مؤرخوں اور روزنامچہ نویسوں کا بیان واقعی صحت پر مبنی ہے، تو سوا اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ بنو اسرائیل کے مَن کو کوئی معجزے ہی کی چیز تسلیم کیا جائے ۔ مگر اس میں اس کی مطلق گنجائش نہ ہوگی کہ معجزہ کیا ہے ـــ وہ کیونکر ہوا اور خاص کر بنی اسرائیل کے لئے کیوں ہوا وغیرہ وغیرہ !

عرب کے جس صحرائی علاقے میں بنی اسرائیل مصر سے ارضِ مقدس کو جاتے ہوئے ٹھہرے تھے وہ آج بھی موجود ہے، اور اب بھی وہاں مَن پیدا ہوتا ہے، جسے وہ لوگ جون کے مہینے میں طرفا نام کی ایک خار دار جھاڑی پر سے جمع کرتے ہیں ۔ متعدد سیاحوں کے بیان سے اس کی یہ کیفیت معلوم ہوتی ہے کہ مَن اُس جھاڑی کے کانٹوں پر جم کر، جب زیادہ مقدار میں ہو جاتا ہے، ٹہنیوں اور پتوں پر

---

[1] سبعین (۷۰) کتاب مقدس کا یونانی ترجمہ ہے، اور اس کا یہ نام اس لئے ہو گیا کہ اس ترجمے میں ستر علما شریک تھے ۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ ترجمہ توبی فیلاد لفس کے ایما سے ولادتِ مسیح سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے سے ہونا شروع ہوا تھا اور قریب قریب ولادتِ مسیح کے زمانے تک اگر ختم ہوا ۔

[2] کتابِ مقدس کے اس لاطینی ترجمے کو انگریزی میں وَلگیٹ (یعنی عام) کہتے ہیں ۔ یہ ترجمہ سب سے پہلے پانچویں صدی مسیحی میں جیروم نے کیا تھا ۔ بعد میں اس ترجمے پر کئی مرتبہ نظر کی گئی، اور بالآخر ۱۹۰۷ء میں بھی اس میں ترمیم ہوئی ۔

[3] جوزیفوس ایک اسرائیلی مؤرخ تھا، جو سنہ ۳۷ مسیحی میں یروشلم میں پیدا ہوا تھا جب یہ متعدد بڑے بڑے فریسی اور صدوقی علما سے تعلیم پائی، اور ایک نہایت مقتدر اور باوقار شخص ہو گزرا تھا سنہ ۷۰ میں یروشلم کی فتح کے بعد وہ روما پہنچا جہاں یکے بعد دیگرے تین بادشاہ اس کے سرپرست رہے ۔ اس نے بنو اسرائیل کی تاریخ اور عام حالات کے متعلق اپنی تصنیفات میں نہایت قابلِ قدر معلومات بہم پہنچائے ہیں ۔ اور عموماً ایک مستند مؤرخ شمار ہوتا ہے ۔

ٹپک پڑتا ہے۔ جھاڑی کچھ زیادہ اونچی نہیں ہوتی، بلکہ اُس کے پتے زیادہ تر زمین پر بچھے رہتے ہیں۔ اور وہیں سے وہ لوگ صبح سویرے مَن جمع کر لیتے ہیں، کیونکہ سورج کے نکلنے کے زیادہ دیر کے بعد وہ گرمی سے پگھل کر بہ جاتا ہے۔ جمع کرنے کے بعد عرب لوگ اُسے خس و خاشاک صاف کر کے تھوڑے سے پانی میں ملا کر اُبالتے ہیں پھر اُسے کپڑے کی صافی میں چھان کر چمڑے کی بوتلوں اور خرجینوں میں بھر کر رکھ لیتے ہیں۔ اور اسی طرح کئی کئی برس تک رکھا رہتا ہے اور خراب نہیں ہوتا۔ وہ لوگ شہد یا مکھن کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ فطیری روٹی پر لگا لگا کر کھاتے ہیں۔ یہ نہیں کرتے کہ صرف مَن ہی کی ٹکیاں یا بھیلیاں بنا کے رکھیں اور صرف اسی کو (بغیر کسی اور چیز کی مدد کے) غذا کے طور پر کام میں لائیں۔ مَن عموماً برسات کے دنوں میں یا یوں کہئے کہ عام طور پر تری کے زمانے میں، پیدا ہوتا ہے، اور گرم اور خشک زمانے میں بالکل نہیں نظر آتا۔ یہ مفقود ہوتا ہے۔

جب یہ صورت ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ بنی اسرائیل کیونکر اسے متواتر اور مسلسل چالیس برس تک روزانہ کھاتے رہے!

مَن ایران میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ ایک[1] سیاح کا بیان ہے کہ ایرانی مَن برف کی طرح سفید ہوتا ہے۔ اصفہان کے قرب و جوار میں اس کی پیداوار ہوتی ہے، وہاں کے لوگ اس خاردار جھاڑی کے پتوں کو سمیٹ کر ایک جگہ رکھ لیتے ہیں۔ پھر اُن کو ایک لکڑی سے پیٹتے ہیں۔ پیٹنے سے مَن چھوٹے چھوٹے دانوں کی صورت میں نیچے ٹپکتا جاتا ہے، اور جمع کر کے چھان لیا جاتا ہے۔

نیبور[2] کا بیان ہے کہ عراق عرب کے شہر ماردین کے نواح میں اس نے دیکھا کہ مَن بالکل آٹے کی شکل میں ایک درخت کے پتوں پر جمتا ہے۔ جسے وہاں کے لوگ 'بلّوط' اور 'عفص' کہتے ہیں۔ اُس کا موسم جولائی اور اگست کے مہینوں میں ہوتا ہے، اور عموماً تر موسم میں زیادہ ہوتا ہے اور خشک میں کم۔ صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے ہی درخت کے پتے ہلا کر اُسے ٹپکا دیا جاتا ہے۔ نیچے چادریں بچھی ہوتی ہیں۔ اُن ہی میں ٹپکتا جاتا ہے۔ اس اصلی حالت میں یہ بالکل خالص اور سفید ہوتا ہے۔ جو جھاڑنے سے نہیں جھڑتا وہ سورج کی گرمی سے پگھل کر انہیں پتوں پر جم جاتا ہے اور یوں ہی ہوتے ہوتے اُس کی خاصی ایک موٹی سی تہ جم جاتی ہے۔ پھر اُن پتوں کو لے کر اُبلتے ہوئے پانی میں ڈال دیتے ہیں۔ اور اس ترکیب سے مَن تیر کر پانی کی سطح پر آجاتا ہے۔ اسی کو وہاں کے باشندے "مَنّ السماء" یعنی آسمانی مَن کہتے ہیں۔ عرب کے مشہور سیاح برک ہارٹ[3] نے لکھا ہے کہ اُردن کی وادی میں ایک درخت ہوتا ہے، جسے وہاں کے لوگ غَرَب کہتے ہیں۔ اسی غرب کی شاخوں اور اُس کے پتوں پر گوند کی صورت میں مَن جما ہوا ملتا ہے۔ جب بالکل تازہ ہوتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پتوں پر اوس جمی ہے۔ اُس کا رنگ بھورا بھورا سا ہوتا ہے اور وہ خود بخود زمین پر ٹپکتا رہتا ہے۔ تازہ حالت میں اُس کا مزہ میٹھا ہوتا ہے۔ مگر ایک دو دن کے بعد اُس میں تُرشی آجاتی ہے۔ عرب لوگ اُسے روٹی کے ساتھ شہد یا مکھن کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اور اسی سے وہ اپنی چمڑے کی خرجینیں صاف کرتے ہیں۔ اِس کے جمع کرنے کا موسم مئی اور جون کے مہینوں میں ہوتا ہے۔

ایک درخت ہے، جسے انگریزی محاورے میں مَنّ ایش کہتے ہیں۔ یہ درخت اٹلی، سوئٹزرلینڈ، ہنگری، یونان اور ایشیائے کوچک میں ہوتا ہے، اور ان کے علاوہ بحیرۂ شام کے جزیروں، سسلی، کورسیکا اور سارڈینیا میں بھی بکثرت پایا جاتا ہے۔ آج کل عام طور پر دکانوں پر جو مَن فروخت ہوتا ہے وہ سب جزیرۂ سسلی ہی سے آتا ہے۔ جہاں اس کے درخت کی باقاعدہ کاشت ہوتی ہے۔ اس کے پودے ایک دوسرے سے سات سات فٹ کے فاصلے پر لگائے جاتے ہیں۔ جب پودے کی عمر آٹھ برس کی ہو جاتی ہے، اور اس کے تنے کا قطر کم سے کم تین انچ ہو جاتا ہے، تب اُس میں سے مَن نکالنا شروع

[1] گیلین نے اپنی کتاب "روس سے ایران تک کا سفر" (حصہ سوم، صفحہ ۲۸) میں یہ سب حال لکھا ہے۔ گیلین جرمنی کا باشندہ اور روس کے پایۂ تخت سینٹ پیٹرز برگ میں علم کیمیا کا پروفیسر تھا۔ اُس نے ۱۷۶۷ء سے ۱۷۷۴ء تک جنوبی روس اور شمالی ایران میں سیاحت کی اور ۱۷۷۴ء میں انتقال کیا۔

[2] جرمن سیاح، جس نے ۱۷۶۰ء سے ۱۷۶۸ء تک متعدد مشرقی ملکوں کا سفر کیا اور بہت تحقیق سے وہاں کے حالات لکھے۔ ۱۸۱۵ء میں فوت ہوا۔

[3] اس نے ۱۸۰۹ء سے ۱۸۱۷ء تک (جو اس کی وفات کا سال تھا) مصر اور عرب کی سیاحت کی۔ یہ پہلا یورپین شخص تھا جس نے (ایک مسلمان کے بھیس میں) مکۂ معظمہ کا حج کیا تھا۔ اس کا سفرنامہ نہایت دلچسپ ہے، اور عموماً مستند سمجھا جاتا ہے۔

کرتے ہیں۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ جولائی اور اگست کے خشک موسم میں اُس کے تنے میں ایک ایک انچ کے فاصلے پر ڈیڑھ سے دو انچ لانبے اور آڑے آڑے شگاف دیے جاتے ہیں۔ ایک دن میں صرف ایک ہی شگاف دیا جاتا ہے، اور یہ احتیاط کی جاتی ہے کہ شگاف اُوپر کی چھال کو چیرتا ہوا اندر گودے تک پہنچ جائے۔ یہ شگاف درخت کی جڑ کی طرف سے شروع کئے جاتے ہیں، اور روزمرہ ایک ایک کے اضافے سے اوپر کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر سال تنے کی خالی جگہ میں شگاف دیتے چلے جاتے ہیں، اور جب یوں ہی ہوتے ہوتے پورا تنہ گُدھ جاتا ہے، تو اُس درخت کو کاٹ کے پھینک دیتے ہیں۔ اِس عرصے میں اُس کی جڑ میں سے ایک اور نیا پودا نکل آتا ہے، پھر اُس پر بھی یہی جراحی عمل ہوتا ہے۔ ان شگافوں میں سے جو رس یا گوند رِس رِس کر نکلتا رہتا ہے وہ مَنّ ہے۔ جوں جوں یہ رس نکلتا جاتا ہے اسے احتیاط سے جمع کرتے رہتے ہیں۔ سخت قسم کا مَنّ وہ ہوتا ہے جسے ایک دو روز تک یوں ہی تنے پر ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ایک اور طریقہ یہ ہے ــــ اور اِس طریقے سے نہایت عمدہ قسم کا مَنّ حاصل ہوتا ہے۔ کہ ہر شگاف میں لکڑی کے تراشے ہوئے ٹکڑے یا تنکے کھونس دیے جاتے ہیں اور مَنّ اُن ہی پر جمع ہو ہو کر جمتا رہتا ہے۔ تنے کے نیچے کے حصے میں سے جو مَنّ نکلتا ہے وہ زیادہ لیسدار ہوتا ہے، اور کم قیمت سمجھا جاتا ہے۔

اسی جزیرۂ سسلی میں ایک پہاڑ ہے، جس کا نام جَبَلِ مَنّ ہے۔ یہ الفاظ خود ہی گویا ہیں کہ یہ نام عربوں کا رکھا ہوا ہے، جنھوں نے اس جزیرے میں قریب ڈھائی سو برس تک (۸۲۷ء تا ۱۰۷۰ء) حکومت کی ہے۔ اِس سے اِس امر کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس پہاڑ پر مَنّ کے پودے بکثرت ہونگے اور عرب لوگ ان میں سے ضرور مَنّ نکالتے اور دور دراز ملکوں کو بھیجتے ہونگے۔ گو یہ ایک عجیب امر ہے کہ یورپ کے برِّاعظم میں مَنّ کا رواج اور اُس کا استعمال پندرھویں صدی سے قبل یا تو بالکل نہ تھا اور اگر تھا تو بہت ہی کم۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ عرب لوگ اپنے وطن سے یہ پودا لائے ہوں اور اُنھوں نے ہی سسلی میں اس کی کاشت کی ہو، پھر وہاں سے یہ شمال اور شمال مشرق کے یورپی ملکوں میں بھی پھیل گیا ہو۔

مَنّ کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک مشہور قسم وہ ہے جسے فارسی محاورے میں تَر انگبین (یا ترنگبین، اور ترنجبین) کہتے ہیں۔ اس کا لاطینی اور انگریزی نام "الہاگی مَنّ" اور اس کے پودے کا "الہاگی ماورُورم" ہے۔ اس پودے کا قد چھوٹا ہوتا ہے، اور اس کے تنے میں موٹی موٹی رگیں اور نسیں ہوتی ہیں۔ یہ عرب، ایشیائے کوچک، ایران، افغانستان، بلوچستان اور شمالی ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔ اس میں سے جو مَنّ نکلتا ہے اُس کے چھوٹے چھوٹے، گول گول، سخت اور خشک سے قطرے ہوتے ہیں۔ جن کی مقدار رائی کے دانے سے لیکر دھنئے کے دانے تک ہوتی ہے۔ اس کا رنگ بھورا، مزہ میٹھا اور خوشبو سَنا کی سی ہوتی ہے۔ ان قطروں میں اکثر پودے کی رگوں اور ناخوں کے ذرّے ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ اِس وجہ سے استعمال سے پہلے اُن کو صاف کرنا پڑتا ہے۔ قندھار اور ہرات میں اِن کو بہت جمع کیا جاتا ہے، اور وہیں سے وہ کابل کے راستے سے ہندوستان پہنچتا ہے۔

مَنّ کی دوسری قسم وہ ہے جسے فارسی میں گز انگبین کہتے ہیں۔ یہ جون اور جولائی کے مہینوں میں نکالا جاتا ہے۔ اس کے پودے کا نام "ٹیمرکس گلیکا" ہے۔ یہ شکل میں یہ مَنّ شہد کے قطروں سے مشابہ ہوتا ہے۔ جو صبح کے وقت ٹھنڈک کی وجہ سے جم جاتے ہیں۔ بظاہر تو یہ مَنّ اپنے پودے میں سے خود بخود نکلتا ہے۔ لیکن اِس کے رِسنے کا اصلی ذریعہ چھوٹے چھوٹے کیڑے ہوتے ہیں، جو پودے کی شاخوں میں شگاف کر کرکے اُسے نکالتے رہتے ہیں۔ یہ سینا کی مشہور وادی میں بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ وہاں کے عرب اُسے جمع کرکے پادریوں اور راہبوں کی وساطت سے اُن لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ جو کوہ سینا کی زیارت کے لئے دور دراز مقامات سے وہاں پہنچتے ہیں۔ ایران اور پنجاب میں بھی ہوتا ہے، مگر ان دونوں مقامات میں اس کی زیادہ قدر نہیں ہوتی، اور عموماً جمع نہیں کیا جاتا۔ اتنا ضرور ہے کہ ایران کے بعض شہروں میں بازاروں میں گز انگبین کے نام سے گول گول ٹکیاں بکتی ہیں۔ مگر ان میں گز انگبین (یا مَنّ) کا ایک جزو ہی ہوتا ہے، خالص مَنّ نہیں ہوتا۔ وہ لوگ اُسے زیادہ تر اصفہان کے جنوب مغربی نواح سے جمع کرکے لاتے ہیں، جہاں وہ اگست کے مہینے میں اس کے پودے پر جراحی عمل کرتے ہیں۔ انجیلِ مقدس کا مَنّ غالباً یہی گز انگبین ہے۔

ایک اور قسم کا نام شیر خشت ہے۔ یہ نام عموماً طب کی کتابوں میں مفرد دواؤں کی خاصیتوں کی بحث میں نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں

جو شیر خشت دکانوں میں بکتا ہے وہ زیادہ تر افغانستان اور ترکستان سے آتا ہے۔ اُس کی گرانی اس امر کی کافی شہادت ہے کہ یہ بہت زیادہ مقدار میں نہیں آسکتا۔ یہ نام ہندوستان میں عام طور پر مشہور ہے اور یونانی طبیبوں کے ہاں اس کا عام رواج ہے۔ مگر فارسی (اور عربی) زبان میں اس کا اصلی نام شیر خشک ہے لیکن حکیم محمد حسین خاں اپنی مشہور و معروف کتاب مخزن الادویہ میں "شیر خشت" کے ماتحت لکھتے ہیں کہ گو اس کا نام شیر خشک (یعنی سوکھا ہوا دودھ) ہے، لیکن بجائے خشک کے خشت بھی صحیح ہے، کیونکہ ان لوگوں (یعنی خراسان وغیرہ) کے محاورے میں گوند کو خشت کہتے ہیں۔ اور اسی بنا پر حکیم صاحب موصوف نے اس عام رائے سے اختلاف کیا ہے۔ کہ شیر خشت یا مَنّ محض شبنم ہے یا شبنم سے پیدا ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کا یہ بھی بیان ہے کہ عظیم آباد پٹنہ، بھاگلپور اور ان کے نواح میں بھی بھنڈی کترا نام ایک جھاڑی ہوتی ہے۔ جس میں سے شیر خشت کی طرح کا ایک گوند نکلتا ہے، جسے وہاں کے لوگ ہرلالو اور فرنگی مانہ کہتے ہیں۔ اور ایک نامی گرامی طبیب حکیم میر عبدالحمید صاحب کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ اس گوند کی تمام خاصیتیں بالکل وہی ہیں جو شیر خشت کی ہیں۔ مشرق کے یونانی اطباء کی رائیں اس عجیب و غریب چیز کی خاصیت اور ماہیت کے بارے میں، اور اس کی پیداوار اور جمع کرنے کے طریقوں وغیرہ کے متعلق بہت کچھ وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئیں، اور جس کے اعادہ سے محض طول کے سوا زیادہ فائدہ نہ ہوگا۔ لیکن باوصف ان تمام بیانات اور اُن کی تفصیلوں کے یہ امر بھی لطف سے خالی نہیں ہے کہ جناب شیخ الرئیس ابو علی ابن سینا کی یہ رائے بار بار، اور مَنّ کے بیان کے آغاز میں، ضرور ہر ماہر طبیب کے ہاں پائی جاتی ہے کہ مَنّ ایک شبنم ہے، جو پتھروں اور جھاڑیوں پر پڑتی اور شہد کی طرح گاڑھی ہوکر جم جاتی ہے ....." وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال بنی اسرائیل کے لئے مَنّ آسمان سے ٹپکا ہو یا نہ ٹپکا ہو۔ یہ امر ضرور یقینی ہے کہ یہ چیز ہمارے کرۂ زمین کے لئے بھی مقدر تھی، ہے اور بہت ممکن ہے کہ ہمیشہ رہے۔ پھر بنی اسرائیل ایسی عجیب و غریب اور ایسی لذیذ چیز کو دیکھ اور چکھ کر مبہوت نہ ہو جاتے تو کیا کرتے۔ اور اس تپتے ہوئے صحرا میں اس سے بہتر نعمت اُن کو اور کونسی مل سکتی تھی۔

محمد نعیم الرحمان

اقوالِ مشاہیر

جب پیر ریگلر نے سُنا کہ انکا غورث کی حالت فاقوں کے مارے تباہ ہوگئی ہے اور وہ اب کوئی دن کا مہمان ہے۔ تو اُس نے ایک معقول رقم اُس کی خدمت میں بھیجی، لیکن غیور زملا سفر نے یہ کہہ کر رقم واپس کردی۔

"اس رقم کو واپس لے جاؤ۔ اگر وہ چاہتا کہ چراغ گل نہ ہو، تو وہ اِس سے بہت پہلے اُس میں روغن ڈالتا۔"

مرتے وقت لوگوں نے پوچھا، آپ کی وفات کے بعد کون سا کام کریں جس سے آپ کی "عزت افزائی ہو" اُس نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ "مدارس کے لڑکوں کو چھٹی دے دینا۔"

رابرٹ ہال کا قول ہے کہ "ضمیر" کے معاملہ میں جو خیال سب سے پہلے دل میں وارد ہو اس پر عمل کرو اور "دور اندیشی" کے معاملہ میں خیالِ ثانی عموماً بہتر ہوتا ہے۔

موٹر سائیکل

آپ نے لوگوں کو موٹر سائیکل چلاتے ہوئے عموماً دیکھا ہوگا چلانے والے کے مہیب حُلیے اور خاموش ہونٹوں کو دیکھ کر بسااوقات آپ کے دل میں یہ شک پیدا ہوگا کہ سائیڈ کار میں بیٹھی ہوئی رفیقۂ حیات کے ساتھ اُس کے تعلقات خوشگوار نہیں اور وہ دونوں ایک دوسرے سے سخت ناراض ہیں لیکن آپ کا یہ شک درست نہیں کیونکہ وہ لوگ جو اپنی بیویوں کو سائیڈ کاروں میں سوار کر کے اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں وہ عام طور پر بہترین خاوند ہوتے ہیں۔ آپکی طرح وہ بھی اپنے گھروں میں اپنی بیویوں کے ساتھ ہر بُری بھلی بات نہایت خلوص اور پیار کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ اور سفرِ زندگی کی کٹھن منزلوں کو طے کرنے میں اپنی ہم سفروں کی ہمراہی کا پُورا پُورا فائدہ اُٹھاتے ہیں. موٹر سائیکل کی سواری کے دوران میں اُن کی ظاہرہ بے پرواہی اور خاموشی کی حقیقی وجہ یہ ہوا کرتی ہے کہ وہ تیز رو موٹر سائیکل سے سائیڈ کار سوار ہمراہی کے ساتھ گفتگو کرنے کی کئی بے سود کوششیں کر چکے ہوتے ہیں اور آخر کار تنگ آکر اِس دشوار کام کا خیال ہی چھوڑ دیتے ہیں۔

مَیں چلتے ہوئے موٹر سائیکل سے سائیڈ کار کے ساتھ رشتۂ گفتگو قائم کرنے کے تین مختلف طریقے استعمال کیا کرتا ہوں۔ ان میں سے سب سے پہلا۔ سب سے آسان لیکن سب سے زیادہ بے سود طریقہ یہ ہے کہ جس سمت کو موٹر سائیکل جا رہی ہوتی ہے مَیں اُس طرف کو منہ کئے ہوئے بولنے کی کوشش کرتا ہوں - میری رفیقۂ حیات (بشرطیکہ وہ میرے ہونٹوں کو ہلتا ہوا دیکھ لے) فوراً اس نتیجے پر پہنچ جاتی ہے کہ یا تو مَیں انجن کے کسی پرزے کو گالیاں دے رہا ہوں یا اس مچھر۔ تنکے۔ کیڑے۔ یا اِسی قسم کی کسی اور چیز کی منتیں کر رہا ہوں جو میری آنکھ میں پڑ گئی ہے اور جسے میں اپنے تیل آلودہ ہاتھوں سے آنکھ سے باہر نہیں نکال سکتا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے سر کو سائیڈ کار کی طرف جھکا کر بات کرتا ہوں۔ رفتار کی تیزی اور ہوا کی تندی کی وجہ سے میری گفتگو کا صرف کچھ حصہ بیوی کے کانوں تک پہنچتا ہے لیکن بدقسمتی سے وہ اُس حصے کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتی ہے جو اُسے سُنائی نہیں دیتا۔ مَیں اپنے فقروں کو کئی بار دہراتا ہوں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ فقروں کو بیوی پر پھینکتا ہوں لیکن وہ کچھ نہیں سمجھتی۔ ایسی حالت میں گفتگو کچھ اِس طرح کی ہوتی ہے :-

مَیں "دن بھر کی دھوپ کے بعد آجکل شام کے وقت موسم کیا خوشگوار ہوتا ہے۔"

وہ۔ "کیا؟"

مَیں۔ (زور سے) "موسم ــــــ خوشگوار"

کچھ دیر کے بعد میرے جی میں شک پیدا ہونا شروع ہوا کہ میری بیوی میری گفتگو کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہی ہے۔ اِس پر مجھے سخت غصہ آتا ہے اور میرا چہرہ لال ہو جاتا ہے۔ چہرے کی سُرخی کو دیکھکر وہ میری حالت کو فوراً تاڑ لیتی ہے اور اس کے بعد اِدھر اُدھر کے بے معنی جواب دینے شروع کرتی ہے۔ وہ یہ خیال کرتی ہے کہ شاید اِس طرح سے وہ یہ ظاہر کرنے میں کامیاب ہو جائے کہ اُس نے میری بات سمجھ لی ہے لیکن عام طور پر وہ کامیاب نہیں ہوتی۔ اِس کے بعد گفتگو کا رنگ کچھ اِس طرح کا ہوتا ہے :-

مَیں۔ "بورڈ پر کیا نام لکھا تھا۔ آپ نے دیکھا؟"

وہ۔ "جی ہاں"

مَیں۔ "کیا نام تھا؟"

وہ۔ "کیا؟"

مَیں۔ "بورڈ ــــــ نام؟"

وہ۔ "مَیں نے نہیں دیکھا"

مَیں۔ "تو پہلے ہاں کیوں کہا؟"

وہ۔ "معاف کیجئے۔ مَیں یہ سمجھی آپ پوچھتے ہیں آرام سے بیٹھی ہو نا۔"

اِس کے بعد باقی راستہ مکمل خاموشی کے ساتھ کاٹنا پڑتا ہے

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ مَیں اپنے جسم کو ذرا سا موڑ کر اُس کی طرف

دیکھتا ہوں تاکہ وہ یہ سمجھے کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن جونہی میں مڑتا ہوں موٹر سائیکل کا اگلا پہیہ فوراً ہی میری تقلید کرتا ہے۔

اب جب میں سڑک کے دوسرے کنارے پر پیدل چلتے ہوئے مسافروں کی ٹانگوں اور کمروں کو اپنے وفادار پہیے کی دستبرد سے بال بال بچاتا ہوا موٹر سائیکل کو دوبارہ سڑک کے درمیان لاتا ہوں تو اس وقت تک میں یہ بھول گیا ہوتا ہوں کہ ——

(۱) مجھے کیا کہنا تھا۔

(۲) جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا وہ کہہ چکا ہوں یا نہیں۔

(۳) اگر کہہ چکا ہوں تو اس نے کیا جواب دیا ہے۔

اس کے بعد میں بولنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ ہاں باقیماندہ سفر کے دوران میں کبھی کبھی آہ بھر کر جی ہی جی میں یہ شعر گا لیتا ہوں۔

جہازِ عمر رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوارِ خاک ہیں بےاختیار بیٹھے ہیں

لطیف الرحمان بی۔اے

(ایل۔ایل۔بی)

آہ وہ شام

تسلّط ہو چلا ہے شام کا اقصائے عالم پر — سیہ چادر بھلی لگتی ہے کیا لیلائے عالم پر
فضا کے مختلف رنگوں سے ایسی شان پیدا ہے — کہ سارا آسماں قوسِ قزح معلوم ہوتا ہے
جھکیں شاخیں درختوں کی رُکے بہتے ہوئے دریا — خدا معلوم ہے کس سوچ میں ڈوبی ہوئی دنیا
نہ دن کہتے ہیں اس کو اور نہ اسکورات کہتے ہیں — پرستارِ مناظر "احسن الساعات" کہتے ہیں
فضا جس پر کسی کی زلفِ عنبر بیز کا سایا — زمیں سے آسماں تک جوش زن دریا ملاحت کا
ستارے سے دامنِ افلاک پر ہیں ضوفشاں ایسے — لباسِ ماتمی میں جس طرح ہوں غول حوروں کے
سکوت ایسا کہ جو امید کی دنیا ہلا ڈالے — سکوں ایسا کہ جو تسکینِ دل بھی چھین لیجائے
یہی منظر تھا کیا کم اسپہ یہ طرّہ قیامت ہے — کہ دھیمی سی صدا نغمہ کی جو لبریزِ کلفت ہے

رگ و پے میں یکایک لہر سی اِک دوڑ جاتی ہے
تمنّا آفریں "اک شام" مجھ کو یاد آتی ہے

زیبا ردولوی

آگ جلنا

"رفتہ رفتہ" یہ وہ الفاظ ہیں جن کا استعمال ہر شعبۂ زندگی میں ہوتا ہے۔ آدمی رفتہ رفتہ عالمِ وجود میں آتا ہے۔ رفتہ رفتہ بیمار ہوتا ہے اور آخر کار رفتہ رفتہ فنا ہو جاتا ہے۔ اگر آپ ذرا سی دیر اس مسئلہ پر غور فرمائیں تو آپ پر اِس بات کی صداقت روشن ہو جائے گی۔ کوئی چیز دفعتاً نہیں بن جاتی بلکہ ہر چیز کے بننے میں وقت درکار ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ ایک چیز کے بننے کے تدریجی مدارج سے واقف نہ ہوں اور چونکہ وہ یکایک آپ کے سامنے ظاہر ہوگئی ہے اِس لئے کہدیں کہ یہ چیز دفعتاً کنجِ عدم سے عالمِ وجود میں آگئی ہے لیکن آپ کا یہ قول حقیقت سے دور ہوگا۔

سائنس نے بھی رفتہ رفتہ ترقی کی اور اس نے جو جو منازل طے کر لئے ہیں اور جن مدارج پر پہنچ گئی ہے وہ آپ پر بخوبی ظاہر ہیں۔ مگر شاید اس بات سے بہت کم اشخاص تفصیلی طور پر واقفیت رکھتے ہونگے کہ کیونکر سائنس رفتہ رفتہ اس مقامِ رفیع پر پہنچی۔

لارڈ ریلے کا قول ہے کہ "دنیا ایک عجائب گاہ ہے اور اس کے متعلق سب سے زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ہم دنیا میں اس کے عجائبات کی تحقیق و تفتیش کرنے کے لئے موجود نہیں" پس ہمیشہ تحقیق و تفتیش ہوتی رہی ہے اور انسان ہمیشہ ترقی کرتا رہا ہے۔ یہ کہنا کہ آج سے چند صدیاں پہلے ترقی نہیں ہوئی، غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مختلف انسان چھوٹی چھوٹی باتوں کو دریافت کرتے رہتے ہیں۔ جب ان کا کافی ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے تو قدرت ایک ایسے روشن ضمیر اور قابل آدمی کو پیدا کرتی ہے جو ان تمام معلومات کو یکجا کر کے انسانی زندگی میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیتا ہے اور اپنے لئے کسی چیز کا موجد ہونے کی عزت حاصل کرتا ہے۔

انسان نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ آگ کیوں جلتی ہے۔ مختلف شخصوں نے اس کے مختلف وجوہ بیان کئے۔ پھر قدرت نے ایک ایسے آدمی کو پیدا کیا جس نے ان تمام اسباب کا جو پہلے لوگوں نے لکھے تھے مطالعہ کیا اور آخر کار آگ جلنے کی صحیح وجہ معلوم کی۔

"مادّہ نیست و نابود نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنی صورتِ نوعیہ تبدیل کر دے۔"

یہ علمِ کیمیا کا بنیادی اصول ہے۔

جب ایک لکڑی جلتی ہے تو اُس کے اندر "مادّی تبدیلیاں" ہوتی ہیں۔ اور وہ مادّہ جو لکڑی کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے ان تبدیلیوں کی وجہ سے دوسری شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ہر زمانہ کے سائنسداں اِس بات پر متفق تھے۔ مگر وہ ان تبدیلیوں کی ساخت اور ان سے پیدا ہونے والے مادّہ کی ساخت میں اختلاف کرتے تھے

قدما کا خیال تھا کہ ہر چیز چار عناصر سے مرکب ہے۔ چنانچہ انہوں نے وہی اصول اس جگہ پر بھی چسپاں کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ جب ایک لکڑی جلتی ہے تو اُس کی لپٹ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے اندر آگ (آتش) کا عنصر موجود ہے۔ دھواں اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ کہ اس کے اندر ہوا (باد) کا عنصر بھی موجود ہے۔ لکڑی کی تری اور بعض اوقات پانی جو جلتی لکڑی کے پیچھے سے نکلتا ہے اِس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اِس کے اندر پانی (آب) کا جزو بھی موجود ہے۔ راکھ کا ڈھیر اِس بات کی دلیل ہے کہ اس کے اندر خاک کا عنصر بھی موجود ہے۔

انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان عناصر کے جدا ہو جانے کا نام "آگ جلنا" ہے۔

ایک عرصۂ دراز تک لوگ اس بات کو صحیح تسلیم کرتے رہے اور یہاں تک ہوا کہ اس اصول کی مخالفت کرنا مذہبی جُرم تصور کیا جانے لگا۔

ایک اور ماہرِ کیمیا نے بھی اسی کے قریب قریب وجہ بیان کی وہ کہتا تھا کہ آگ کوئی معمّہ نہیں ہے۔ جو آدمی کی سمجھ سے بالاتر ہو بلکہ یہ ایک سیدھی بات ہے۔ جلنے والی چیز کے مرکبات کے جدا ہونے کا نام "آگ جلنا" ہے۔

ان لوگوں نے یہ غلطی کی کہ انہوں نے ان اشیا کا یا اُس

مادہ کا جو لکڑی کے جلنے سے بنتا ہے کوئی خیال نہ کیا۔ کیونکہ وہ عناصر جو اس طریقہ سے ظہور پذیر ہوتے ہیں دکھائی نہیں دیتے۔

ایک اور ماہر کیمیا نے ایک اور وجہ بیان کی جو صدیوں تک مانی اور صحیح تسلیم کی جاتی رہی۔ اور اس لئے بہت مشہور ہے۔ اس عالم کا نام اسٹال تھا۔

اُس نے کہا "ہر چیز دو اجزاء سے مرکب ہے ایک فلوجسٹن اور دوسری گیس۔ جب کوئی چیز جلتی ہے تو دراصل اس میں سے فلوجسٹن باہر نکل جاتی ہے۔ پس کسی چیز میں سے فلوجسٹن کے نکل جانے کا نام جلنا ہے۔ جب انسان سانس باہر نکالتا ہے تو یہ فلوجسٹن ہی دراصل سانس کے ساتھ باہر آتی ہے اور اس طرح جسم کا درجۂ حرارت قایم رہتا ہے۔ ایک تنگ کمرہ میں جس میں ہوا کی آمد و رفت آزادانہ نہ ہو تھوڑے عرصہ کے بعد دم گھٹنے لگتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس کمرے کی ہوا فلوجسٹن سے پُر ہو جاتی ہے اس لئے ہمارے سانس کے ساتھ نکلنے والی فلوجسٹن اس کے اندر نہیں سما سکتی اس طریقہ سے ہمارے قلب پر ایک قسم کا بار پڑتا ہے جو آخر کار موت کا باعث ہو جاتا ہے۔

جب ہم کسی چیز کو مثلاً موم بتی کو ہوا کی مقید مقدار کے اندر روشن کرتے ہیں تو تھوڑے عرصے کے بعد وہ گُل ہو جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہوا فلوجسٹن سے پُر ہو جاتی ہے اور اس قابل نہیں رہتی کہ اس کے اندر اور فلوجسٹن لا سکے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روشن موم بتی گُل ہو جاتی ہے۔

مگر اس اصول پر ایک اعتراض وارد ہوتا تھا۔

جب کوئی شے جلتی ہے تو اُن اشیا کا مجموعی وزن جو اس چیز کے جلنے سے اور اس مادّی تبدیلی سے ظہور پذیر ہوتا ہے بہ نسبت اصل شے کے زیادہ ہوتا ہے۔ اگر اس چیز کا کوئی جزو باہر گیا ہوتا تو ضرور تھا کہ اُس کے وزن میں کمی واقع ہوتی۔ مگر یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔

اسٹال نے جواب دیا ہے کہ فلوجسٹن انسان کی روح کے مانند ہوتی ہے۔ جب رُوح جسم سے پرواز کر جاتی ہے تو جسم کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ اِسی طرح جب فلوجسٹن کسی شے سے خارج ہو جاتی ہے تو اس کا وزن بھی بڑھ جاتا ہے۔

جین ری ایک اور سائنسدان نے اِس کی یہ وجہ بیان کی کہ جلنے کے بعد مادہ کے ذرات میں ہوا سرایت کر جاتی ہے اِس لئے اس کا بوجھ بڑھ جاتا ہے۔

لیکن رابرٹ بائل کہتا ہے کہ دراصل گرمی کے ذرات اس دھات کے اندر چلے جاتے ہیں اس کا وزن زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

غرض اس قسم کے سیکڑوں اصول انسان نے وضع کئے اور اپنے آپ کو ہر طرح تسکین دینے کی کوشش کی۔ چند صدیوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ قدرت نے اُس زبردست انسان کو پیدا کیا جس نے قدما کے تجربوں سے نئے نتائج اخذ کئے اور اس نتیجہ پر پہنچا جو آجکل صحیح اور درست تسلیم کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ آنے والی نسلوں کا کوئی انسان اس اصول کو بھی غلط ثابت کر دے۔ لیوائیسر موجودہ اصول کا بانی ہے۔ اس کا قول ہے کہ "ہوا کے اندر ایک گیس ہے جس کا نام آکسیجن ہے جب کوئی چیز جلتی ہے تو وہ اس گیس سے ملکر ایک مرکب بناتی ہے اور اس "ملنے" کا نام "جلنا" ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آگ کے جلنے کے متعلق اور کون کون سے نظریہ وضع ہوتے ہیں اور انسانی عقل اس میدان میں اور کتنی قلابازیاں کھاتی ہے۔

جواد میرٹھی

رباعی

ہے سوزِ سخن سے قلب روشن میرا　　گلریز ہے گلفشاں ہے دامن میرا
وہ بلبلِ شاخسار ہوں میں کہ　　باغیچۂ قدس ہے نشیمن میرا

بہادر شاہ کی اولاد

۸ دسمبر ۱۹۳۰ء کو دہلی کے سرکاری خزانہ میں جانا ہوا تو دیکھا شہزادہ میرزا احمد شاہ گورگانی میز کے سامنے غمگین بیٹھے ہیں۔ اور ایک اُردو کا رسالہ سامنے رکھا ہے۔ مجھے اُن سے بہت محبت ہے کیونکہ یہ میرے سامنے میری ہی بستی کے اندر پیدا ہوئے تھے اور میں نے ان کو بچپن میں گودیوں میں کھلایا تھا، اب بظاہر بوڑھے ہو گئے ہیں لیکن عمر زیادہ نہیں ہے۔ میں ان کی غمگینی کو دیکھ کر بے چین ہو گیا اور حال پوچھا۔ اُنہوں نے وہ اردو رسالہ میرے سامنے رکھ دیا۔ یہ مراد آباد کا ماہوار رسالہ مغل گزٹ تھا یا شاید مغل میگزین تھا اور اُس میں تیموریہ خاندان کے ایک شہزادہ صاحب کا مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں مضمون کے راقم شہزادہ صاحب نے یہ لکھا تھا کہ سوائے اُن شہزادہ صاحب کے بہادر شاہ بادشاہ کی اور کوئی صحیح النسب اولاد موجود نہیں ہے۔ میرزا احمد شاہ صاحب کو اس مضمون کا صدمہ تھا۔ میں نے اُن کو تسلی دی کہ کسی کے لکھنے سے کیا ہوتا ہے تم اپنے دل کو رنجیدہ نہ کرو جو جاننے والے ہیں وہ واقف ہیں کہ اگر تیموریہ سلطنت قائم ہوتی تو آج تم دہلی کے تخت پر ہوتے مگر میرزا احمد شاہ صاحب کو اطمینان نہ ہوا۔ اور انہوں نے کہا میں اس کے خلاف مقدمہ چلاؤں گا۔

آج مجھے خیال آیا کہ بہادر شاہ کی اولاد کی نسبت ہندوستان میں بہت کم لوگوں کو واقفیت ہے اگر اس کو ایک مضمون میں لکھدیا جائے تو واقفیت عام ہو جائیگی۔ اِس لئے ذیل کی چند سطریں لکھتا ہوں۔

بہادر شاہ بادشاہ کے بہت سے بیٹے تھے اور بہت سی بیٹیاں بھی تھیں۔ اگر میں ان سب کی اولاد کی نسبت لکھنا چاہوں تو یہ مضمون نسب نامہ کی ایک کتاب بن جائیگا۔ اِس کے علاوہ نسب کی صحت کی دشواریاں بھی پیش آئینگی اور میں اِس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا کیونکہ میں نہیں کہہ سکتا کہ بہادر شاہ کی کونسی اولاد نکاحی بیوی سے ہے اور کونسی اولاد غیر نکاحی بیوی سے ہے۔ البتہ دو گھرانوں کی نسبت جن کو بہادر شاہ کی اولاد میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے میں یہ مضمون لکھتا ہوں۔ کہ یہ دونوں نکاحی بیویوں کی اولاد ہیں۔

بہادر شاہ بادشاہ کے پہلے ولی عہد میرزا دارا بخت تھے جب ان کا انتقال باپ کی زندگی میں ہو گیا تو دوسرے ولی عہد برٹش گورنمنٹ کی منظوری سے میرزا فخرو ہوئے، اور جب میرزا فخرو کا بھی انتقال ہو گیا، تو ولی عہدی کے مسئلے میں اختلاف پیدا ہوا۔ انگریز ریزیڈنٹ چند خاص شہزادوں کا نام لیتا تھا اور بادشاہ شہزادہ جواں بخت کی ولی عہدی چاہتے تھے جو بہادر شاہ کی محبوب ملکہ زینت محل کے بطن سے تھے ولیعہدی کا مسئلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا اور بہادر شاہ بغاوت کے مقدمہ کی کارروائی ختم ہونے کے بعد رنگون میں جلاوطن کر دئے گئے۔ ان کے ساتھ ملکۂ زینت محل اور شہزادۂ جواں بخت بھی رنگون بھیجے گئے رنگون میں جاکر شہزادۂ جواں بخت کے ہاں شہزادۂ جمشید بخت پیدا ہوئے اور جمشید بخت کے دو لڑکے سکندر بخت اور بیدار بخت پیدا ہوئے۔ جمشید بخت کے انتقال کے بعد سکندر بخت اپنی پھوپی رونق زمان بیگم کے پاس رنگون میں رہنے لگے۔ رونق زماں بیگم سے رنگون میں میں بھی ملا تھا ابھی حال میں اُن کا انتقال ہوا ہے۔ چھوٹا لڑکا بیدار بخت چھ مہینے کا تھا جب شہزادۂ جمشید بخت کا انتقال ہوا۔ بیدار بخت کے نانا پیارے میرزا صاحب لکھنؤ کے رہنے والے ہیں وہ اس بچہ کو لیکر ہندوستان چلے آئے کیونکہ برما گورنمنٹ نے اُس بچے کی پنشن منظور نہیں کی اور یہ حکم دیا کہ ۱۶ برس کی عمر تک آٹھ روپے ماہوار اس بچے کو دئے جا سکتے ہیں۔ مگر رنگون جیسی مہنگی جگہ میں آٹھ روپے آٹھ دن کے لئے بھی کافی نہ ہو سکتے تھے۔ اِس لئے پیارے میرزا نے گورنمنٹ سے ہندوستان جانے کی اجازت مانگی، اور جب اُن کو اجازت ملگئی تو میرے برمی مریدوں نے اُن کے خرچ کا انتظام کر دیا اور وہ دہلی میں آ گئے۔ یہاں حکیم مسیح الملک حافظ محمد اجمل خاں صاحب مرحوم نے پچاس روپے ماہوار اس بچے کے خرچ کے لئے مقرر کر دئے لیکن تین مہینے کے بعد یہ امداد بند ہو گئی تو میں نے دیسی ریاستوں میں کوشش کی اور جب مجھے کہیں کامیابی نہ ہوئی تو اعلیحضرت حضور نظام کو لکھا اور انہوں نے پچاس روپے ماہوار شہزادۂ بیدار بخت کے نام جاری فرما دئے۔ جو اُن کو آجتک ملتے ہیں۔ اور شہزادۂ بیدار بخت اپنے نانا پیارے

میرزا صاحب کے ہمراہ مٹیا برج کلکتہ میں رہتے ہیں۔

اِن کے بڑے بھائی میرزا سکندر بخت ابھی تک رنگون میں ہیں اُن کی پھوپی رونق زماں بیگم صاحبہ کو ڈھائی سو روپے پنشن ملتی تھی۔ جب اُن کا انتقال ہوا تو پنشن بند ہوگئی اور میرزا سکندر بخت کی گذر اوقات کا کوئی سامان نہ رہا۔ اب میرزا سکندر بخت اپنے پردادا بہادر شاہ اور پردادی ملکۂ زینت محل کی قبروں پر بیٹھے رہتے ہیں اور وہاں جو کچھ نذر نیاز آتی ہے اُس سے گذارہ کرتے ہیں۔ چند مہینے کا ذکر ہے میں نے میرزا سکندر بخت کے لئے گورنمنٹ میں کوشش کی تھی مگر افسوس ہے کہ برما گورنمنٹ کے ہاں یہ کوشش منظور نہیں ہوئی۔

یہ تذکرہ بہادر شاہ کی اُس اولاد کا تھا جو اُن کے منظورِ نظر بیٹے جواں بخت سے چلی۔ جواں بخت کو ادبی دنیا کے ناظرین اچھی طرح جانتے ہونگے انہی کی شادی ہوئی تھی جب غالب اور ذوق کے سہروں کا جھگڑا پڑا تھا جس کا تذکرہ شمس العلما مولانا آزاد دہلوی نے آبِ حیات میں بھی لکھا ہے۔

اب دوسرے ولیعہد میرزا فخرو کی اولاد کو دیکھنا چاہیئے۔ میرزا فخرو کے صاحبزادہ میرزا فرخندہ جمال تھے جو غدر کے زمانے میں میرے ہاں بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ میں آگئے تھے اور ان کی عمر کا بڑا حصہ یہیں گزرا۔ شہزادہ احمد شاہ انہی شہزادہ فرخندہ جمال کے بڑے بیٹے ہیں۔ دہلی گورنمنٹ تیموریہ خاندان کے افراد کو پہلے پانچ روپے ماہوار فی کس پنشن دیتی تھی۔ اس کے بعد دس روپے ماہوار ملنے لگے لیکن بعض افراد کو معقول رقمیں ملتی تھیں چنانچہ شہزادہ فرخندہ جمال صاحب مرحوم کو بھی ولی عہد کا بیٹا ہونے کی وجہ سے شاید ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ اور اب وہ پنشن شہزادہ احمد شاہ اور اُن کے بھائی بہنوں میں تقسیم ہوگئی ہوگی۔ شہزادہ احمد شاہ اپنے والد کی زندگی سے دہلی کچہری میں نوکر ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ ان کے صحیح النسب ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ معلوم نہیں ان کے نسب کے خلاف کیوں مغل گزٹ میں مضمون شائع کردیا گیا۔

شہزادہ دارا بخت کی اولاد بھی دہلی میں موجود ہے مگر اُس کے تفصیلی حالات مجھے معلوم نہیں ہیں۔ البتہ ان کی اولاد میں ایک شخص میرے ہاں خانگی ملازم ہیں۔ جن کا نام میرزا سہراب شاہ ہے ان کے والد کا نام مرزا محمد عمر اور ان کے والد مرزا تراب شاہ ان کے والد مرزا دارا بخت ولی عہد اوّل بہادر شاہ بادشاہ۔

عبرت

یہ تو خیر نسب کا قصہ تھا۔ اب مجھے عبرت کے لئے بھی کچھ لکھنا ہے۔ خیال کریں وہ لوگ جن کو خدا نے دولت اور حکومت عطا فرمائی ہے۔ اور جو اپنی دولت اور حکومت کو ہمیشہ قائم رہنے والی دولت اور حکومت سمجھ رہے ہیں اور اس کے گھمنڈ اور غرور میں محکوموں اور غریبوں کو ذلت اور حقارت سے دیکھ رہے ہیں۔ ذرا دیکھیں گریٹ مغل امپائر کے اس انجام کو کہ ایک ولی عہد کا پوتا پرداد اکی قبر پر چڑھاوا لے رہا ہے اور اس سے زندگی کے دن گزر رہے ہیں اور ایک ولی عہد کا پوتا دہلی کی کچہری میں نوکری کر رہا ہے۔ اور ایک ولی عہد کا پڑپوتا معمولی نوکری سے زندگی گزار رہا ہے۔ آج سے ستر برس پہلے یہ بات کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ شہنشاہِ ہندوستان کی اولاد کا یہ انجام بھی ہوسکتا ہے۔ جس کو آجکل ہم سب معمولی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

اسی دہلی میں ہی نے بہادر شاہ کے ایک نواسہ میرزا قمر سلطان مرحوم کو اور ایک دوسرے پوتے میرزا نصیر الملک کو بھیک مانگتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

اے انسان! ڈر اپنے انجام سے اور گھمنڈ اور غرور کو چھوڑ دے اور چار دن کی دولت اور حکومت کو لازوال نہ سمجھ۔

حسن نظامی دہلوی

. . . .

رباعی

اندوہِ محبت کی فراوانی ہے
محفل مری تصویرِ پریشانی ہے
دے بادۂ دلگداز و اندوہ ربا
یہ بادۂ تلخ تو مجھے پانی ہے

انسان کا منتہائے کمال

بادی النظر میں یہ سوال بہت ہی ہلکا اور آسان معلوم ہوتا ہے لیکن جب اس کا جواب دینے بیٹھئے تو ایک مشکل اور دقیق معمہ بن جاتا ہے اور جتنا اس پر غور کیجئے اسی قدر اس کی پیچیدگیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ آپ غالباً اس کا جواب یوں دیں گے کہ عمرِ انسان کا بہترین وقت وہ ہوتا ہے جب وہ جسمانی اور دماغی طاقت کی انتہائی منزل پر پہنچ جاتا ہے اور اس میں اتنا اضافہ اور کریں گے کہ یہ منزل پنتیس چالیس یا پچاس سال کی عمر پر آجاتی ہے۔

پھر بھی یہ جواب کوئی کافی اور تشفی بخش جواب نہیں۔ اس کے متعدد اسباب ہیں۔ مثلاً یہ بہت ممکن ہے کہ ایک آدمی اپنے دماغی کمال پر پہنچنے سے پندرہ برس پہلے اپنے جسمانی کمال کو پہنچ جائے۔ یا دماغی طاقت کے ختم ہو جانے کے دس بارہ سال بعد تک اس کی جسمانی طاقت قایم رہے۔ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالنے اور تجربات و مشاہدات کے خزانے میں اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے سے صرف ایک بات کا پتہ چلتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ عام طور پر انسان کا اعلیٰ اور بہترین جوہر اس کی عمر کے پچھلے حصے میں یعنی آخر کی طرف نمودار ہوتا ہے۔ اعداد و شمار ہمیں بتاتے ہیں کہ انسانی حیات کی مدت بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم تحقیقات یہ ہے کہ ہماری جسمانی اور دماغی قوتیں بھی زیادہ عمر تک باقی رہنا چاہتی ہیں۔ وہ پرانی کہاوتیں کہ "چالیس برس میں بوڑھے ہو گئے" یا "ساٹھ برس کی عمر میں دنیاوی جد وجہد سے کنارہ کش ہو جاؤ" اب بالکل غلط اور لغو ثابت ہو چکی ہیں۔

اس حقیقت میں شک نہیں کہ فطرت کے قوانین سے خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی ہر بچہ نوجوان .... اور ہر جوان بوڑھا ہوتا ہے۔ لیکن بڑھاپے کو ہم نے جس درماندگی، مایوسی۔ انحطاط۔ ضعف اور جسمانی و دماغی تعطل کا مرادف بنا رکھا ہے وہ خود ہمارے ہی فکر و عمل اور ہمارے ہی دل و دماغ کا قصور ہے۔ حضرت حافظ علیہ الرحمتہ کا یہ شعر کہ؎

من نہ آن رندم کہ ترکِ شاہد و ساغر کنم
محتسب داند کہ من ایں کار را کم تر کنم

جب آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو دل و دماغ کہتا ہے کہ اس کارزارِ عالم میں ارتقا کی جنگ جاری رکھنی چاہیئے۔ جب تک جسم و روح کا رشتہ قایم ہے کبھی ترقی کی راہ سے قدم پیچھے نہیں ہٹانا چاہیئے کسی عمر پر پہنچکر بھی یہ سمجھ لینا کہ اب ہم منزلِ آخر پر پہنچ گئے اور اس کے بعد زوال کے سوا اور کوئی چیز ہاتھ نہیں آسکتی ہماری انتہائی غلطی ہے اور یہی احساس ہمارے تنزل کا باعث۔ لیکن بعد کو دیکھتا ہوں کہ حافظ سا فلسفی بھی بڑھاپے کے اثرات سے بچ نہ سکا اور اسے مجبور ہو کر یہ کہدینا پڑا کہ

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو
رندی و ہوس ناکی در عہدِ شباب اولٰے

بس یہی احساس کہ ہم اب کسی کام کے نہ رہے۔ ہماری تباہی و بربادی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جس وقت ہم یہ خیال کر لیتے ہیں کہ ہماری عمر کا کوئی خاص وقت ہماری جسمانی و دماغی ترقی کی آخری منزل ہے۔ اسی وقت سے ہم ذہنی زوال میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انگلستان کا مشہور شاعر ٹامس ہارڈی جب کوئی گمنامی میں ایک معمولی معمار کا کام کرتا تھا تو اس کی عمر پنتالیس سال کی ہو چکی تھی۔ لیکن اس سن میں قدم رکھنے کے بعد اس کا اصلی دورِ حیات شروع ہوا اور اُس نے اپنا پہلا ناول تصنیف کیا۔ اور اسوقت جب لوگ یقیناً اُسے بوڑھا اور گیا گذرا سمجھتے ہوں گے یعنی ساٹھ برس کی عمر میں اُس نے شاعری شروع کی۔ اور اس کے بعد بیس سال تک اس کام میں پورے جوش و خروش اور کامل طاقت و توانائی کے ساتھ منہمک رہا۔

امریکہ کے مشہور کروڑپتی راک فیلر کو ڈاکٹروں نے کہدیا تھا کہ اب تم اپنی عمر کی انتہائی منزل پر پہنچ چکے اور تمہارے قویٰ کا انحطاط شروع ہو گیا ہے۔ اس وقت اُس کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ لیکن اس عمر میں بھی وہ ایک اوزار تیار کر رہا تھا۔ اُس نے اپنے طبی مشیروں کی رائے کو ٹھکرا دیا اور اپنی قوتِ ارادی میں وہ فولادی صفت پیدا کر لی کہ آج بھی نوّے برس کی عمر میں بے تکلف گالف کھیلتا ہے اور زندگی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

سائینس نے ثابت کر دیا ہے کہ دماغ سے کام لینا کبھی دماغ کو کمزور نہیں بناتا اس سے آپ جتنا کام لیں گے اتنی ہی اس کی طاقت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ آج دنیا میں اُن زندہ شخصیتوں پر نظر ڈالئے جن کی عمریں ستّر اور نوّے کے درمیان ہیں اور دیکھئے کہ محنت اور کام نے اُن کی زندگیوں کو کس درجہ مفید اور قابلِ رشک بنا دیا ہے۔ کیا مشہور ماہرِ روحانیات سر آلیور لاج اپنی حیات کی آخری منزل سے گذر چکے ہیں؟ کیا ٹامس ایڈیسن کا دماغ آج سے پہلے زیادہ قوی اور زیادہ کارگر تھا؟ کیا مہاتما گاندھی اب دنیا میں کسی کام کے نہیں رہے۔ اور ان کی دماغی و روحانی طاقت اب زوال پذیر ہے؟ کیا سر رابندر ناتھ ٹیگور جو آج بھی ساری دنیا کا سفر کر رہے ہیں۔ اب اس قابل نہیں کہ اپنے فلسفے اور نغمات سے دنیا کو فائدہ پہنچا سکیں؟

یہ تو صرف چند مثالیں ہیں۔ ایسی سیکڑوں اور ہزاروں مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ انسانی طاقت کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنے منتہائے کمال پر کب اور کس عمر میں پہنچتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوتوں کا انحطاط اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہم زندگی پر اپنی گرفت رکھنا چھوڑ دیتے ہیں اور مایوسی کا شکار ہو کر جینے کی اصلی خواہش اور اصلی خوشی سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور ہمارے خیال و عمل پر یہ عالم طاری ہوتا ہے کہ ؎

خضر کیا ہم تو اس جینے میں بازی سب سے جیتے ہیں
دم اب گھبرا گیا اللہ اکبر کب سے جیتے ہیں

اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے زیادہ حیات انہیں لوگوں نے پائی ہے جنہوں نے اپنی زندگی سے پورا پورا کام لیا ہے اور جسم و دماغ کو کبھی بیکار رہنے نہیں دیا۔ مشغولیت ہی ان کی دلچسپی تھی اور کام کرنا ان کا سرمایۂ حیات تھا۔ امریکہ کی ایک جدید تحقیقات کے سلسلہ میں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انسان کی زندگی پر سب سے بڑا خطرہ وسطِ عمر میں آتا ہے اور اسی اثنا میں اموات بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ اگر انسان ہمت کر کے اس سے آگے نکل گیا تو وہ بڑی عمر تک زندہ رہے گا لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسا واقعہ ہے جو وسطِ عمر میں اسے خطرے میں ڈال دیتا ہے؟ امریکن محقق کے پاس اس کا صرف ایک جواب ہے یعنی "فکر"

ہر ڈاکٹر آپ کو یہ بتلائے گا کہ فکر قوتِ حیات کو گھٹا دیتی ہے اور جب مدافعت کی طاقت باقی نہیں رہتی تو سیکڑوں امراض کے لئے دروازے کھل جاتے ہیں۔ زندگی پر ہماری گرفت باقی نہیں رہتی اور ہماری خواہشِ حیات دھیمی پڑ جاتی ہے۔ وسطِ عمر ہماری حیات کا وہ حصہ ہے جس میں ہم جوانی کے خواب سے بیدار ہوتے ہیں اور یہ بیداری ہماری مایوسی کا گہوارہ بن جاتی ہے لیکن اگر اس سے متاثر نہ ہو کر ہم اس وقت زندگی کے صحیح فلسفہ پر قادر ہو جائیں اور اس بات کو اچھی طرح ذہن نشیں کر لیں کہ زندگی جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی قابلِ قدر اور لطف اندوز ہوگی تو ہماری حیات میں ترقی ہوتی رہیگی۔

جسمانی اور دماغی طاقت بھی ہماری قوتِ ارادی کی ماتحت ہے۔ اس لئے عاقل آدمی کبھی اپنی زندگی کو چڑھاؤ اور اتار کے دو حصوں میں تقسیم نہیں کرے گا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ زندگی ایک ایسی راہ ہے جو ہمیشہ اوپر کی طرف چڑھتی جاتی ہے اور اس کی انتہائی بلندی زندگی کے اختتام پر ہے۔

زندگی کے اختتام پر؟ ہاں۔ موجودہ زندگی کے اختتام پر کیونکہ اصلی زندگی ختم نہیں ہوتی اور یہ موت صرف جسمانی موت ہے روحانی موت نہیں۔ بقول میر ؎

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

(سید ابن الحسن فکر)

اشعار

تری چشمِ خمار آلود سے دوری بہت اچھی
کہیں ایسا نہ ہو اس بادۂ رنگیں میں سم نکلے

غرورِ عیش تھا جن کو انہیں پابندِ غم پایا
جنونِ عشق تھا جن کو وہی آزادِ غم نکلے

نہایت غور سے ہم نے کتابِ زندگی دیکھی
بہت افسانہ ہائے بیکسی زیبِ رقم نکلے

کشاکش ہائے فرقت نے ہمیں بے حال کر ڈالا
الٰہی کیا مصیبت ہے نہ غم جائے نہ دم نکلے

مشاہیر سائنس

سر جگدیش چندر بوس اور اُن کے حیرت انگیز کارنامے

(۱)

ہندوستان کے طول و عرض میں شاید ہی کوئی ایسا تعلیمافتہ شخص ہو جس نے سر جگدیش بوس کا نام نہ پڑھا ہو اور جب اُن کے حیرت انگیز کارناموں کو پڑھا ہو تو اس کے دل میں مسرت اور شادمانی کی لہر نہ دوڑ گئی ہو۔ بوس نے دنیائے سائینس میں جو عجیب و غریب اکتشافات کئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان پھر ہندوستان ہی ہے۔ اس گئے گذرے زمانے میں بھی یہاں کی مردم خیز خاک سے ایسے گرانمایہ جوہر عالم وجود میں آتے رہتے ہیں۔ جن پر علم و ادب ابد تک ناز کرتا رہے گا۔

اگرچہ سر جگدیش بوس کو عالمگیر شہرت حاصل ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ کسی ماہرِ فن کو اس کی زندگی میں اس سے زیادہ شہرت نصیب نہیں ہوئی ہوگی لیکن یہ عالی مرتبہ انسان اپنی کامیابی پر مطلق نازاں نہیں۔ بلکہ اس کے خیالات ہمیشہ مستقبل سے وابستہ رہتے ہیں وہ اُن کامیابیوں۔ ایجادوں اور ترقیوں کا خواب دیکھتا رہتا ہے۔ جن کی تعبیر اس کی زندگی میں نہیں مل سکتی۔ چنانچہ ان کا قول ہے۔ "وسعتِ نگاہ کا کوئی ٹھکانا نہیں مطمحِ نظر کی کوئی حد نہیں مقصدِ انسانی کی کوئی انتہا نہیں اس لئے انسانیت کا نصب العین ایک فرد کی زندگی یا کوشش سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے حصول کے لئے مختلف افراد کی مسلسل کاوش اور کوشش درکار ہے۔

اگرچہ سر جگدیش حسنِ ظاہری کے مالک نہیں لیکن جب کوئی شخص اُن سے سرگرمِ گفتگو ہو تو ان کی شخصیت اور حسنِ باطنی کا گرویدہ ہو جاتا ہے مثلاً جب وہ اثنائے گفتگو میں کسی کو یہ بتائیں کہ فلاں پودے کی شاخیں بڑی جلدی تھک جاتی ہیں۔ یا کسی گل شبو کی تدریجی نشو و نما کا حال سنائیں یا یہ ثابت کریں کہ جب کسی درخت کی رگوں میں عرق کا دورہ ہوتا ہے تو اس میں بالکل حیوانی نبض کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے یا جب وہ یہ دکھائیں کہ دھاتیں بھی مسلسل تختۂ مشق بنے رہنے سے تھک جاتی ہیں تو وہ شخص یقینی طور پر مبہوت ہو کر رہ جائے گا۔ اور ان کی باتوں میں ایسی دلچسپی لے گا کہ دنیا و مافیہا سے بیخبر ہو جائیگا۔

اور طرفہ یہ ہے کہ جب وہ یہ تعجب خیز باتیں آپ کریں گے تو اس لہجہ اور انداز میں گویا ان باتوں کا دریافت کرنے والا کوئی اور شخص ہے اور وہ صرف آپ کو آگاہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ عموماً ہر موجد یا محقق اپنی ایجاد یا تحقیق کو ایک فخریہ لہجہ میں بیان کرتا ہے۔ اور ہر لفظ پر داد طلب ہوتا ہے۔

سر جگدیش پہلے ہندوستانی ہیں جن کو مغرب کے اربابِ سائنس نے اپنا مدِمقابل تسلیم کیا ہے۔ لیکن یہ عزت ان کو بآسانی نصیب نہیں ہوئی۔ بیس سال مسلسل انہوں نے خاموشی کے ساتھ تحقیق و تدقیق میں بسر کئے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ جب تک کوئی شخص ذاتی مفاد اور جذبۂ ناموری کو پس پشت نہ ڈالدے اس وقت تک گوہرِ مقصود "یعنی صداقت حاصل نہیں ہو سکتی۔ محقق کو چاہیئے کہ تلاشِ حقیقت پر فخر نہ کرے۔ بلکہ اس "حقیقت" کا گواہ بن کر دنیا کے سامنے آئے"۔

اس قول سے یہ نتیجہ نکالنا کچھ دشوار نہیں کہ سر جگدیش علمی طور پر جس قدر سربلند اور ممتاز ہیں۔ شخصی طور پر اُتنے ہی منکسر المزاج اور عاجزی پسند ہیں۔ سچ کہا ہے سعدیؒ نے

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست

کسی شخص کے کارنامے اور اس کی سیرت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ہمیں "ماضی" سے باخبر ہونا نہایت ضروری ہے کیونکہ "حال" جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں "ماضی" سے وابستہ ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں جو عرصہ دراز سے گمنامی کی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ بکلخت بوس جیسا عالی دماغ سائنسدان کیونکر پیدا ہو گیا جس نے اپنی خداداد قابلیت کی بدولت دانایان یورپ کو محوِ حیرت بنا دیا۔ اور سائنس میں ایک نئی روح پھونک دی؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب کہ ہندوستان اس قسم کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور ان کی علمی اور عقلی داستانیں آج بھی زینتِ اوراق اور زیبِ مجالس ہیں۔ ہندوستان ہمیشہ علم و فضل کے لحاظ

سے بہترین قسم کے آدمی پیدا کئے ہیں۔ اگر ایک شخص ہمارے زمانہ میں پیدا ہو گیا تو کیا تعجب ہو سکتا ہے؟

واضح ہو کہ یہ شخص جسے ہم بوس کے نام سے جانتے ہیں ہندوستان ہی کے اربابِ حکمت کا استاد نہیں ہے۔ بلکہ یورپ اور امریکہ والے بھی اس کی علمیت اور لیاقت کا لوہا مانتے ہیں۔ اگرچہ انگلستان کی مشہور ترین علمی سوسائٹی جسے رائل سوسائٹی آف لندن کہتے ہیں برسوں بوس کی علمیت اور لیاقت کا اعتراف کرنے سے پہلو تہی کرتی رہی۔ لیکن آخر کار اس سادہ مزاج لیکن روحانیت اور صداقت سے لبریز بنگالی بزرگ کے سامنے اُسے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ بوس پہلا ہندوستانی ہے جسے مغربی زاویۂ نگاہ سے رائل سوسائٹی کا رکن منتخب ہونے کی عزت حاصل ہوئی۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بوس کے رکن ہو جانے سے سوسائٹی کو چار چاند لگ گئے۔

سب سے بڑی خوبی بوس میں یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ایجادات کو دولت حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اگر وہ طالبِ زر یا جویائے عیش و عشرت ہوتے تو آج کئی کروڑ روپیہ اُن کے نام سے بنکوں میں جمع ہوتا۔ لیکن وہ سائنسدان ہونے کے ساتھ ساتھ مشرقی روایات پر بھی سختی کے ساتھ کاربند ہیں۔ وہ اس حقیقت کو خوب سمجھتے ہیں کہ علم کی کوئی قیمت نہیں یہ تو ایک بے بہا شے ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ یورپ کی ایک کمپنی نے اُن سے درخواست کی کہ اگر آپ فلاں ایجاد کا "پیٹنٹ" کمپنی کے حق میں ہبہ کر دیں تو اس کے عوض آپ کو پانچ لاکھ پونڈ بطور معاوضہ پیش کیا جائیگا انہوں نے نہایت متانت کے ساتھ جواب دیا۔ "جس دن میں اپنی بی بی کو فروخت کردوں گا اس دن "ایجادات" اور اُن کے "پیٹنٹ" کے معاوضہ کے متعلق بھی تبادلۂ خیال ہو سکتا ہے۔ سردست تو یہ امر محال معلوم ہوتا ہے"

بوس نے جس قدر ایجادات و اختراعات کی ہیں یا جس قدر کتابیں لکھی ہیں۔ سب رفاہِ عام کی خاطر وقف کر دی ہیں۔ کوئی ایجاد ایسی نہیں جسے "پیٹنٹ" کرایا گیا ہو کوئی کتاب ایسی نہیں جس کا حقِ تالیف محفوظ ہو گویا بوس نے یہ مصرع پڑھ کر ایک علمی دسترخوان بچھا دیا ہے۔ ع

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

بقراط۔ سقراط۔ جالینوس اور ابن سینا نے بھی کبھی اپنی علمی و طبی تحقیقات کا کوئی صلہ قبول نہیں کیا۔ یہ لوگ اس "راز" سے واقف تھے کہ قیمت لے لینے سے چیز کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔

بوس نے اپنی تصنیف موسومہ "ندائے حیات" (The Voice of Life) میں مذہب۔ شاعری اور سائنس تینوں کو ایک کر دیا ہے۔ خصوصاً یہ فقرہ تو آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ "ابدیت و بقائے انسانی کا راز مادہ میں نہیں بلکہ فکر میں اور ملکیت یا حصول میں نہیں بلکہ نصب العین میں مضمر ہے"۔

اگرچہ بوس رات دن مادہ اور عالم کی پوشیدہ قوتوں کا کھوج لگاتا رہتا ہے۔ لیکن اس کا نصب العین مادی یا محدود نہیں ہے۔

بوس انسٹی ٹیوٹ کلکتہ کی رسمِ افتتاح کے موقعہ پر جو تقریر اس عبقری انسان نے کی تھی اس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا تھا۔

"آج میں اس انسٹی ٹیوٹ کو جسے میں محض (Laboratory) نہیں سمجھتا بلکہ معبد (Temple) یقین کرتا ہوں۔ علم کی نشر و اشاعت کے لئے وقف کرتا ہوں جو کچھ کامیابی ہمیں حاصل ہوئی ہے وہ اُس کامیابی کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ جو آئندہ نسلوں کے لئے مقدر ہے"۔

طلبہ کی طرف خطاب کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔ "بعض حقیقتیں ایسی ہیں جو سائنس کے انتہائی ذکی الحس طریقوں سے بھی بالاتر رہیں گی اور بڑے سے بڑے سائنسدان کی عقلی دسترس سے باہر ثابت ہوں گی۔ ان حقائق کا علم حاصل کرنے کے لئے سائنس کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اس "ایمان" (faith) کی ضرورت ہے جو آزمودہ اور مجرب ہو جس پر تمام زندگی تمہارا چلن رہا ہو"۔

ایک جگہ لکھتے ہیں "جب کوئی شخص اپنی زندگی کسی عظیم الشان مقصد کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ تو ایک دن ایسا آتا ہے جب ساری مشکلات حل ہو جاتی ہیں اور جو بات پہلے ناممکن معلوم ہوتی تھی اب ممکن ہو جاتی ہے"

تموجاتِ برقی (Electric waves) کے متعلق کئی سخت دشواریاں بوس کے راستہ میں حائل تھیں لیکن چھ مہینے کی لگاتار محنت (تجربہ) کے بعد بالآخر کامیابی نصیب ہو ہی گئی۔

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد
اگر خارے بود گلدستہ گردد

تموجاتِ برقی کے متعلق بوس کی تحقیقات کو انگلستان کے علمی حلقوں میں نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اور رائل سوسائٹی نے اس سلسلے میں مزید تحقیقات کرنے کے لئے ایک رقم کثیر بوس کے قدموں میں رکھدی۔ پانچ سال تک بوس اسی قسم کی تحقیق و تفتیش میں مشغول رہا۔ لیکن اس کے بعد ایک حیرت انگیز بات ظہور میں آئی یعنی دورانِ تحقیقات میں اُسے معلوم ہوا کہ نظامِ عضوی (Organic) اور نظام

غیرعضوی (In organic) یعنی زندہ اور مردہ اشیاء میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مادہ غیرعضوی جامد اور بیجان نہیں ہے۔ اس تحقیق کا نتیجہ یہ ہو کہ علمی دنیا میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔

دوران تحقیقات میں بوس کو معلوم ہُوا کہ دھاتیں۔ پودے اور حیوانات ایک عالمگیر ردِ عمل کی بدولت ایک مشترک قانون کے ماتحت آجاتے ہیں۔ اور اس نتیجے پر پہنچ کر انہوں نے اس امر کا احساس کیا کہ اگر سائنٹیفک طور پر ثابت ہو سکتا ہے کہ کائنات بحیثیت مجموعی ایک شئے واحد ہے۔ اپنے اندر رنگِ وحدت رکھتی ہے۔

بہرکیف جب بوس نے اس جدید انکشاف کا ذکر احباب سے کیا تو انہوں نے صلاح دی کہ اس تحقیقات کا ماحصل "رائل سوسائٹی انگلستان" کی خدمت میں پیش کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا لیکن ابتداءً اُسے ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ کیونکہ یہ ایک ایسی بات تھی جسے مشکل ہی سے کوئی شخص تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو سکتا تھا۔ علماء فضلا فلاسفر اور سائنسداں تینوں طبقوں کے افراد نے اُس کی مخالفت کی۔ بھلا جو بات صدیوں سے مُسلّم چلی آ رہی تھی اُسے کوئی کس طرح بآسانی پسِ پشت ڈال سکتا تھا۔ انگریزوں نے خصوصاً یہ سمجھا کہ بوس مشرق کا رہنے والا ہے اور وہاں کے لوگ تخیل پرست ہوتے ہیں!!!

اگرچہ یہ ایک بہت سخت مرحلہ تھا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بوس کی زندگی کا مقصد ہمیشہ کے لئے فوت ہو جائے گا۔ لیکن وہ مستقل مزاجی کے ساتھ اعلانِ حقیقت کرتا رہا۔ وہ اس راز بلکہ رمز سے بخوبی واقف تھا کہ "سائنس میں بھی جدید انکشافات کے متعلق لوگ تعصب کو راہ دے سکتے ہیں" بوس خاموشی کے ساتھ بارہ سال تک کلکتہ میں بیٹھا ہُوا تجربے کرتا رہا۔ یعنی اپنے دعوے پر دلائل مہیا کرتا رہا۔ اس کو یقین تھا کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب اہلِ علم اس کے ہمنوا ہو جائیں گے۔ بارہ سال تک بوس نہایت حوصلہ فرسا حالات سے دوچار رہا۔ اور اسی لئے اُس نے اپنے شاگردوں کو تنبیہ کی ہے کہ جو لوگ صداقت کی تلاش کے لئے اپنی زندگی وقف کرنا چاہتے ہیں ان کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کی زندگی دشواریوں اور مشکلات سے لبریز ہے۔ اور جبتک آخری سانس باقی ہو اُس وقت تک مشکلات کا مقابلہ کرنا ہو گا۔

جب تک انسان کے دل میں صداقت کے حصول کا جذبہ موجود نہو وہ مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور جو سائنسداں یا فلاسفر ایسا کرتا ہے۔ اس کے معنی سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ اپنی زندگی "صداقت" کے لئے وقف کر چکا۔ اور جب ایک شخص خاص کر کے ساتھ کسی شئے کی طلب میں منہمک ہو جاتا ہے تو بقول سر ایڈورڈ تھارپس "اللہ تعالےٰ اس کے لئے نئی نئی راہیں کھول دیتا ہے"۔ سر فرانسس بیکن کا بھی یہی خیال ہے کہ دنیا میں جس قدر ایجادات ہوتی ہیں اُن سب میں الہام ربانی انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔

جس وقت بوس اپنی تحقیقات پر تقریر کرتا ہے تو اس کے چہرے سے شادمانی ہی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی روحانی طاقت اُس کے اندر کارفرما ہے۔ اور بوس خود کہتا ہے کہ "صداقت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان اپنی جان، اپنے نفع اور نقصان کے خیال سے بالاتر ہو کر تحقیق کی دیوی کے سامنے نذر کر دے"۔

یوسف سلیم

رباعیات

کاٹے سے جو کٹ جائے وہ منزل ہی نہیں
پائے جو کبھی چین وہ دل دل ہی نہیں
رکھتے ہیں اُسے جی میں جو نکلے نہ کبھی،
ہم آرزوئے خام کے قائل ہی نہیں

بیمار کی اعضا شکنی اچھی تھی
اس چین سے تو سر پہ بنی اچھی تھی
دیکھی جاتی نہیں وطن کی حالت
اس سے تو غریب الوطنی اچھی تھی

بیکس اکبر آبادی

تعلیمات

مدراس کرسچین فورمین کالج کے پرنسپل نے مقامی طلبہ کے سامنے ہندوستان کی تعلیمی حالت پر کئی لکچر دئے۔ اُنہوں نے کہا کہ تمام ہندوستان میں دو کروڑ روپیہ ابتدائی اور انتہائی تعلیم پر خرچ ہوتا ہے حالانکہ اسکاٹ لینڈ کے سے چھوٹے ملک میں جس کی آبادی صرف پچاس لاکھ ہے ۹ کروڑ روپیہ سے زیادہ تعلیم میں صرف ہو جاتا ہے ان کے خیال میں اگر مدرسوں پر زیادہ روپیہ خرچ کیا جائے تو جیلخانوں پر بہت کم خرچ کرنے کی ضرورت ہوگی۔

پرنسپل صاحب نے فرمایا کہ اگر ہم مصارف کی کمی سے قطع نظر کریں تو جو روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ اس کا مصرف بھی قابل اطمینان نہیں ہے۔ چنانچہ ابتدائی تعلیم پر صرف ایک کروڑ کا خرچ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے میں تعلیم کی کامیابی کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے۔

(۱) اچھے معائنہ کرنے والے۔

(۲) معلّمین کی تعلیم کا معقول انتظام۔

(۳) خرچ کی مناسب تقسیم۔

ہندوستان میں ان تینوں چیزوں کا انتظام ناکافی ہے۔ چنانچہ صوبۂ مدراس میں چالیس ہزار ابتدائی مدرسے ہیں۔ جن کی نگرانی کرنے والے انسپکٹر صرف چالیس ہیں۔ معلّمین کی تعداد ۶۰ ہزار ہے۔ لیکن آدھے سے زیادہ فنِ تعلیم سے ناواقف ہیں۔ آپ کی رائے میں تعلیمی طریقوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ فان بیروشم ایک مشہور علم دوست اور مستشرق کی بیوی نے اپنے شوہر کی وصیت کے مطابق سوئٹزرلینڈ کے شہر جینوا کی میونسپلٹی کو ان کا بیش قیمت کتبخانہ جس میں قلمی کتابوں کے نادر نسخے اور بہت سے علمی اور تاریخی مکاتیب وغیرہ ہیں۔ عطا فرمایا ہے۔ یہ کتابیں سب کی سب اسلامی تمدن کے متعلق ہیں۔ اور تمام اسلامی ممالک سے جمع کی گئی ہیں۔ ان میں بعض خود بیروشم صاحب نے اپنے سفرِ ایشیا کے دوران میں وہاں کے کتبخانوں سے اور بعض یورپ کے عام عجائب خانوں یا کالج کے کتبخانوں سے نقل کی تھیں۔ اور بعض اُن عکسی تصاویر سے جو اُن کے پاس بیس برس سے دنیا کے ہر گوشہ سے آ رہی تھیں۔ خوردبین کے ذریعے سے تیار کرائی تھیں۔ اُن میں سے بعض کتابیں چھپ بھی گئی ہیں۔ لیکن تین چوتھائی غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کتابوں پر فان بیروشم نے اپنے ہاتھ سے حواشی اور حوالے لکھے ہیں۔

علاوہ اِن کتابوں کے خود فان بیروشم کی ایک تالیف ہے جن ملکوں میں یہ گئے تھے، وہاں کے آثارِ قدیمہ کی بابت مفصّل نوٹ ہیں جو تینتیس ۳۳ جلدوں اور چند اوراق پر مشتمل ہیں۔ ان کے ساتھ انڈیکس بھی ہے۔ مگر ناقص اور نامکمّل۔ یہ کاغذات جینوا کے فنونِ لطیفہ اور تاریخ کے عجائب خانوں میں داخل کر دئے گئے ہیں۔ اور کتابیں شہر کے عام کتب خانے میں۔ یہ ہیں علم دوستی کی مثالیں جو ہمیں یورپ کے لوگوں میں اکثر ملتی ہیں۔ بعض صورتوں میں ان باتوں کی کوئی سیاسی یا اقتصادی غرض ہوتی ہے۔ لیکن عموماً خالص علمی ذوق اربابِ ہمّت کو ان کاموں پر آمادہ کرتا ہے۔ ہندوستان کے وہ اہلِ علم جن کا پیشہ یورپ پر سب وشتم کرنا۔ وہاں کے اہلِ علم وفضل کی کوششوں کی تنقیص کرنا۔ اور خود کچھ نہ کرنا ہے۔ اگر انصاف کریں تو انہیں کہنا پڑیگا کہ ان معاملات میں یورپ والے تحسین وآفریں کے مستحق ہیں۔

لندن میں گزشتہ مہینے میں ڈاکٹر مانٹیسوری کے حامیوں نے صاحبِ موصوف کے طریقۂ تعلیم کی ترویج واشاعت کے لئے متعدد لکچر دئے۔ اُنہوں نے کہا کہ اس طریقۂ تعلیم کے بنیادی اصول دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ اشیاء کے علم کے لئے محض تصور یا مشاہدہ کافی نہ سمجھا جائے۔ بلکہ جس شے کا علم حاصل کرنا ہو اُس کا استعمال کرایا جائے۔ دوسرے یہ کہ تعلیم کے وقت میں بچّے کی توجہ کا مرکز استاد یا اس کا معلّم نہ رہے بلکہ خود اپنے افعال۔ انہیں اصولوں کے ماتحت بچّوں کے ہاتھ سے ایسے بہت سے کام کرائے جائیں جن میں خاص توجہ کی ضرورت ہو تاکہ ایک تو کام کی فکر میں بچّہ استاد کی موجودگی کو بھول جائے اور

دوسرے اپنے کام کے موضوع کا واقف اور گہرا علم اُسے حاصل ہوجائے۔ لکچر دینے والوں نے مثال کے طور پر کئی کاموں کا ذکر کیا۔ مثلاً کمرے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس طرح دوڑنا کہ شور نہ ہو۔ ایک گلاس سے دوسرے گلاس میں پانی اس طرح اُنڈیلنا کہ ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان میں سے پہلا اصول ظاہر ہے کہ بہت محدود دائرہ میں کام آسکتا ہے۔ جو چیزیں علم کی موضوع ہیں ان میں بہت کم اس طرح "استعمال" ہوسکتی ہیں جس طرح ڈاکٹر صاحبہ کے حامی چاہتے ہیں۔ پھر بھی جہاں محسوسات کا تعلق ہے۔ واقعی اس طریقہ سے بہتر کوئی طریقہ مشاہدہ کا نہیں ہے۔ دوسرا اصول بھی بعض شرطوں کے ساتھ قبول کئے جانے کے قابل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بچّوں کی طبیعت کو کسی چیز پر پوری طرح جمانے سے اُن میں یکسوئی، سلیقہ اور صحت نظر پیدا ہوگی۔ اور اپنی شخصیت اور ذمہ داری کا احساس بھی ہوگا۔ لیکن یہ طریقہ ہمیشہ مفید نہیں ہے۔ تعلیم کی جان وہ تعلق ہے جو استاد اور شاگرد میں ہوتا ہے اور وہ اثر جو ایک کا دوسرے پر پڑتا ہے۔ اِس لئے جہاں استاد کے واسطے بچّہ کی "شخصیت" کا احساس ضروری ہے۔ وہاں کبھی کبھی بچّے کے لئے بھی یہ بہتر ہے کہ اُس کی توجہ کا مرکز استاد کی شخصیت ہو۔

ہندوستانی یا غیر برطانوی کے ساتھ ساتھ اب انگریز اہلِ قلم بھی، ہندوستان میں مروجہ طرزِ تعلیم کے نقائص کا علانیہ اعتراف کرنے لگے ہیں۔ ذریعۂ تعلیم، مدتِ تعلیم، اور اُس کی قیمت (صحت اور روپیہ) یہ کھلے ہوئے چند موٹے موٹے عنوان ہیں۔ جن کے تحت میں انہیں جمع کیا جاسکتا تھا مگر خوش قسمتی سے اب یہ بھی محسوس کیا جانے لگا ہے کہ تمدنی حیثیت سے بھی یہ تعلیم غیر مفید ہے۔ ایک منصف مزاج انگریز مصنف نے ہندوستان کے تعلیمی حالات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد مندرجۂ ذیل پانچ امور پر خاص طور سے توجہ دلائی ہے۔ موصوف نے نقائص کے ذکر کے ساتھ ہی چند مناسب تجویزیں بھی پیش کی ہیں جن پر کاربند ہوکر حکومت ملک کو بہت فائدہ پہنچا سکتی ہے:۔

(۱) ہندوستان میں ہماری تعلیم نے چند مادی و سیاسی فوائد تو پہنچائے مگر تمدنی و تہذیبی ترقی میں بجائے معاون ہونے کے خارج ہورہی ہے۔ بے شبہ ہندوستان میں علم کی رفتار تو بڑھ گئی۔ مگر کیا ہم نے زندگی کو پُر لطف بنانے کے لئے بھی کوئی کوشش کی؟

(۲) ہندوستان میں قومیت کی موجودہ روش اور اُس کا بہاؤ مشرق و مغرب کی زندگی اور طرزِ خیال کے اتصال کے خلاف ہے۔

(۳) تعلیم مذہب سے علیحدہ ہوکر، دلوں کی گہرائیوں تک پہنچ نہیں پائی اور نہ سماجی اصلاح کی تحریک میں مدد ہوسکی۔

(۴) اعلیٰ تعلیم کو جہاں تک ہوسکے حکومت کے اثر و اقتدار سے آزاد ہونا چاہئے۔ ابتدائی تعلیم اور خصوصیت کے ساتھ عام تعلیم حکومت اپنے ہی ہاتھ میں لے۔ اِس معاملہ میں پیشقدمی حکومت کی جانب سے ہونا چاہئے۔

(۵) ہندوستان کو انگریز ماہرینِ تعلیم کی ضرورت ہوگی اور بالخصوص مستقبل میں ہندوستانی اِس ضرورت کو بہت محسوس کریں گے۔

صاحبِ موصوف کے یہ خیالات بیشتر درست ہیں۔ ماہرینِ تعلیم کی ضرورت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ ہر تعمیر نو میں ایک اُبھرنے والی قوم کے لئے اِس قسم کی خارجی امداد و اعانت کی ضرورت ظاہر ہے۔ رفتارِ زمانہ کے دوش بدوش چلنا، صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے۔ ہندوستانی، یقیناً نہ صرف انگلستان بلکہ دنیا کے تمام ملکوں سے اس قسم کا رشتہ قائم کرنے کو آمادہ ہوں گے۔

ہندوستان میں قومیت کی موجودہ روش سے متعلق ان کا خیال ایک حد تک بالکل صحیح ہے۔ اور یہ لازمی نتیجہ ہے اُس کوشش کا جو ہندوستانیوں کے دلوں میں اپنے ماضی سے نفرت پیدا کرنے کے لئے عمل میں لائی گئی۔ اور انہیں اس پر تعجب بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ تعلیم نے ہندوستانیوں کی تہذیب و تمدن کی ترقی میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔ قومیت خود ایک تمدنی مظہر ہے۔ ہمارے خیال میں جس چیز کو وہ قومیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ قومیت نہیں بلکہ نفرت ہے۔ ہر تمدنی پیداوار کی طرح قومیت کی تعبیر بھی تعلیم ہی سے ہوتی ہے۔ ہندوستان قومیت سے بیگانہ ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت نے اس کی نشو و نما میں بہت کم حصّہ لیا۔ امریکہ میں اوّل وقت سے تعلیم نے قومیت کی تعبیر میں بنیادی حصّہ لیا۔ فرانس اور جرمنی میں بھی اسی طرح ہوا۔ تعلیم ہی ایک واحد ذریعہ ہے۔ جو قوم میں تمدنی احساس پیدا کرسکتا ہے۔ ہمارے مروجہ نظامِ تعلیم نے کبھی اُس بلند مظہر کو جو قومیت کہلاتا ہے۔ نہیں چھیڑا۔

چند دکنی مرثیہ گو

دورِ مغلیہ

گزشتہ مضامین میں ہم قطب شاہی اور عادل شاہی مرثیہ گویوں کا تعارف کرا چکے ہیں۔ اب دورِ مغلیہ کے چند مرثیہ گو پیش کئے جاتے ہیں۔

دکن کی اسلامی سلطنت (بہمنیہ) محمد تغلق کے عہد میں قائم ہوئی۔ اور دکن کا تعلق منقطع ہوگیا اس کے بعد تقریباً پانچ سو سال تک شمالی ہند سے جنوبی ہند کا تعلق نہیں رہا۔ مگر اکبر اعظم وہ پہلا شخص ہے جس نے ۹۹۵ھ میں پھر سے دکن کی فتح کا ارادہ کر کے حملہ کیا۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے بعد عالمگیر نے دکن کی فتح کا ارادہ مستحکم کر لیا۔ ۱۰۹۷ھ میں بیجاپور اور ۱۰۹۸ھ میں گولکنڈہ فتح ہو کر سلطنتِ دہلی میں شامل ہو گئے۔ اس طرح اب پورا جنوبی ہند مغلیہ سلطنت کا جزو ہوگیا۔

گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں سے شعرائے اردو کی بڑی حوصلہ افزائی ہوتی تھی ان کے ساتھ بیحد مراعات کی جاتیں نے انہیں ان کی تصنیفات کا معقول صلہ دیا جاتا تھا نہ صرف سلاطین بلکہ امراء دکن بھی اردو کی سرپرستی کرتے تھے، ان قدر دانیوں کے باعث عام طور پر شعر و شاعری کا رواج ہوگیا تھا۔ قابل افراد بلا کسی صلہ کی امید یا قدر دانی کے اب اردو میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اس طرح اب ان سلطنتوں کی شکست سے اردو کی ترقی پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ البتہ شعرائے دکن کا مرکز بیجاپور اور گولکنڈہ کی بجائے اورنگ آباد ہوگیا۔

اورنگ آباد کا نام ابتدا میں کھڑکی تھا جس کو نظام شاہی سپہ سالار ملک عنبر نے ۱۶۱۰ء میں اپنا صدر مقام قرار دیا تھا اس وقت سے اس کی رونق اور چہل پہل بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ شاہ جہان کے صوبیدار اور قابل جانشین اورنگ زیب نے اس کو اورنگ آباد سے موسوم کر کے ۱۶۵۳ء میں اپنا صدر مقام قرار دیا۔ دہلی کے تخت پر جلوہ گر ہونے کے بعد بھی گولکنڈہ اور بیجاپور کے فتح کے خیال سے زیادہ عرصہ تک یہاں ہی قیام رہا اور پھر ان کی فتح کے بعد تو اورنگ آباد ہی سلطنتِ مغلیہ کا دارالحکومت قرار پاگیا۔

سلطنتِ ہند کے مستقر ہونے کے باعث شمالی ہند علی الخصوص دہلی کے امراء۔ رؤسا۔ علماء۔ شعرا کثرت سے اورنگ آباد میں آباد ہو گئے اور پھر گولکنڈہ اور بیجاپور کے باکمالوں کا مرکز بھی یہی ہوگیا۔ اس طرح اورنگ آباد نہ صرف سلطنتِ دہلی کے حکومت کا مرکز بنا بلکہ نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی تمدن اور تہذیب کا بھی سنگم بن گیا۔ اور خاکِ اورنگ آباد باکمال شعرا اور ادیبوں کے جھگمٹوں سے رشکِ گلزار ہوگئی۔ اس زمانے کے اُن اردو شعرا کی فہرست طویل ہے جنھوں نے ملکِ سخن سے داد لی اور اپنے کارنامے یادگارِ زمانہ چھوڑے۔

قاضی محمود بحری نے مثنوی من لگن لکھی۔ محمد امین نے مثنوی یوسف زلیخا مرتب کی سیّد محمد عاجز نے مثنوی ملکۂ مصر بنائی۔ ذوقی نے وصال العاشقین وغیرہ لکھی۔ ضعیفی نے مثنوی عشقِ صادق۔ اشرف نے جنگ نامۂ حیدر۔ عشرتی نے مدحِ جیلانی۔ وغیرہ مرتب کیں۔ اس طرح بیسیوں شعرا آسمانِ شہرت پر درخشاں ہوئے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے ۱۰۹۸ھ میں اورنگ زیب نے پورے دکن پر قبضہ کر لیا اس کے ۳۸ اڑتیس سال بعد یعنی ۱۱۳۶ھ میں آصفجاہ اوّل نے اپنی حکومت قائم کی اس قلیل مدت میں بھی صدہا باکمال لوگوں کا ظہور ہوا جو اپنے فن میں یکتا ئے روزگار تھے۔ جن میں سے چند شعرا کے نام اوپر بیان کئے گئے ہیں۔

اسی قلیل عرصہ میں مرثیہ گو بھی بیسیوں ہوئے جن کے مرثیے آج بھی موجود ہیں۔ چند کے نام یہ ہیں۔

ذوقی۔ احمد۔ اشرف۔ اماحی۔ رضی۔ ولی وغیرہم۔

ذیل میں ان کے کلام کو مختصر وضاحت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے -

(۱) ذوقی - شاہ حسین نام اور ذوقی تخلص تھا، مرشد نے بحرالعرفان لقب دیا تھا - شاہ خان محمد کے مرید تھے غالباً بیجاپور وطن تھا - صوفی تھے، شاعری پیشہ نہیں تھا - درویش منش متوکل شخص تھے -

عالمگیر کے عہد میں موجود تھے - انتقال کا سنہ معلوم نہیں - غالباً ۱۱۱۸ھ کے قریب انتقال فرمایا -

ان کی کئی تصنیفیں مشہور ہیں جن میں سے ایک مثنوی وصال العاشقین ہے - جس کو انہوں نے ۱۱۰۹ھ میں مرتب کیا ہے - اس میں وجہی کی "سب رس" کو نظم کیا ہے - دوسری مثنوی غوث نامہ ہے جس میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح کی گئی ہے - اسکی تصنیف بھی ۱۱۰۹ھ میں ہوئی ہے، انڈیا آفس میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے - ان مثنویوں کے علاوہ انھوں نے غزلیں اور مرثیے بھی کہے ہیں - غزلیں مولوی عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو کے پاس اور مرثیے اڈنبرہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہیں -

ذوقی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہنہ مشق شاعر تھا اس کے مرثیے اکثر غزل نما ہیں - زبان تو صاف ہے مگر اثر کم ہے ذیل میں نمونہ پیش کیا جاتا ہے :-

اے شمع بزم مرتضیٰ گھر آج آتے کیوں نہیں
تاریک ہے تم بن جہاں جلوا دکھاتے کیوں نہیں
وہ جاہل و دزخ وطن آئے ہیں بادل کے نمن
جو برق تیغ صف شکن شہ جگمگاتے کیوں نہیں
وہ شمع بزم مصطفیٰ باد اجل سوں گل ہوا
سب سوز دل سوں تن ہوا سدا یاراں گلا تے کیوں نہیں
چھوڑو سکل دنیا کے کام دس دن تلک اے خاص و عام
ماتم کے آتش میں مدام تن کوں جلاتے کیوں نہیں
سنتے ہو تم اے مومناں شہ کی شہادت کا بیاں
سب خاک و خوں کے درمیاں تن کو ملاتے کیوں نہیں

سلام کا نمونہ ملاحظہ ہو -

شمس الضحےٰ پر سلام بولو　　بدر الدجا پر سلام بولو
شبیر خدا پر سلام بولو　　آل عبا پر سلام بولو
ذوقی کہتا ہے صبح و مسا یہیں　　اس رہنما پر سلام بولو

(از بیاض اڈنبرہ یونیورسٹی)

(۲) احمد - اس تخلص کے بھی دکن میں متعدد شعرا ہوئے ہیں - جو اپنے قوت بیان کے باعث شہرت رکھتے تھے - قطب شاہی دور میں ایک احمد تھا جو وجہی کا معاصر ہے مگر غالباً اس نے مرثیے نہیں کہے - مغلیہ دور کا یہ دوسرا احمد دکنی ہے جس کے مرثیے مشہور ہیں -

شمالی ہند کے تذکرہ نویسوں نے احمد کے متعلق صحیح رائے قائم نہیں کی، میر حسن اور قائم احمد گجراتی بیان کرتے ہیں - عمدۂ منتخبہ اور عیار الشعراء میں اس کو غلام احمد علی کے نام کے ساتھ برہان پوری لکھتے ہیں - اسپرنگر نے بھی اسی احمد کا ذکر کیا ہے ممکن ہے ان دونوں احمدوں کا وجود بھی ہو مگر ہم جس احمد کے مرثیے پیش کرتے ہیں وہ ان دونوں سے جدا ہے اس کا نام یتیم احمد تھا - اور یتیمی تخلص کرتا تھا - برہان پور کا باشندہ ہے - غالباً یہاں ہی فوت ہوا -

اڈنبرہ کی بیاض میں اس کے سات مرثیے ہیں جن کے (۱۹۰) اشعار ہیں - مولوی صفی الدین والی بیاض میں اس کے تین مرثیے ہیں جن کے (۵۷) شعر ہیں - اڈنبرہ کے سات مرثیوں کے منجملہ دو مرثیے گو یا امام حسینؓ کی مدح میں قصیدے ہیں - دو مرثیوں میں آپ کے خاندان کی تکالیف بے سروسامانی حیرانی و پریشانی کا نقشہ کھینچا گیا ہے - ایک مرثیہ دونوں بیاضوں میں مشترک ہے اس طرح ہم کو یتیم احمد کے نو مرثیے دستیاب ہوئے ہیں جن کے (۲۰۵) شعر ہیں -

ذیل میں ایک پورا مرثیہ اور دیگر مرثیوں سے کچھ انتخاب پیش کیا جاتا ہے -

مرثیہ حضرت امام حسینؓ

حیف گھایل حسین تن تیرا　　جسم پر خوں ہے پیرہن تیرا
تو کہاں ہور کہد حضرتن تیرا　　کیوں لہیرا ہوا ہے من تیرا
نہیں ملیا بوند کس کہتن پانی
سخت طفلاں کی سر پو حیرانی
حیف اصغر نے مجکوں رو بانی
جگسوں پیاسا گیا تن تیرا

تیر لگ مکہ سون لہو جو اھی جی وا مصیبت میں بال پن تیرا
اے تون دلبر حسینؓ کے اصغرؓ آج رونا نہیں توں د ؟ ہٹ کر
تیر لگ حلق سب لہو سون بھر
کیوں چُھوپی بے رہا دھن تیرا

مندرجۂ بالا انتخاب سے معلوم ہوسکتا ہے کہ احمد ایک کہنہ مشق شاعر تھا اس کا کلام اگرچہ اس کے ہمعصر شعرا کی طرح صاف نہیں مگر غیر دلچسپ نہیں کہا جاسکتا۔

(۳) اشرف۔ سید اشرف اسی زمانے کا باکمال شاعر تھا۔ اس کی مثنوی اور مرثیے قابلیت کے یادگار ہیں۔

قائم اور شفیق نے اپنے تذکروں میں اس کا ذکر کیا ہے ولی کا ہمعصر بتاتے ہیں۔ اس کے برعکس خواجہ خان مصنف "گلشن گفتار" نے اس کو ولی کا شاگرد لکھا ہے۔ مگر ان سے اس کے حالات پر کچھ روشنی نہیں پڑتی۔ اس کی مثنوی بھی اس کے حالات واضح نہیں کرتی۔

مثنوی کی تصنیف ۱۱۲۵ھ میں ہوئی۔ اس کا نام جنگ نامہ ہے۔ برٹش میوزیم میں ایک نسخہ محفوظ ہے۔

اڈنبرہ میں اس کے تیرہ مرثیے ہیں جن کے (۱۴۰) شعر ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ کیجئے:۔

بانو کہیں اصغر نہیں اب میں جھلاؤں کس کے تئیں
سونا ہوا ہے پالنا اب میں سلاؤں کس کے تئیں
نہلا کے میں کپڑے پہنا اس کوں بناتی گُل نمن
وہ پھول سوکھا نیر بن اب میں بتاؤں کس کے تئیں
سوتا تھا وہ جب نیند بھر پینے او ٹھاتی دود کون
بیدم ہے دیکھو آج وہ اب میں جگاؤں کس کے تئیں
جب مسکراتا وہ بچا میں شاد ہوتی دل سنے
بے جان پڑا ہے گود میں اب میں ہنساؤں کس کے تئیں
جب شہ کو غمگیں دیکھتی لیجا کے دیتی گود میں
سوتا کفن وہ اوڑھ کر اب میں لیجاؤں کس کے تئیں
جاتے تھے شہ جب ان سنے اصغر کو میں چھاتی لگا
دکھ میں بھولاتی اس کہلا اب میں کہلاؤں کس کے تئیں

ان اشعار کے مطالعہ سے بخوبی واضح ہوسکتا ہے کہ اشرف کا کلام کسقدر صاف کس قدر پُر اثر کسقدر واقعات کی ترجمانی کرنے والا ہوتا تھا۔ اشرف نے نہ صرف فطرت نگاری کو عروج کمال پر پہنچایا۔ بلکہ ادبی حیثیت سے بھی اس کا کلام آپ اپنی نظیر ہے۔

(۴) امامی۔ یہ بھی اسی زمانے کا مرثیہ گو ہے۔ افسوس ہے کہ کسی تذکرہ سے اس کے حالات منکشف نہیں ہوتے۔ ہم کو نہیں معلوم اس کا نام کیا تھا؟ کہاں پیدا ہوا؟ کس کا شاگرد تھا؟

مرثیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیعہ مذہب کا پیرو تھا اور اس کا اعتقاد تھا کہ وہ حضرت امام حسینؓ اور آپ کے خاندان کا مداح اور پیرو ہے۔ اس طفیل میں اس کے سب گناہ معاف ہوجائیں گے۔

اس کے مرثیے ہم کو صرف اڈنبرہ کی بیاض میں دستیاب ہوئے ہیں۔ جن کی تعداد آٹھ ہے۔ ان کے دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ امامی کا اسلوب بیان دلکش ہے اس کے مرثیے ڈرامائی اثر رکھتے ہیں۔ اور پھر ان کی زبان اسقدر صاف ہے جس سے دھوکا ہوتا ہے۔ کہ وہ بہت بعد کے لکھے ہوئے ہیں۔

(۵) رضیؔ۔ حافظ رضی الدین اسی قدر کا زبردست مرثیہ گو تھا۔ خواجہ خان صاحب مصنف "گلشن گفتار" نے اس کو ولی کا شاگرد بتایا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا البتہ دونو ہمعصر تھے۔ اس کے سوا کسی دوسرے تذکرہ نویس نے رضی کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی۔

رضی کے مرثیوں کی دکن میں بڑی شہرت تھی اس کے مرثیوں کی تضمین کی جاتی تھیں۔ اڈنبرہ میں اس کے نو مرثیے ہیں جن کے (۸۷) شعر ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو ادبیت کی پروا نہ تھی بلکہ اس کا اصلی جوہر سوز و گداز اور مرثیہ پن ہے۔

چونکہ ان شعرا کے متعلق ہماری تحقیقات جاری ہے اس لئے ان کے متعلق مزید وضاحت کبھی آئندہ موقع پر کی جاسکتی ہے۔

(۶) ولی۔ ولی محمد کے متعلق اب بخوبی تحقیق ہوچکی ہے۔ ان کا اصلی نام ولی محمد اور وطن دکن تھا۔ انجمن ترقی اردو کے شائع شدہ کلیات کے سوا ان کا جو کلام یورپ میں دستیاب ہوا تھا وہ رسالہ معارف اعظم گڑھ کے ذریعے پیش کردیا گیا ہے۔

ولی کے دیوانوں میں کوئی مرثیہ یا سلام شامل نہیں ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے غالباً ولی نے اس صنف میں طبع آزمائی نہیں کی مگر تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ ولی نے مرثیے بھی لکھے ہیں۔ اڈنبرہ کی بیاض میں اس کے تین مرثیے ہیں۔ افسوس ہے ہم نے ان کو مکمل نقل نہیں کیا۔ چند شعر جو نوٹ کئے گئے پیش کئے

ہوئے مُردے نکالے اور جانچ کی تو دیکھا کہ اُن کے جسم کے بعض اندرونی اجزا اور کیسے ہنوز زندہ ہیں۔ اس انکشاف سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ انسان پر حقیقی موت فوراً طاری نہیں ہوتی۔ بلکہ قبر میں ایک مدت گڑے رہنے کے بعد اُس کی تکمیل ہوتی ہے۔

اکسیجن گیس کے حیرت انگیز خواص۔ پھر انسولین اور ادرینالین کے محیر العقول اثرات نے یہ بالکل ممکن ثابت کر دیا ہے کہ ایسے وسائل اور مرکبات ایجاد کئے جا سکتے ہیں جو قلب کو تھوڑی مدت تک زندہ رکھنے کے بجائے مدتوں زندہ رکھیں۔ اور اس طرح انسان کے لئے نہایت طویل زندگی ممکن بنا دیں۔

فنِ جراحت نے اب یورپین جنگِ عظیم کے بعد بہت زیادہ ترقی کر لی ہے اور ایسے عجیب تجربے کئے گئے ہیں کہ ناواقف یقین نہیں کر سکتا۔ دل جو ازحد نازک عضو ہے ایک جسم سے دوسرے جسم میں نہایت کامیابی سے منتقل کیا گیا ہے۔ اور اس کا عمل بدستور قائم رہا ہے! پھر پیرس میں پندرہ سال سے ایک دل۔ دواؤں میں رکھا ہُوا ہے۔ یہ اب تک زندہ ہے حرکت کرتا ہے۔ بڑھتا اور گھٹتا بھی ہے۔ ظاہر ہے ایسے تجربوں کے بعد ممکن ہو گیا ہے کہ انسانی جسم میں جو اعضا اور اجزا بوسیدہ ہو جائیں۔ انہیں بدل ڈالا جائے۔ اور اُن کی جگہ تندرست اعضا اور اجزا نصب کر دئے جائیں

اس سلسلے میں سب سے عجیب تجربہ امریکہ میں کیا گیا ہے۔ واشنگٹن کے طبی مدرسے میں مینڈک کے بچے سال ہا سال تک ایک ہی حالت پر رکھے گئے وہ اپنی زندگی بھر بچے ہی رہے۔ ہرگز کوئی نمو یا بڑھاؤ اُن کے جسم میں واقع نہ ہو سکا۔ یہ حیرت ناک نتیجہ اس طرح ظاہر ہُوا کہ اُن کے دماغ کے بعض اجزا دور کر دیئے گئے تھے۔ ان اجزا کے دور ہو جانے پر اُن مینڈکوں پر ہمیشہ عالمِ طفلی ہی طاری رہا!

اگر یہ عمل مینڈک پر کامیاب ہُوا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ بعض تبدیلیوں کے ساتھ انسان پر کامیاب نہ ہو۔ اگر ایسا ممکن ہُوا تو انسان کو بھی ہمیشہ ایک ہی جسمانی حالت پر رکھا جا سکے گا۔ یعنی وہ ہمیشہ جوان اور طاقتور رہیگا۔ اور اس طرح موت کے حملے سے بہت مدت تک محفوظ رہ سکیگا!

(فخر الدین محمود)

لطائفِ ادبیہ

۱۸۱۲ء میں جب نپولین کی فوجیں روس کے دارالحکومت ماسکو سے واپس جا چکی تھیں تو روس اور جرمنی کے شکست خوردہ حکمران بمقام برلیسلاؤ باہم ملاقی ہوئے۔ ولیم ثالث شاہ جرمنی نے جب اپنی مملکت کی تباہی کا ذکر کیا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اس پر سکندر شاہ روس نے اس سے کہا "بھائی جان! ہمت سے کام لیجئے، آج کے بعد نپولین کو یہ موقعہ نصیب نہ ہوگا کہ وہ تمہیں دوبارہ خون کے آنسو رلائے" زارِ روس کی یہ پیشگوئی حرف بحرف صادق نکلی۔ دوسرے ہی سال سے نپولین کے خلاف جنگِ آزادی کا اعلان ہو گیا۔ اور جیسا کہ تاریخ دان حضرات کو معلوم ہے ۱۸۱۵ء میں نپولین کی ترکی تمام ہو گئی۔

جب افسروں نے اینٹی گانس کو، ایتھنز میں چھاونی قائم کرنے کا مشورہ دیا تاکہ وہاں کے لوگ بغاوت نہ کر سکیں۔ تو اس نے جواب دیا کہ میں شہر میں چھاونی قائم کرنے کے بجائے باشندوں کے دلوں میں محبت قائم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر کوئی قلعہ نہیں ہو سکتا۔

ایک خوشامدی نے اس سے کہا "حضور! بادشاہوں کی مرضی کے مطابق، عدل و انصاف کے اصول مدون ہوتے ہیں۔ اس نے کہا "تم غلط کہتے ہو، آئینِ عدل و انصاف کے مطابق بادشاہوں کی مرضی ہونی لازمی ہے ورنہ وہ مرضی، ظلم و ستم کا دوسرا نام ہے"۔

نپولین کی بربادی

اور موت کا حقیقی سبب

نپولین بوناپارٹ کی وفات کو سو برس سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ لیکن اب تک اُس کی عظمت کا آفتاب غروب نہیں ہوا۔ آج بھی وہی دنیا کا سب سے بڑا سپہ سالار اور سب سے زیادہ حیرت انگیز شہرت کا مالک تسلیم کیا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ پچھلی عالمگیر جنگ کے ہولناک معرکے بھی، جن کی نظیر انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے، اِس بے نظیر فاتح کے معرکوں کی شہرت کو ماند نہیں کر سکے۔ فرانسیسی بلکہ خود انگریزی انسائیکلو پیڈیا نے تسلیم کر لیا ہے کہ کسی انسان کے بارے میں مورخین نے اتنا نہیں لکھا جتنا بوناپارٹ کے بارے میں لکھا ہے لیکن شاید ہی کوئی سال ایسا گزرتا ہے جس میں کوئی نہ کوئی نئی کتاب یا نئی دستاویز اُس کی زندگی کے متعلق شائع نہیں ہوتی رہتی۔ گزشتہ سال کی بعض اہم کتابوں اور دستاویزوں سے ہم ذیل کی معلومات اخذ کرتے ہیں:-

عام طور پر یہی مشہور ہے کہ نپولین کی وفات، مرضِ سرطان سے واقع ہوئی۔ لیکن اب یہ غلط تسلیم کر لینا چاہئیے۔ آسٹریا کے خاندان ہابسرگ کی شہنشاہی کے خاتمہ پر موجودہ آسٹرین جمہوریت نے وہ سرکاری دستاویز شائع کر دی جو شہنشاہ فرانسس جوزیف کے خاص صندوق میں چھپی رکھی تھی۔ یہ دستاویز بیرن سٹورمر کے قلم سے لکھی ہوئی ہے جو جزیرۂ سینٹ ہیلانہ میں آسٹریا کا سرکاری نمائندہ تھا اور نپولین کی خفیہ نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔ یہ شخص، نپولین کی موت کا سبب یہ قرار دیتا ہے کہ "وہ ایک ایسے زہر سے مرا ہے جس نے بہت آہستہ آہستہ اثر کیا تھا"

اِس راز کے انکشاف نے انگلستان کے سیاسی اور طبّی حلقوں میں ایک ہلچل ڈال دی۔ کیونکہ شہنشاہ، انگلستان کے ہاتھ میں قید تھا۔ اور وہی اُس کی زندگی کا محافظ تھا اگر شہنشاہ زہر سے فوت ہوا ہے جیسا کہ یہ دستاویز صاف لفظوں میں کہہ رہی ہے۔ تو ظاہر ہے انگلستان کی پوزیشن بہت مشتبہ ہو جاتی۔

خوش قسمتی سے نپولین کی چند آنتیں، انگلستان کے عجائب خانے میں محفوظ ہیں۔ فی الحال اُن کی غیر جانبدارانہ تحقیق و معائنہ ناممکن ہے۔ اِس لئے انگریز ڈاکٹروں کی تحقیقات پر پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اُنہوں نے مذکورۂ بالا دستاویز کے شائع ہوتے ہی آنتوں کی جانچ کی جس کا خلاصہ لارڈ موین ہان نے اپنی ایک تقریر میں اس طرح بیان کیا ہے:-

"ہم نے نپولین کی آنتیں پوری ایمانداری کے ساتھ معائنہ کیں۔ ہمیں اُن میں جا بجا اُبھار یا ورم نظر آئے۔ خیال تھا کہ یہ ورم سرطان کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن سر آرتھر کیتھ نے ناقابلِ تردید دلیلوں سے ثابت کر دیا کہ یہ سرطانی ورم نہیں ہیں۔ بلکہ اُس مہلک بخار کا نتیجہ ہیں، جو "مالٹا بخار" کہلاتا ہے۔"

بہرحال اِس تصریح سے بھی مذکورۂ بالا دستاویز کی ایک حد تک تصدیق ہوتی ہے کہ شہنشاہ کی موت، زہر ہی سے واقع ہوئی ہے، اگرچہ وہ زہر کسی بخار ہی کا کیوں نہ ہو۔

ممکن ہے بعض قارئین اِس بحث کو غیر ضروری سمجھیں کہ نپولین کی زندگی کا خاتمہ کسی زہر سے ہوا جو اُسے دشمنوں نے کھلا دیا تھا یا کسی بخار سے! لیکن اُن کا یہ خیال صحیح نہیں۔ کیونکہ اوّل تو اِس شخص کی موت بجائے خود ایک مہتم بالشان تاریخی حادثہ ہے۔ پھر اِس بحث سے واٹرلو میں اُس کی بربادی پر روشنی پڑتی ہے۔ واٹرلو کا معرکہ تقریباً تاریخِ انسانی کا سب سے زیادہ اہم واقعہ ہے۔ اگر اس معرکے میں نپولین کو فتح ہو گئی ہوتی تو آج دنیا کا یہ نقشہ نہ ہوتا۔ نہ ہندوستان، برطانیہ کے ہاتھ میں ہوتا نہ انگریز روئے زمین پر سب سے زیادہ طاقتور قوم ہوتے۔

اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ واٹرلو کی جنگ میں شہنشاہ کا دماغ اور جسم اتنی حیرت انگیز تیزی سے کام نہیں کرتا تھا جو ہمیشہ اُسے تمام لوگوں میں ممتاز بنائے ہوئے تھی۔ اُس کی یہی کمزوری اُس کی شکست اور بربادی کا حقیقی سبب ہوئی۔ جیسا کہ اُس کے دوست بھی اور اُس

کے ایک مقرب ایڈیکانگ کے روزنامچوں سے ثابت ہوتا ہے جو گزشتہ سال شائع ہو گئے ہیں۔

اوّل الذکر مصنف اور بعض دوسری شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ کے قویٰ میں فتور اُس وقت آیا جب وہ جزیرۂ البا میں جلا وطن تھا۔ (مئی ۱۸۱۴ء سے مارچ ۱۸۱۵ء تک) ہوسے لکھتا ہے۔

"شہنشاہ کی واپسی پر ہم نے اُسے بیحد کمزور پایا۔ اب وہ زیادہ محنت نہیں کر سکتا تھا۔ اگرچہ واٹرلو کی جنگ کے لئے اُس نے فوجیں تو آراستہ کر لی تھیں۔ مگر اُس کے تمام سپہ سالار اپنی آنکھ سے دیکھ رہے تھے کہ وہ خود اپنی قوت سے تقریباً محروم ہو چکا ہے شہنشاہ کو فتح، فوجوں سے نہیں۔ بلکہ — اپنی شخصیت اور ذاتی قوت سے حاصل ہوا کرتی تھی۔"

اُس کا محافظ خاص اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے:۔

"واٹرلو کی جنگ میں شروع سے آخر تک میں ہر وقت شہنشاہ کے ساتھ رہا۔ وہ بہت زیادہ کمزور نظر آتا تھا۔ گھوڑے پر بیٹھتا تھا تو ذراسی دیر میں تھک جاتا تھا۔ مجبوراً پیدل ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ وہ تھک کر کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور فوجیں اُس کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ اور اُس کی سلامتی و اقبال کے نعرے بلند کرتی تھیں اُس وقت اُس کی نگاہوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بالکل مدہوش ہے اور کچھ بھی سن نہیں رہا ہے۔ پوری جنگ میں وہ چند ہی مرتبہ گھوڑے پر سوار ہو سکا۔ زیادہ تر کرسی پر بیٹھا رہتا تھا۔ ہم سب کو یقین تھا کہ وہ کسی سخت بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے۔ شکست کے بعد اُسے گھوڑے پر سوار ہونا پڑا۔ وہ بڑی تیزی سے پیرس کی طرف روانہ ہوا۔ میں بھی ساتھ تھا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد اُس پر نیند کا غلبہ ہو گیا۔ اگر میں بار بار سہارا نہ دیتا رہتا تو وہ ضرور گھوڑے سے گر جاتا۔"

اِن تصریحوں سے ثابت ہوتا ہے کہ نپولین کو جزیرۂ البا ہی میں مرض لاحق ہوا تھا۔ اگر اُسے وہاں دشمنوں نے زہر نہیں دیا تھا، تو وہ مالٹا کا زہریلا بخار ہوگا جس نے بالآخر سینٹ ہیلانہ میں اُس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔

عبدالرزاق ملیح آبادی

اشعار

آپ نے میری دلنوازی کی وہ کیا جو کوئی حسیں نہ کرے
مر کے آسودگی ملے مجھ کو آسماں کی طرح زمیں نہ کرے
تلخیٔ زہرِ غم کا لذت کش
ہوں لطفِ انگبیں نہ کرے

احسن الکلام

کیا عشق کے نیک انجام ہوئے کیا رازِ نہ طشت از بام ہوئے
یہ کام ہوا ناکام ہوئے یہ نام ہوا بدنام ہوئے

وعدۂ فردا کرتے ہیں وصل آج انہیں منظور نہیں
اچھا پھر ہم صبر کریں گے کل بھی کچھ ایسی دور نہیں

تم نے چھپ کر شوقِ دل میرا نمایاں کر دیا
اپنی رسوائی کا پیدا آپ ساماں کر دیا

پوچھتے کیا ہیں وہ کیوں کر ترے قابو میں رہیں
میرے دل میں رہیں آ کر مرے پہلو میں رہیں

ملا جو آشنا ہم کو وہ مطلب آشنا ہو کر
خیالِ یار بھی آیا تو آیا دل ربا ہو کر

زندہ دل رہنے کی خاطر یہ خیال اچھا ہے
تیری الفت میں برا بھی ہے تو حال اچھا ہے

آج تک کوئی نہ پرساں تھا نہ کچھ میں نے کہا
تم نے پوچھا ہے تو کہتا ہوں کہ حال اچھا ہے

نگاہوں کے اشاروں سے ادا کوئی بیاں کیوں ہو
دہن ہوتے ہوئے بے وجہ آنکھوں میں زباں کیوں ہو

تجھے ڈھونڈیں گے ہم باہر نہ گھر میں
جو آنکھیں ہیں تو سب کچھ ہے نظر میں

تری حسرت لئے پھرتی ہے دل کو
مکیں کے ساتھ ہے گھر بھی سفر میں

نہیں خورشید افق پر جلوہ آرا
یہ تکمہ ہے گریبانِ سحر میں

نہ دیکھا عمر سا کوئی مسافر
کہیں منزل نہیں جس کے سفر میں

گھٹ کر نہ طبیعت مری صیاد رہے گی
میں قید رہوں گا تو وہ آزاد رہے گی

اب میں ہوں جو دنیا میں تو پرساں نہیں کوئی
جب میں نہ رہوں گا تو مری یاد رہے گی

سنگِ در بن کر بھی کیا حسرت مرے دل میں نہیں
تیرے قدموں میں ہوں لیکن تیری محفل میں نہیں

نگاہِ شوخ کے تیر اور کدھر جاتے ہیں
دیکھتے دیکھتے وہ دل میں اتر جاتے ہیں

زہر کیوں ڈھونڈتے ہیں جان کے لینے والے
مرنے والے تو فقط بات پہ مر جاتے ہیں

کششِ رہگزرِ یار کچھ ایسی ہے کہ ہم
ٹھوکریں کھاتے ہیں مرتے ہیں مگر جاتے ہیں

کہہ گئے یہ کھچکے وہ تصویر سے
تیری چپ اچھی مری تقریر سے

ہے حقیقت رس مجازی دسترس
تجھ کو پہچانا تری تصویر سے

دیکھنا احسن یہ اعجازِ سخن
شاعری زندہ ہے نام میر سے

(احسن مارہروی)

فلسفۂ اشراق

(گذشتہ سے پیوستہ)

خلقِ عالم کی مشکل کو مذہب اور اشراقیت دونوں نے مختلف طور سے حل کیا ہے :-

مذہب کہتا ہے کہ خدا نے اس کائنات کو اپنے ارادہ کے زور سے پیدا کیا - خدا چونکہ قادرِ مطلق ہے اس لئے وہ نیست سے ہست کر سکتا ہے اُس کو ہر بات پر دسترس حاصل ہے - فلسفہ کہتا ہے کہ یہ کائنات خدا سے بلحاظِ ذات تو جُدا نہیں لیکن بلحاظِ فعل جدا ہے یعنی اس کے ارادہ کا ظہور ہے - اور کائنات، خدا کا عین ہے لیکن خدا کائنات کا عین نہیں - اگر خدا بھی عینِ کائنات ہو تو وحدتِ وجود ثابت ہوگئی لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ فرق ہے - وہ یہ کہ کائنات تو عینِ خدا ہے لیکن خدا عینِ کائنات نہیں ہے -

فلاطینس نے منطق کی بدولت "ہستی" کی بنیاد قائم کرنے کے لئے، وحدت کی ضرورت اور اہمیت کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا، اور یہ بھی کہ "وحدت" تنہا نہیں قائم رہ سکتی - اگر رہ سکتی تو کثرت کا وجود نہ ہوتا، اور اگر کثرت، وحدت پر دلالت کرتی ہے۔ تو اِس قانون کی بدولت جس سے خدا بھی مستثنیٰ نہیں ہے، تمام ہستی مع اپنے مظاہرِ مختلفہ کے، ایک سلک میں منسلک نظر آتی ہے -

اگر یہ سوال ہو کہ وحدت، کثرت میں کس طرح تبدیل ہو سکتی ہے۔ یعنی خدا کو کیا پڑی تھی کہ کائنات کو ظاہر کرے ؟ تو اِس کا جواب یہ ہے کہ "وحدتِ محض" ایک امرِ ناقص ہے، کیونکہ جس خدا میں سوائے وحدت کے عقل اور رُوح نہ ہو وہ کامل نہیں کہلا سکتا اور کمال وہ صفت ہے جو خدا کے لئے شرطِ اوّلین ہے - "ناقص خدا" تو اجتماعِ ضدین ہے - پس خدا اگر مدرک ہے تو لامحالہ موثر بھی ہوگا اگر وہ فاعل اور موثر ہے تو فعل اور تاثیر کا ثبوت بھی ہونا چاہیئے ورنہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ ایک ہستی مؤثر تو ہو لیکن تاثیر کا وجود کہیں نہ ہو؟ آخر کس طرح سمجھا جائے کہ خدا مؤثر ہے ؟ پس خدا کی ذات ہی کا وجود مدرک فاعل اور موثر ہے، یہ تقاضا ہے کہ وہ دنیا کو پیدا کرے۔

اور ظاہر ہے کہ کوئی وجود، اپنے مقتضیاتِ وجود سے بے نیاز نہیں ہو سکتا - فلاطینس کے الفاظ یہ ہیں :-

(ἐν τῇ φύσει, ἢ τὸ ποιεῖν)

یعنی "پیدا کرنے کی صفت، اُس کی ذات میں داخل ہے" اور یہ ظاہر ہے کہ جو بات، ذاتی ہے وہ ذات سے جُدا نہیں ہو سکتی مثلاً ہنسنا انسان کی ذات کا تقاضا ہے، ڈنک مارنا بچھو کی فطرت میں داخل ہے - لامحالہ انسان ہنسیگا اور بچھو ڈنک ماریگا - پس خدا بھی اپنی فطرت کے اعتبار سے خالق (ποιητής) ہے - وہ مثل آفتاب کے ہے جس سے شعاعیں ضرور ہی نکلیں گی - اور جس طرح شعاعیں نکلنے ..... کے باوجود، آفتاب میں کسی قسم کا نقصان واقع نہیں ہوتا - (یعنی ضیا رپاشی سے اُس کی ذات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی -) اُسی طرح خدا بھی ہر دم تخلیق کرتا ہے اور اُس کی قوت یا خدائی میں کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا - خدا ہی باقی اور ابدی ہے - جملہ مظاہرِ کائنات آنی اور فانی ہیں - صرف اُسی کی ذات باقی رہ جائے گی کائنات سب ایک دن فنا ہو جائیگی - یعنی قطرات، سمندر میں مل جائیں گے۔

جب یہ حالت ہے، تو احمق ہے وہ انسان جو موت سے ڈرتا ہے - موت وہ شے ہے جو عاشق کو معشوق سے ملاتی ہے۔ اور اُس کے بعد ابدی راحت نصیب ہوتی ہے - مرنے کے بعد کیا ہوگا اور حیات بعد الممات کی نوعیت کیا ہوگی ؟ اس کا خفیف سا نظارہ، وجدانی حالت میں نظر آجاتا ہے جو کبھی کبھی انسان پر طاری ہوتی ہے اور اس حالت میں انسان، خدا سے واصل ہو جاتا ہے کہ وہ بحرِ وحدت ہی کا ایک قطرہ ہے جو اُس سے عارضی طور پر جدا ہو گیا ہے علاوہ یہ کہ انسان کی اصل بھی "آسمانی" اور روحانی ہی ہے نہ کہ ملوی اور دنیاوی - رُوحِ انسانی ایک لطیفۂ ربانی ہے جو عارضی طور پر اِس فانی جسم میں مقید ہوگئی ہے - جس وقت یہ "بندھن" ٹوٹا اور روح و جسم کا ناتا ٹوٹا، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائیگا - مٹی (جسم) مٹی (زمین) میں مل جائیگی اور روح، خدا سے واصل ہو جائیگی -

فلاطینس سے مرتے وقت اُس کے دوستوں نے پوچھا کہ "سکراتِ موت" ہو رہی ہے یا نہیں؟ اس نے کہا "ہاں ہو رہی ہے کیونکہ میں کوشش کر رہا ہوں کہ جسم اور رُوح کا علاقہ ٹوٹ جائے (اور اسی کا نام (agony.) یا سکرات ہے) یعنی میں اپنی الوہیت کو جسم کی قید سے آزاد کر رہا ہوں۔" اسی لئے صوفیا نے "مُوتوا قبل ان تموتوا" پر عمل کیا۔

پراقلس

فلاطینس نے فلسفہ کو مذہب سے متحد کرنے اور جو مسائل بذریعہ عقل حل نہ ہو سکتے تھے ان کو "ایمان" کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کی، جس کا نتیجہ "تصوف" کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور اُس کے جانشین، فلسفہ سے دور ہو کر محض "تصوف" کی اشاعت کرنے لگے چنانچہ ایمبلیقوس اور پراقلس دونوں معجزات اور کرامات کے لئے مشہور ہیں۔ آخر الذکر ۴۱۲ء میں بمقام قسطنطنیہ پیدا ہوا تھا۔ نوجوانی میں ترکِ وطن کر کے سکندریہ میں سکونت پذیر ہو گیا۔ افلاطون، ارسطو اور فلاطینس کی تصانیف کو حرزِ جاں بنا کر اشراقیین کا سرگروہ ہو گیا۔ اُس کے فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان عقل سے بالاتر ہے۔ کیونکہ خدا کی معرفت اور اس کی ذات کا عرفان عقل کی بدولت نہیں بلکہ ایمان کی مدد سے حاصل ہو سکتا ہے۔ فیلسوف وہ ہے جو اپنے خیالات اور نصائح سے جملہ مذاہب کو روشنی اور تسکین دے سکے۔ عقل کا منصب یہ ہے کہ ایمانیات کی تشریح کرے وہ بطور خود کوئی بات تلقین کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ وہ ناقص ہے اِس لئے اُس کی تعلیم بھی ناقص ہی ہوگی، اور جب وہ خود، خدا کو نہیں سمجھ سکتی تو دوسرے کو کیا سمجھا سکتی ہے؟ فلسفے کو مذہب کا خادم قرار دیتے ہیں، پراقلس نے محض تقلیدِ سلف کی ہے خود اپنی طرف سے نہ کوئی بات دریافت کی نہ کوئی فلسفہ مدوّن کیا۔ وہ ارسطو کو حکیم یا فیلسوف اور اک قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اُسکی تصانیف، تحصیلِ حکمت کے لئے ضروری ہیں۔ ارسطو کے بعد افلاطون کی تصانیف کا مطالعہ کرنا چاہئے کیونکہ افلاطون فیلسوفِ عقل ہے اور جب تک ارسطو کی تصانیف پڑھ کر کوئی شخص اپنے قوائے ذہنی کا انجلاء کرے۔ اس وقت تک وہ افلاطون کی تصانیف سے مستفید نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے آپ کو "خاتم الاولیا" کہا کرتا تھا یعنی میرے بعد کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو رموز و اسرارِ تصوف سے واقف ہوگا۔ اُس نے افلاطون اور فلاطینس کی تصانیف پر مبسوط شروح اور تفاسیر لکھی ہیں۔ اور مثل اپنے استادوں کے، مسیحیت کا بڑی کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ فلاطینس، فرفریوس، ایمبلیقوس اور پراقلس سب نے مسیحیت پر یہی الزام لگایا کہ اُس کی الٰہیات تمام تر فلسفۂ اشراق پر مبنی ہے اور اس کے رسوم قدیم مشرکین کے مذاہب سے ماخوذ ہیں۔ فرفریوس سے بڑھکر، قدیم زمانہ میں مسیحیت کا مقابلہ کرنے والا یا اس کی قلعی کھولنے والا، دوسرا شخص پیدا نہیں ہوا۔ افسوس یہ ہے کہ بخوفِ طوالت اس داستاں کو سپردِ قلم نہیں کر سکتا۔

پراقلس نے ۴۶۵ء میں وفات پائی، اُس کی وفات کے بعد اس کے شاگردوں نے اُسے مثل ایک "ولی اللہ" کے قرار دیا۔ اور مدتوں تک اس کے معجزات اور کرامات زبان زدِ خلائق رہے۔ جواں مرگ ہائی پیشیا جو سرل اُسقف سکندریہ کے ظلم کا شکار ہوئی اسی پراقلس کی شاگرد تھی۔ پراقلس کے سب سے زیادہ قابل شاگرد میرینس نے سکندریہ کو چھوڑ کر ایتھنز کو دوبارہ آباد کیا اور وہیں فلسفہ کے بھولے ہوئے سبق کو از سر نو تازہ کیا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مسیحیت کے مرکز سے قریب رہنا چاہتا تھا تاکہ اس مذہب سے براہ راست واقفیت حاصل کرتا رہے۔ مسیحیوں سے اس جماعت کا مقابلہ نہ ہو سکا۔ اس لئے مجبور ہو کر جسٹینین قیصر قسطنطنیہ کی خوشامد کی کہ مسیحیت کو بچائیے۔ اس نے ان پادریوں کے سمجھانے کے مطابق ۵۲۹ء میں ایک حکم نافذ کیا۔ کہ کوئی غیر مسیحی شخص، فلسفے کا درس نہیں دے سکتا۔ یہ عجیب بات مسیحیت کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔

پروفیسر یوسف سلیم

پرستارِ نغمہ

ترے نغموں کی اقلیمِ اثر پر حکمرانی ہے
تجھے حاصل زمانے میں حیاتِ جاودانی ہے

برستا ہے سرورِ زندگی تیرے ترانوں سے
لرز جاتا ہے دل فطرت کا موسیقی کی تانوں سے

ترے اعجاز سے وحشی و رندے رام ہوتے ہیں
ترے دلدوز نغموں سے پرندے رام ہوتے ہیں

نشاط انگیز ہیں انسان کی آبادیاں تجھ سے
لطافت ریز ہیں عشرت کی رنگیں وادیاں تجھ سے

ترے نغموں سے پیدا سازو سامانِ جوانی ہے
ترے دامن میں خوابیدہ طلسمِ شادمانی ہے

مرا سرمایۂ ایماں ہے تیری معجزہ کاری
یہاں تک کھینچ لایا ہے مرا شوقِ پرستاری

ترے دربار میں آئی ہوں میں تیری پجارن ہوں
اثر دے میرے نغموں کو تری بیکس بھکارن ہوں

مجھے حاصل ہو اطمینانِ دل نغمہ سرائی سے
زمانہ رام ہو جائے مری رنگیں نوائی سے

زمیں مسحور ہو جائے مرے دلکش ترانوں سے
فلک تسخیر ہو جائے مرے نغموں کی تانوں سے

اثر بھر دیں مرے نغمے فضائے آسمانی میں
بپا ہو جائے اک طوفاں طرب زارِ جوانی میں

وقار انبالوی

"آوازِ غیب"

میں سیلون گورنمنٹ کے محکمۂ آثارِ قدیمہ میں مزدوروں کے جمعدار کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ ایک دفعہ مجھے ایک سَو مزدوروں کی معیت میں نئے معلوم شدہ کھنڈروں کی کھدائی کے کام پر مامور کیا گیا۔ یہ کھنڈر سیلون کے وسط میں ایک پہاڑی پر گھنے اور تاریک جنگل میں واقع تھے۔ جو میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ چونکہ اس جنگل کے قرب و جوار میں کوئی بستی نہ تھی اس لئے ہم مجبوراً اُنہی کھنڈروں کے ایک طرف خیمہ زن ہو گئے۔ یہ کھنڈر تقریباً چار پانچ میل تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور بدھ کے عہد کی فراموش شدہ تہذیب کی یادگار تھے۔ اس جگہ کا منظر نہایت ہی جانفزا اور دلکش تھا۔ ایک پہاڑی ندی سنسان پہاڑیوں کے نیچے جنگلوں کے پتھریلے رستوں سے شور مچاتی اور سنگریزوں کو بہاتی اس طرح مستانہ وار چلتی تھی جیسے کوئی طرارِ رقاصہ سبک خرامی کر رہی ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہم سے پہلے بھی یہاں کھدائی کا کام شروع کیا گیا تھا۔ مگر اُسے اُدھورا ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ کھنڈروں کا کچھ حصہ صاف تھا۔ پتھر کی مورتیاں اور چند ٹوٹے پھوٹے برتن اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے جو ہمارے اس قیاس کو یقین کے درجہ تک پہنچاتے تھے۔ یہ کھنڈر زیادہ تر مندروں اور معابد سے بھرے پڑے تھے جو تمام کے تمام مہاتما بدھ کے پوتر نام سے منسوب تھے۔ اس جگہ کی عمارات۔ مندر اور معابد قدیم اور گمشدہ فنونِ لطیفہ مثلاً فنِ تعمیر سنگ تراشی اور نقاشی کے درخشاں اور شاندار نمونے تھے۔ ہر روز کی کھدائی سے نئی نئی عمارتیں۔ عجائب روزگار اشیاء۔ تاریخی قطعات وغیرہ برآمد ہوتے تھے۔ اور زمانۂ قدیم کے پُراسرار چہرے سے پردہ اٹھا کر قدیم زمانہ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتے تھے۔ جب میں اُن برآمد شدہ اشیاء کو دیکھتا تو زمانۂ قدیم کی تہذیب کی جامعیت سے حیران رہ جاتا۔ اُن برآمد شدہ اشیاء سے ثابت ہوتا تھا کہ بدھ کے زمانہ میں ہندوستان فنونِ لطیفہ کا صحیح معنوں میں گہوارہ تھا یہی نہیں بلکہ جو سیاح ممالک غیر خصوصاً چین سے ہندوستان کے دارالعلوم اور غاروں کے مندر وغیرہ دیکھنے آتے تھے وہ ہندوستانی فنون سے بے انتہا متاثر ہوتے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چین کے طرزِ تعمیر اور فنِ سنگ تراشی میں بھی انقلابِ عظیم رُونما ہوا۔ تاریخ کے صفحات ان واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔ کہ بدھ مذہب کے قدیم مدارس اور مذہبی خانقاہوں کے دالان فنِ مصوری کے بہترین نمونے تھے مگر گردشِ روزگار اور حوادثِ زمانہ نے اُس تہذیب کو بھی جو زمانۂ حال کی تہذیب سے بدرجہا مکمل اور شاندار تھی تباہ و برباد کر دیا اور ہندوستان کی قدیم اور بے مثل صناعی کا نام و نشان مٹ گیا اگر اب بھی کچھ آثار باقی ہیں تو وہ دُور دراز اور دُور افتادہ حصّوں اور گوشوں میں جن کی قدر اہلِ ہند کے دلوں میں اب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اُن کو بے کار کھنڈر کہکر اُن کی جانب سے پشت پھیر لی جاتی ہے۔ ایجنٹا کے منہدم آثار ایلیفینٹا کے غار۔ امراؤتی کے پُرہیبت کھنڈر اہلِ بدھ کی یاد میں سراپا غم و الم بنے ہوئے ہیں۔

ایک روز سرِ شام جب ڈوبتے سورج کی آخری زرد کرنیں اس ویران و سنسان جگہ کو زیادہ پُرہیبت بنا رہی تھیں مزدور کام ختم کر کے کدالوں اور پھاوڑوں کو اٹھائے دن بھر کی محنت سے تھک کر آہستہ آہستہ اپنے اپنے خیموں کی طرف جا رہے تھے۔ میں پھرتا پھرتا ایک مندر میں چلا گیا۔ یہ مندر ندی کے کنارے واقع تھا۔ اس کی دیواریں گری ہوئی تھیں اس کے کونوں میں مکڑی نے جالا تن رکھا تھا۔ مہاتما بدھ کی ایک مورتی ایک طرف رکھی ہوئی تھی میں کھڑا اس مورتی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ کہ مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ یہ مندر ایک زندہ جسم ہے جو ایک ایسی متحرک زندگی سے معمور ہے جو آنکھ سے اوجھل ہے میں بدھ پجاریوں کو ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے چلتے پھرتے دیکھ رہا تھا میرا دل اچھلنے لگا اگرچہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے غیر معمولی احساس کا باعث خوف تھا یا مسرت تھی یا حیرت تھی میں ہمہ تن گوش تھا کہ ان کی باتوں کو سنوں لیکن ہزارہا سال کا تاریک پردہ میرے اور اُن کے درمیان حائل تھا اور مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اس پردے کو ہٹا سکوں۔ دفعتہً ہوا کے ایک تیز جھونکے نے ندی کی موجوں کو کسی مہ جبیں کی عنبر بار اور بکھری ہوئی زلفوں کی طرح جنبش دیکر اور جنگل کے درختوں کی شاخوں میں سرسراہٹ پیدا کر کے مجھے اس خوابِ محویت سے بیدار کر دیا۔ میں نے وہاں سے چلنے کا ارادہ کیا تاکہ اس سنسان جگہ کو چھوڑ کر اپنے ہمراہیوں کے پاس چلا جاؤں۔ مگر جونہی میں مڑا ایک بلند قامت انسان میرے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ایک خوبصورت جوان تھا جو راہبوں کا سا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے تھا۔ اس کے سر پر لمبے لمبے گھونگر والے بال تھے۔ اس کی خوشنما آنکھیں چمک رہی تھیں اور اس کی

ڈاڑھی لمبی تھی۔ میں اُسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ خوف کی وجہ سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ اُن مردہ راہبوں میں سے کسی ایک کی روح ہوگی جو اس جگہ رہا کرتے تھے۔ میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ اُس کے ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی اور وہ یوں گویا ہوا: "کیا جناب مہاتما بدھ کی پوتر مورتی کی پوجا کر رہے ہیں؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "تم... کون ہو؟" میری آواز خوف و ہراس کی وجہ سے بھرائی ہوئی تھی۔ راہب نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ خوف زدہ نہ ہوں میں ایک غریب بدھ راہب ہوں اور اُس سامنے والے غار میں رہتا ہوں" ان الفاظ سے میری جان میں جان آئی۔ میرے ہوش و حواس درست ہوئے۔ میں اُس کی شخصیت کا ابھی جائزہ لے رہا تھا کہ یکایک میری نظر دو جڑاؤ انگشتریوں پر پڑی۔ جنہیں وہ اپنے بائیں ہاتھ کی اُنگلیوں میں پہنے تھا۔ یہ دونوں انگشتریاں ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی تھیں۔ اگر کچھ فرق تھا تو صرف یہ کہ ایک دوسری کی بہ نسبت کسی قدر چھوٹی تھی۔ ان میں دو ایسے بیش قیمت ہیرے جڑے ہوئے تھے جن کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ ایسے چمکیلے اور خوبصورت ہیرے پہلے کبھی میری نظر سے نہیں گذرے۔ ڈوبتے سورج کی آخری زرد کرنیں جب ان پر پڑتی تھیں تو یہ آگ کے ایک تیز شعلہ کی طرح چمکنے لگتے۔ میری آنکھیں ابھی تک اُن عجیب و غریب ہیروں کو بغور دیکھ رہی تھیں کہ بدھ راہب بولا "جناب یہ انگشتریاں واقعی عجیب ہیں۔ یہ ایک پرانی تہذیب کی یادگار ہیں اور ان کی کہانی بھی حیرت انگیز ہے"۔ میں نے بدھ راہب کی طرف تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا: "کیا جناب مجھے آپ وہ کہانی سنا سکتے ہیں؟" "اگر جناب میرے غار میں چلنے کی تکلیف گوارا فرمائیں تو بیشک میں وہ حیرت انگیز کہانی سنا سکتا ہوں جس نے ایک راجہ کو یہ سنسار تیاگ دینے پر مجبور کیا۔" بدھ راہب نے جواب دیا۔ میں چلنے پر رضامند ہوگیا۔ بدھ راہب میرے آگے آگے چلنے لگا اور ہم دو۔ ایک منٹ میں ایک پرانے غار کے سامنے آ پہنچے۔ مجھے راہب نے ایک پتھر پر بیٹھنے کے لیے کہا اور خود غار کے اندر چلا گیا۔ ندی غار سے دو چار قدم کے فاصلہ پر اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی بہہ رہی تھی سورج پردہ مغرب میں روپوش ہو چکا تھا چودھویں کا چاند اُفقِ مشرق سے نمودار ہو رہا تھا۔ اس کی نورانی کرنیں گھنے درختوں کے پتوں میں سے چھن چھن کر موجوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ یہ غار پہاڑیوں کے سروں پر واقع تھا جو گھنے درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور جن میں بے شمار وحشی پرندوں نے اپنے مسکن بنا رکھے تھے۔ راہب غار سے باہر آیا اور میرے ساتھ والے پتھر پر بیٹھ گیا اور اپنی کہانی شروع کی: "میں ایک مہاراجکمار تھا ۔۔۔ رتن پور کا راجکمار" میں حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگا اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ حیران و ششدر کیوں ہو گئے جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا حرف حرف سچ ہے میرا چھوٹا بھائی کرشن اس وقت ریاست کا راجہ ہے کبھی میں بھی اُس ریاست کا مالک تھا لیکن مہاتما بدھ کی کرپا سے اس فانی زندگی کے بھید مجھ پر کھُل گئے میری طبیعت اس پاپی اور اشانتیوں سے بھری ہوئی سنسار سے بیزار ہو گئی۔ میں نے انگلستان ہی میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اور مجھے وہاں سے آتے ہوئے صرف دو مہینے کا عرصہ ہوا ہے۔ میں اپنی ریاست میں جانے سے پیشتر تمام ہندوستان کا دورہ کرنا چاہتا تھا۔

میں جہاز سے بمبئی اترا اور وہاں سے سیدھا بنارس پہنچا یہ رشی مُنیوں کا شہر جو ویدک دھرم کا مرکز تھا اصلی معنوں میں ہندوستانی شہر ہے یہی وہ شہر ہے جس پر مغربی تہذیب کامیاب طور سے اثر پذیر نہیں ہو سکی۔ دو تین دن تک تو میں شہر ہی کی سیر کرتا رہا۔ ایک دن میں ایک خوبصورت کشتی میں بیٹھ کر راجہ ۔۔۔ سے ملنے گیا جو دریا کے بہاؤ کی طرف تین چار میل کے فاصلہ پر رہتا تھا۔ جب میری کشتی پانی کے سینے کو چیرتی ہوئی جا رہی تھی تو اس وقت میں دریا کے دونوں طرف عجیب دلکش مناظر دیکھ رہا تھا۔ سینکڑوں لوگ دریا کے کناروں پر جمع تھے کچھ تو نہا رہے تھے اور کچھ پوجا پاٹ میں مشغول تھے سورج کی شعاعیں مندروں کے سنہری کلسوں سے ٹکرا کر آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ مجھے اُس وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اب بھارت ورش میں ہوں سینکڑوں مندروں کے وسط میں ایک آدھ مسجد کا گنبد بھی دکھائی دیتا تھا جو زمانۂ گذشتہ کی یاد تازہ کرتا تھا۔ جب میری کشتی مردہ گھاٹ کے قریب پہنچی تو موت کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا اور میرے دل میں کچھ عرصہ کے لئے اس فانی سنسار کی طرف سے نفرت پیدا ہو گئی ایک لاش سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک تختہ پر رکھی تھی۔ عین اس وقت ایک اور کشتی میرے اور مردہ گھاٹ کے درمیان آنکلی۔ اس نووارد کشتی میں ایک بوڑھا انسان کھڑا تھا جس کے لباس اور ظاہری شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی سادھو ہے۔ اس کی کشتی میں بہت سی پیتل و ہاتھی دانت کی مورتیں رکھی ہوئی تھیں اور ایک چھوٹا سا ڈبہ بھی اُن کے درمیان پڑا تھا۔ یہ کشتی میری کشتی کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ وہ سادھو نہایت نرمی سے

بولا - "مہاراج کیا آپ ان چیزوں کو دیکھنا پسند فرمائیں گے؟" میں نے اُس خدا دوست انسان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "گروجی میں نے ایسی بہت سی چیزیں خرید لی ہیں اب اور خرید کر کیا کروں" "تو مہاراج کچھ قیمتی پتھر اور انگشتریاں خرید فرمائیں گے؟" سادھو نے ڈبے میں سے چند پتھر اور انگشتریاں مجھے دیتے ہوئے کہا۔ جب میں ان قیمتی پتھروں کو دیکھ رہا تھا تو میری نظر اچانک ایک انگشتری پر پڑی اس میں ایک درخشاں ہیرا جڑا ہُوا تھا جو سورج کی روشنی کو بھی ماند کر رہا تھا۔ "یہ نہایت عجیب انگشتری ہے" میں نے انگشتری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس اثنا میں ہم مردہ گھاٹ سے کافی دور نکل گئے تھے لیکن سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی لاش ابھی تک دکھائی دے رہی تھی۔ بوڑھے سادھو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "موت وحیات کا راز اس انگشتری میں پوشیدہ ہے۔ یہ ایک بدھ مندر کی یادگار ہے جو میرے گرو نے مرتے وقت مجھے دی تھی" میں نے کہا "اگر آپ یہ بیچنا چاہیں تو میں خریدنے کو تیار ہوں۔" اُس سادھو نے اپنی لمبی اور سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میں خوشی سے تو اسے فروخت کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن مہاراج مجھے کچھ روپوں کی ضرورت ہے۔ میری خواہش ہے کہ ہمالیہ پربت پر مانسرور کے قریب بدھ راہبوں کے ساتھ زندگی کے باقی دن بھگوان کی یاد میں گذاروں اگر یہ انگشتری مجھے وہاں تک پہنچنے کا خرچ دے سکتی ہے تو میں اسے ضرور بیچ دوں گا۔" "گروجی آپ کو کتنے روپوں کی ضرورت ہے" میں نے کہا "ایک سَو کی مہاراج" سادھو نے کہا۔ میں نے وہ انگشتری ایک سَو میں خرید لی۔ اُس نے انگشتری خوشی خوشی میرے حوالے کی اور روپے لیتے ہوئے کہا۔ "مہاراج یہ انگشتری پیتل کی نہیں* بلکہ خوابوں کی دنیا خرید لی ہے۔ یہ خواب بہت حیران کن اور دلکش ہوں گے اور آپ کو آنے والی دنیا کے نظارے دکھائیں گے۔ اس سارے سنسار میں اس جیسی انگشتری صرف ایک اور ہے۔ جو کہیں نامعلوم جگہ پوشیدہ ہے شائد آپ کی قسمت آپ کو اس پوشیدہ انگشتری کی طرف رہنمائی کرے کیونکہ زندگی کے بھید اس میں پوشیدہ ہیں۔ پرماتما کرے کہ مہاراج اس جھوٹے سنسار کی پریم سے دور بھاگ جائیں سکھی رہو بیٹا۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے ملاح کو اشارہ کیا۔ اور آن کی آن میں کشتی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ انگشتری میرے ہاتھ میں تھی اور میں اس کو ناقدانہ نظر سے دیکھ رہا تھا۔ ہیرا اپنی چمک دمک دکھا رہا تھا لفظ "مایا" سنسکرت زبان میں اس میں کھدا ہُوا تھا۔ میں نے اپنا بٹوا نکالا اور اُس میں اسے احتیاط سے رکھ دیا۔

اسی روز شام کو جب میں اپنے دوست راجہ ــــ سے مل کر واپس آرہا تھا تو مجھے راستہ میں رات ہوگئی میں نے اپنے ملاح کو کشتی کنارے لگانے کے لئے کہا تاکہ وہ کچھ دیر آرام کرلے۔ غریب تمام دن چپو چلاتے چلاتے تھک گیا تھا۔ بنارس شہر کی روشنی سامنے نظر آرہی تھی اور ہم بنارس سے تقریباً آدھ میل کے فاصلہ پر ہوں گے ملاح نے کشتی کنارے پر لگادی اور خود کشتی سے اُتر کر کنارے کی ٹھنڈی گھاس پر لیٹ گیا میرا خاص نوکر بھی اُسی کے پاس جا بیٹھا۔ میں کشتی میں لیٹا ہُوا تھا کہ مجھ پر خواب کا عالم طاری ہوگیا مجھے ایک سریلے نغمے کی مدھم آواز سنائی دی۔ اس کے بعد عجیب واقعہ ہُوا۔ دریا کا نظارہ میری آنکھوں سے دور ہوگیا۔ میں نے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی پھر میں نے بہت سی نقاب پوش عورتوں کو اپنے پاس سے گزرتے دیکھا ان عورتوں کے وسط میں ایک عورت تھی جو سیاہ لباس میں ملبوس تھی اُس کا آنچل سر سے سرک گیا تھا۔ اُس کی لمبی لمبی سیاہ زلفیں پریشانی کے عالم میں بکھری ہوئی تھیں اُس کے دونوں ہاتھ کسی مجرم کی طرح بندھے ہوئے تھے۔ یہ مجمع دیکھ کر میں ٹھہر گیا اور ایک بدھ راہب اُن کے سامنے آکھڑا ہُوا لیکن یہ سب کچھ رات کی تاریکی میں غائب ہوگیا صرف اُس سیاہ پوش حسینہ کا چہرہ دور سے دکھائی دے رہا تھا۔ یہ ایک غمناک اور معصوم چہرہ تھا اس کی لمبی لمبی زلفیں اُس کے چہرے کے اردگرد حلقہ کئے ہوئے تھیں "مہاراج رات بہت گذر چکی ہے۔ اب شہر جانا چاہیئے" میں اس آواز سے دفعتہً چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ میرا خاص نوکر میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے چلنے کو کہا اور کوئی آدھ گھنٹہ میں ہم شہر جا پہنچے اُس وقت گیارہ کا عمل تھا میں سیدھا اپنے سونے کے کمرہ میں گیا اور بستر پر لیٹ گیا اور سو گیا۔ اُس رات کو بھی میں نے عجیب وغریب خواب دیکھے۔ اب میں سمجھتا رہا تھا کہ میں نے یہ انگشتری کیوں خریدی جو ایسے خواب دکھاتی ہے۔ یہ بھارت ورش بھی عجیب ملک ہے جس میں نامعلوم گذرے ہوئے زمانہ کے خواب خریدے جاسکتے ہیں۔ اور صرف ایک سَو روپے میں۔ اگرچہ میں ہندوستانی تھا لیکن چونکہ ابھی ابھی یورپ سے واپس آیا تھا۔ اس لئے مجھے یہ ایک عجیب چیز معلوم ہوتی تھی۔ ہر روز رات کو میں یہ خواب دیکھتا تھا۔ دن کے وقت میں اس دنیا میں ہوتا تھا لیکن رات ہوتے ہی ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتا تھا یہاں تک کہ اُس نرالی زندگی کی بوقلمونی نے مجھ کو مسحور کردیا۔ ان خوابوں نے مجھے ایک جزو بنا لیا۔ ہر رات کو میں اُس نادیدہ حسینہ

* طلا ہشت دھات کی ہے اور اس کا ہیرا نہایت قیمتی اور بیش بہا ہے۔ مہاراجہ کے پاس ایسی ایک ہی انگشتری ہے

کا منتظر رہتا تھا جو میرے پاس آیا کرتی تھی۔ جب پھر رات گذر جاتی تو ایک دلربا چہرہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا تھا بعض دفعہ مجھے مردوں اور عورتوں کے جمگھٹے دکھائی دیتے تھے۔ کبھی بدھ راہب اور پجاری ڈھیلے ڈھالے لباس پہنے بدھ کی مورتی کی پوجا کرتے نظر آتے تھے۔ وہ سیاہ پوش حسینہ کبھی تو ایک پُر تکلف لباس پہنے مہاتما بدھ کی مورتی پر پھول چڑھاتی دکھائی دیتی اور کبھی ایک نوعروس کی طرح بن سنور کر جلوہ فرما ہوتی۔ کبھی قدموں کی آہٹ کان میں آتی کبھی گوناگوں نغمے سنائی دیتے تھے لیکن یہ سلسلہ کہیں ختم نہ ہوتا تھا۔ تین ہفتے اسی طرح گذر گئے۔ میں آگرہ دہلی سے ہوتا ہؤا کلکتہ چلا گیا لیکن یہ خواب ختم نہ ہوئے۔ ایک رات مجھے ایسا معلوم ہؤا کہ میں ایک عالیشان محل میں کھڑا ہوں جسے بڑے بڑے ستون سہارا دئے ہوئے تھے۔ ستونوں کو رنگ برنگ کے خوشنما سنگریزوں کی پچی کاری اور خوش وضع تراشی ہوئی بیلوں نے عہدِ گذشتہ کی صنعت کی یادگار بنا رکھا تھا۔ فرش بے داغ سفید مرمر کا تھا۔ جس کے اردگرد ۔ سنگِ ساق کا حاشیہ تھا کمرے کے ایک طرف ایک زرنگار تخت پر ایک بوڑھی ملکہ بیٹھی تھی۔ اُس کے لباس سے عطر کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی اُس کا چہرہ غصے سے سُرخ تھا اور پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور وہی سیاہ پوش حسینہ سامنے ایک ستون سے بندھی ہوئی تھی۔ ایک بوڑھا راہب کمرہ میں داخل ہؤا اس نے اُسے جھک کر سلام کیا۔ وہ ملکہ کے تخت کے قریب کھڑا ہو کر کچھ بولتا رہا اور پھر کاغذ نکال کر پڑھنا شروع کیا۔ اس سے ملکہ کا غصہ جاتا رہا وہ تخت سے اُتری اور اُس سیاہ پوش حسینہ کے ہاتھ پاؤں کھول دئے۔ اس کے بعد سب کچھ غائب ہو گیا۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایک شام جب میں آرام کرسی پر بیٹھا پرانی تصاویر کے البم کی ورق گردانی کر رہا تھا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے ایک محل کی تصویر دیکھی جو میرے اُس خواب والے محل سے بالکل ملتی جلتی تھی۔ میں نے اُسی وقت پختہ ارادہ کر لیا کہ اُس محل کی جائے وقوع پر ضرور جاؤں گا۔ تصویر کے نیچے عبارت لکھی ہوئی تھی اس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ محل سیلون میں ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ جہاں سیلون گورنمنٹ نے کھدائی کا کام شروع کیا ہے۔ میں نے اپنے دوست سے جو میرا میزبان بھی تھا سیلون جانے کی اجازت طلب کی اور دوسرے ہی دن میں سیلون کو روانہ ہو گیا۔ ایک ہفتہ کے سفر کے بعد سیلون پہنچا اور وہاں سے اُس طرف چلا گیا جس کی مجھے تلاش تھی۔ جناب وہی جگہ ہے جس گاؤں میں متلاشی تھا۔“ راہب یہ کہکر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا میں اُن حیرت انگیز انگشتریوں کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے دل میں اس کہانی کے متعلق طرح طرح کے خیالات آتے تھے کبھی تو میرا دل کہتا کہ یہ کہانی محض بناوٹی ہے۔ اور کبھی اس انوکھی کہانی کو درست تصور کرتا۔ راہب نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”میں اپنے خوابوں کے محل میں پہنچا جس کے بغل میں ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا میں اس میں گھومنے لگا۔ مجھے اس عمارت کی پختگی اور خوبصورتی پر تعجب ہوتا تھا۔ اُس کی دیواروں پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے جن کا رنگ و روغن صدیوں گذرنے کے باوجود بھی نیا معلوم ہوتا تھا اُس کے بغل والے مندر میں مہاتما بدھ کی پتھر کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ دن بھر تو میں وہیں رہا مگر شام کو ایک گاؤں میں جو وہاں سے دس میل کے فاصلہ پر تھا چلا آیا تاکہ رات وہیں بسر کی جائے لیکن گاؤں پہنچنے پر میرے دل پر ایک بے چین کر دینے والی کیفیت طاری ہو گئی کوئی پُر اسرار طاقت ایسی تھی جو مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی اور رہ رہ کر مجھ سے کہتی تھی کہ ”اٹھ اور اس عمارت کی طرف چل“ میں نے بمشکل اس کا مقابلہ کیا اور دل پر جبر کر کے سو گیا۔ لیکن مجھے عالمِ خواب میں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں چل رہا ہوں اگرچہ میں اُس علاقہ میں اجنبی ہونے کی وجہ سے راستوں سے قطعی ناواقف تھا لیکن میرے پاؤں اس طرح اُٹھتے تھے جیسے وہ ان راستوں سے مانوس ہیں۔ میں چلتا رہا اور آخر اُسی محل میں جا پہنچا جونہی میں اُس عمارت کے قریب پہنچا اس طرح کی آواز میرے کانوں میں آئی جیسے کسی بڑے مجمع کے منتشر ہوتے وقت سنی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سے مرد اور عورتیں اس عمارت کے محراب دار دروازوں سے باہر نکل رہی ہیں۔ میں نے نہایت استعجاب سے اُس عمارت کی طرف نظر ڈالی۔ اتنے میں ایک طرف سے گھنٹی بجنے کی آواز مجھے سنائی دی اور پھر ایک مجمع نظر آیا جو ایک لاش کو اٹھائے ہوئے تھا۔ میں تصویرِ حیرت بنا کھڑا تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ ایک زور کی چیخ سنائی دی جس کے جگر دوز زیروبم سے میری تمام ہستی لرز گئی اور یہ نظارہ تاریکی میں غائب ہو گیا اور میں نے اپنے آپ کو بستر پر لیٹے ہوئے پایا۔ اُف کیسا بھیانک خواب تھا پو پھٹنے کے قریب تھی اور چاند جو رات بھر کی اختر شماری سے تنگ آکر زرد پڑ گیا تھا رخصت ہونے کو تھا اس کے بعد میں نہ سو سکا۔ دوسرے دن صبح سویرے ہی میں اُن کھنڈروں میں جا پہنچا اور قلیوں سے باتیں کرتا رہا جو وہاں کھدائی کا کام کر رہے تھے۔ اسی طرح شام ہو گئی۔ جب میں گاؤں

کی طرف چلنے لگا تو مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ کوئی مجھ سے بمنت سماجت کہہ رہا ہے کہ آج نہ جاؤ۔ میں نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی اور آگے بڑھا لیکن دو قدم بھی نہ چلا تھا کہ ایک ہوا کا تیز جھونکا آیا اور میری پگڑی اُڑا لے گیا اس کے ساتھ ہی اُس سیاہ پوش حسینہ کا چہرہ دُور سے نظر آیا جو مسکرا رہا تھا۔ بس میرے لئے صرف اتنا ہی کافی تھا۔ اور اس رات میں گاؤں نہ جاسکا جب رات کی تاریکی میرے چاروں طرف چھا گئی تو میں کچھ بے چینی محسوس کرنے لگا۔ مجھے اُس وقت ایسا معلوم ہُوا کہ مجھے کوئی آہستہ آہستہ دھکیلتا ہے اور پھر ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے کہ میرے پیچھے پیچھے آؤ اگرچہ میری آنکھوں کو کچھ سجھائی نہ دیتا تھا لیکن پھر بھی میں جا رہا تھا یہ ہاتھ نہایت خوبصورت تھے اور جڑاؤ انگشتریوں سے مزین تھے۔ میں چپکے سے اٹھا اور اپنے اَن دیکھے رہنما کے ساتھ ہولیا۔ اس پُراسرار شب گشت میں ہم نے بہت سے دالان۔ حجرے اور غلام گردشیں طے کیں۔ میری رہبر وہی سیاہ پوش نازنین تھی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا اور مجھ سے کہہ رہا تھا کہ آج کی رات الف لیلہ کی کوئی پُراسرار رات ہے اور تو اسی خوفناک وادی میں قدم رکھ رہا ہے" آخر میری رہنما ایک گڑھے کے قریب ٹھہر گئی اور زمین کی طرف اشارہ کیا جو کچھ مجھے نظر آیا اُسے دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا۔ گڑھے کے قریب ایک صندوق پڑا تھا جو کھلا ہُوا تھا۔ اُس میں کچھ ہڈیاں اور ایک انسانی کھوپری رکھی ہوئی تھی اور زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ اُس کے پاس ایک جڑاؤ انگشتری پڑی تھی جو میری اُس انگشتری سے بالکل ملتی جلتی تھی۔ جو میں نے ایک سادھو سے بنارس میں خریدی تھی۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں نے اُسے اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ عین اُس وقت یہ آواز میرے کانوں میں آئی۔" ہے بھگوان تو ہمارا داتا ہے۔ ہم تیرے ہی پُن کے دستور عمل پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ تیری ہی پوجا سے ہم اپنے جیون کو پوتر بناتے ہیں۔ تیرا استھان ہر پرش کے ہردے مندر میں ہے۔ اوم، میں نے چاروں طرف مشتاق نگاہوں سے دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ دور اُس سیاہ پوش نازنین کا متبسم چہرہ نظر آیا۔ اُس کے چاند جیسے چہرے کے ارد گرد ایک نورانی ہالہ نظر آتا تھا جس کی وجہ سے اُس کا چہرہ زیادہ خوبصورت اور پاک بن گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر۔۔۔ یہ چہرہ رات کی تاریکی میں غائب ہوگیا۔

جب میں نیند سے بیدار ہُوا تو سورج اپنی کرنوں کے سنہری پھول اُن منہدم مندروں اور مہاتما بدھ کی مورتیوں پر برسا رہا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں وہ انگشتری رکھی ہے میں اُٹھا اور وہاں سے چلنے لگا۔ کہ پھر یہ آواز سُنائی دی"۔ ہے بھگوان تیرا استھان ہر پُرش کے ہردے مندر میں ہے۔ اوم" ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ" اوم" اوم" کی آوازیں آتی تھیں۔ ہر مندر معبد اور ہر گوشے سے "اوم" "اوم" کی صدائے آوازیں آئیں۔ ایک خوبصورت اور نورانی چہرہ میری آنکھوں کے سامنے تھا اور وہی "اوم" کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ میری روح پر سکتے کا عالم چھا گیا اور تمام انسانی خواہشات دل سے دُور ہوگئیں اور میں ایک ایسی دنیا میں پہنچ گیا جس کے صاف چشمے ہر ایک پیاس کو بجھا دیتے ہیں۔ اور انسان کا دل گناہ اور خودی کے جذبات سے قطعاً پاک ہوجاتا ہے۔

یہ ہے وہ حیرت انگیز افسانہ جس نے ایک ریاست کے حکمران کی زندگی میں ایسا انقلاب عظیم برپا کر دیا جس کی وجہ سے وہ تمام دنیاوی جاہ و حشمت پر لات مار کر اُس راستہ پر گامزن ہوگیا جس پر دنیا کے نجات دہندہ مہاتما بدھ نے قدم اُٹھایا تھا۔ اُس کی کہانی ختم ہوچکی تھی چونکہ رات کافی ہوچکی تھی۔ اس لئے میں نے وہاں سے چلنے کا ارادہ کیا۔ میں نے اُس بدھ راہب کو جھک کر تعظیم سے سلام کیا۔ راہب نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے آشیرباد دی اور "اوم" اوم" کی صدائیں لگاتا غار کے اندر چلا گیا۔

رانا آفتاب احمد خاں بی اے
امیر حبیب اللہ خاں نظامی

تسلسل

سعید ازدواجی تسلسل سے تنگ آگیا تھا۔ صبح سے شام تک گھڑی کی سوئی کی طرح ایک محدود دائرے میں گردش کرنا۔ ایک ہی طرح کی باتیں کرنا۔ ایک ہی طرح کے جذبات سے متاثر ہونا۔ یہ فرسودگی اُس کی رُوح کو کھائے جاتی تھی۔

اُسے معلوم تھا کہ دفتر سے واپس آکر کیا ہوگا۔

دروازے کے پاس اُس کی بیوی حمیدہ کھڑی ہوگی۔

وہ اُس کی طرف مُسکرا کے دیکھیگی۔ وہ اندر داخل ہو جائیگا۔

چائے پیئے گا۔ میز کے قریب بیٹھ کر اخبار پڑھیگا۔ (اخبار میں کیا ہوتا ہے۔ مہمل مقالے سنسنی پیدا کرنے والی خبریں۔ ہندو مسلم فسادات) اِس کے بعد شام کے کھانے کا وقت ہو جائیگا۔ شوربہ ہوگا۔ روٹی ہوگی۔ شاید حلوا بھی ہو۔

آٹھ بجے کے قریب ساتھ کے مکان سے کسی ہارمونیم کی آواز آئیگی۔ دونوں میاں بیوی کچھ عرصے کے لئے غور سے سنیں گے۔ پھر سعید کی توجہ ہٹ جائیگی۔ سعید کو معلوم تھا کہ یہ تمام باتیں ہونگیں۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ عین ساڑھے آٹھ بجے وہ فیقیدالمثال جرأت سے کام لیکر اپنی بیوی سے کہیگا۔

"ذرا میرا اوورکوٹ دو"

اور اُس کی بیوی ماتھے پہ شکن ڈال کر کہیگی۔

"بھلا اِس وقت تم کہاں جاؤ گے۔ سردی کا موسم ہے۔ ٹھنڈ لگ جائیگی۔ زکام ہو جائیگا۔ کھانستے پھرو گے۔"

سعید جواب دیگا۔

"میں ذرا حامد کے ہاں جانا چاہتا تھا۔ خیال تھا کہ ایک دو بازیاں شطرنج کی کھیلوں۔"

کچھ دنوں سے یہی معمول تھا۔ ساڑھے آٹھ نو بجے کے قریب سعید شطرنج کھیلنے چلا جاتا تھا۔ اکثر اوقات اُسے بارہ بج جاتے تھے۔ اُس کی بیوی نیند سے اُٹھکر دروازہ کھولتی تھی۔ تو اُس کی آنکھیں سُرخ معلوم ہوتی تھیں۔ اکثر اُن میں اِس ذراسی بات پر لڑائی ہوتی تھی۔ لیکن آج جب سعید اپنے مکان میں داخل ہوا تو گویا اس کے لئے نظامِ کائینات میں ایک انقلاب برپا ہوگیا۔ کمروں میں اسباب بکھرا پڑا تھا۔ ایک طرف میز پر ایک رقعہ تھا۔ سعید نے اٹھا کر پڑھا تو اس میں یہ مضمون درج تھا۔

"ابھی مجھے تار موصول ہوا کہ اماں بہت بیمار ہیں۔ بھائی جان مجھے سٹیشن پہ لینے آجائیں گے۔ آپ کے کالر اور آپ کی قمیص الماری کی دوسری دراز میں ہیں۔ بجلی والوں کا بل ابھی تک نہیں چکایا گیا۔ اس کا خیال رکھیئے گا۔ دُھلی ہوئی جرابیں میز کی دراز میں ہیں۔"

حمیدہ

اِس سے پہلے برسوں سے حمیدہ کبھی اپنے گھر نہ گئی تھی۔ اُسکی طبیعت ہی اِس قسم کی تھی۔ اُس کے رشتے دار اُسے ملنے کے لیئے سعید کے ہاں آجاتے تھے۔ وہ کہا کرتی تھی کہ گھر بار چھوڑکر جانا مصیبت ہے۔ سعید نے رقعے کو دوبارہ پڑھا اور حیران حیران کمرے کی بے ترتیب اشیا کی طرف دیکھنے لگا۔ آج فرسودگی اور تسلسل کی شکایت کا موقع نہ تھا۔ آج سعید کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دنیا ہی بدل گئی ہے۔ اُس نے حیرت اور خوف سے اپنی بیوی کے اُترے ہوئے کپڑوں کی طرف دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کمرے سے کسی نے زندگی نکال لی ہے۔ ہر چیز بے جان مردہ مہیب معلوم ہوتی تھی۔ اُسے احساس ہوا کہ زندگی حمیدہ کے بغیر بے کیف ہے۔ بے لطف ہے۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ حمیدہ کی محبت اُس کے دل میں اِس طرح سرایت کر گئی تھی کہ ہوا کی طرح اُس کی زندگی کے لئے ضروری ہوکر رہ گئی تھی۔ ہوا کی طرح غیر معلوم لیکن ضروری —— خدا جانے وہ کب واپس آئیگی۔ شاید دس دن کے بعد شاید پندرہ دن کے بعد۔ یہ خیال آتے ہی اُس کا دل کانپ گیا۔ پندرہ دن تک کیا ہوگا؟

اُس نے بے دلی سے کھانا کھایا۔ سگرٹ پینے کو اس کی طبیعت نہ چاہتی تھی۔

پھر سوچ میں غرق ہوگیا۔

آج رات اُسے اپنے اعمال پر پورا اختیار تھا۔ وہ جہاں چاہتا

تھا جا سکتا تھا۔ وہ چاہتا تو ساری رات غائب رہتا اور کوئی اُسے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ لیکن اُس کا دل مردہ ہو چکا تھا۔ اپنی بیوی کی غیر موجودگی میں وہ کہیں نہیں جانا چاہتا تھا۔ اُسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کی موجودگی کسقدر راحت رساں تھی۔ اس نے سوچنا شروع کیا۔

"میں بھی کسقدر بیوقوف ہوں۔ آج تک مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ میں تو رات کو شطرنج کھیل کر دل بہلا لیتا ہوں میری بیوی اکیلی بیٹھ کر کڑھتی ہوگی۔ اچھا آئندہ سے میں رات کو اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کیا کرونگا۔ کبھی کبھی اُسے سینما بھی لے جاؤنگا۔"

یکایک دروازہ کھُلا۔ اور حمیدہ داخل ہوئی۔ سعید نے اپنی بیوی کی طرف تعجب سے دیکھا۔ اُس کی بیوی نے کہا "شکر ہے میں گھر آ پہنچی۔ گاڑی میں تو میرا بدن ٹوٹنے لگتا ہے سٹیشن ہی پر بھائی جان نے بتا دیا تھا کہ اماں کی حالت اب اچھی ہے۔ اُنہیں ایسے ہی وہم ہو گیا اور تار دلوا دیا۔۔۔۔۔"

گھڑی کی سوئی پھر ایک محدود دائرے میں گردش کرنے لگی۔۔۔۔۔ فرسودگی اور تسلسل کا دور قائم ہو گیا۔۔۔۔۔ زندگی کے پہیئے پھر اسی محور پر گھومنے لگے۔۔۔۔۔

سعید نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ اُس نے کہا۔

"ذرا میرا اوورکوٹ دینا۔"

اُس کی بیوی نے کہا۔

"بھلا تم اِس وقت کہاں جاؤ گے۔ سردی کا موسم ہے۔"

عابد

جلوۂ نقاب

اُن کے چہرے پر پڑی رہتی ہے ہلکی سی نقاب
ہو گیا ہے حسنِ بے پروا کو پاسِ نام و ننگ
اب نمودِ حُسن سے ظاہر ہیں اندازِ حجاب
عشق نے سکھلائے ہیں اُسکو شرمانے کے ڈھنگ

حسن آخر حسن ہے پردوں میں چھُپ سکتا نہیں
کون کرسکتا ہے اس پر عرصۂ تنویر تنگ
حُسن کی تابانیوں سے جگمگا اُٹھا نقاب
جیسے تابانی سے سورج کی اُفق ہو لالہ رنگ
جس طرح ساغر کی مے ظاہر بھی ہو پنہاں بھی ہو
یونہی پیدا ہے نقابِ حُسن سے چہرے کا رنگ
حُسن شاید نفسیاتِ شوق سے ہو بے خبر
عشق کے دل میں اُٹھی پر دی سی اک تازہ اُمنگ
عشق کہتا ہے یہ ہوکر ہم نوا اقبال کا
پرتوِ حسن تو می اُفتد بروں مانند رنگ
صورتِ مے پردہ از دیوارِ مینا ساختی

شاطر (غزنوی)

شام

ہو چکی دن کی حکومت، شام جلوہ ریز ہے
اب دُھندلکے کا سماں یکسر سکوت انگیز ہے

پھیکی پھیکی روشنی ہے رفعتِ افلاک پر
اور ظلمت چھائی جاتی ہے جبینِ خاک پر

اوڑھ لی ہے سارے عالم نے ردائے سُرمگیں
کیا بھلی معلوم ہوتی ہے فضائے سُرمگیں

وادیٔ مغرب میں جاکر سو گیا ہے آفتاب
یعنی ہم آغوشِ منزل ہو گیا ہے آفتاب

اب فلک سے بارشیں انوار کی ہوتی نہیں
اِس جہاں کے رہنے والوں میں شعاعیں بٹ چکیں

چھا گیا ہے بزمِ قدرت پر اُداسی کا سماں؛
فکر میں ہے غرق اُجڑی گود والا آسماں

خوب دن بھر مست ہو ہو کر بجائیں تالیاں
ہو گئی اب بزم سُونی، رو رہی ہیں ڈالیاں

اختر انصاری دہلوی

اشعار

خلق کہتی ہے جسے دل تیرے دیوانے کا
ایک شعلہ ہے محبت کے صنم خانے کا

بستِ رنگیں میں جو ساقی نے اٹھایا ساغر
لے لیا بوسہ مری توبہ نے پیمانے کا

افضل

12
1
2
3
4
5
6
7
8
9
10
11
لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
گارنٹی ۶ سال

دُنیائے ادَب

شاعری اور خودستائی

شاعری میں خودستائی کا رواج اسقدر عام ہے کہ اخلاقیات کے احاطہ میں بھی اس کو معائب کی فہرست میں داخل نہیں سمجھا جاتا اور فن شعر کے دربار میں تو اس کا شمار محاسن میں ہونے لگا ہے۔ شعرا کی ... خودستائی اصل میں شعر کی قدر اور شعرا کی عزت و وقعت سے شروع ہوئی، اچھے شعر پر خاص و عام کا متاثر ہونا اور صاحبِ شعر کی تعریف و توصیف کرنا رفتہ رفتہ اس حد کو پہنچ گیا کہ شاعر محض اس لئے کہ وہ شاعر ہے۔ خود کو تعریف و توصیف کا مستحق سمجھنے لگے۔ اور جب اُن کے نزدیک اُن کے اشعار کی کماحقہٗ داد نہ ملی تو انہوں نے یہ فرض بطور خود انجام دینا شروع کر دیا، اس کے علاوہ دوسرے ہمعصر شعرا سے مقابلہ بھی شعرا کی "تعلی" کا بڑا سبب ہوا۔ یہ امر شبہ سے خالی نہیں۔ کہ حریف کا مقابلہ فنونِ لطیفہ میں یا حقیقی تخلیقی ادب کی پیداوار میں کچھ مفید ثابت ہوا ہے۔ لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ اشعار میں تعلی کا اظہار ایک بڑی حد تک حریفانہ تقابل کا ممنونِ منّت ہے۔

مبالغہ ایشیائی شاعری کا زیور ہے، تعلی کے خدوخال کو بھی دل کھول کر اس زیور سے سجایا گیا اور پھر۔ ایسا سجایا گیا کہ دیکھنے والے مبہوت رہ گئے۔

ناصر علی سرہندی اپنی مثنوی میں اسقدر آگے نکل گئے کہ شاید مولویوں کا طبقہ تو انہیں کبھی معاف نہ کرے گا۔

سخن را آفریدم جان دمیدم
بہ اقرارِ خدائی برگزیدم
الست سر زد از من او بلیٰ گفت
صنم یا عبد او یار بتا گفت

تخئیل کی اس بے لگام روش کا ایک سبب خود اپنی شاعری پر ضرورت سے زیادہ ایمان اور اعتقاد بھی ہے۔ تخئیل اور جذبہ جس پر شعر کی بنیاد ہوتی ہے اسقدر غیر محدود اور غیر معیّن ہے کہ اس کے کسی جزو کا غیر مکمل طور پر بھی الفاظ میں ادا ہو جانا ایک ایسی کامیابی ہے جس پہ فخر کرنا ایک حد تک خلافِ فطرت نہیں ہے، انسان اگر کوئی ایسی مہم سر کرلے جس پر قابو پا لینا ..... اس کے نزدیک اس کے دوسرے ہم جنسوں کے لئے مشکل ہو تو اس کا فخر کرنا حق بجانب ہے۔ بشرطیکہ اس کا اثر اس کے عام اخلاق پر نہ پڑے۔ لیکن اس امر کا فیصلہ کہ شاعر حقیقت میں کسی اچھوتے خیال کو مؤثر طریقہ پر الفاظ میں ادا کرنے میں کامیاب ہوا یا نہیں، خود شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ جس خیال کو وہ اچھوتا اور نادر سمجھ رہا ہو وہ پامال ہو اور جس طرزِ ادا کو وہ ایک خاص وقت میں کسی خاص کیفیت کے ماتحت بہت مؤثر سمجھتا ہو وہ دوسروں کے لئے اپنے اندر کوئی کشش یا کوئی جذب اور کوئی اثر نہ رکھتا ہو، یا ممکن ہے کہ خیال بھی نادر ہو اور نظم بھی اچھی طرح ہوا ہو۔ لیکن پھر بھی شعر عام احساسات سے متعلق نہ ہو اور سوائے شاعر کے بہت ہی کم لوگ اس سے کیف اندوز ہوتے ہوں۔ اس حالت میں اگر شاعر کو اپنے اس شعر پر فخر ہے تو اس فخر کا وہ مستحق نہیں ہے۔ اور چونکہ زیادہ تر یہی صورت رونما ہوتی ہے اس لئے اس کا اثر اخلاقی حیثیت سے اچھا نہیں پڑتا۔

اُردو زبان کے شعرا میں اپنے کلام کے متعلق اس قسم کی غلط فہمی کا امکان اس لئے اور بھی زیادہ ہے کہ ہمارے یہاں تنقید بہ حیثیت فن کے قریب قریب معدوم رہی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نہ خود شعرا اپنے کلام کے معائب و محاسن سے آگاہ ہو سکے اور نہ پبلک اُن کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کر سکی، اور جب بے لاگ اور صحیح تنقید کا عام طور پر چرچا ہی نہیں ہے تو شعر کی خوبی کا انحصار تمام تر مشاعرے کی "واہ واہ" پر رہ گیا جو عموماً تحسین ناشناس سے زیادہ

وقعت نہیں رکھتی۔ اس حالت میں اگر شاعر کے کسی ایسے شعر پر جو اس کے لئے مایۂ ناز تھا لیکن حقیقت میں اس قابل نہ تھا داد نہیں ملی ہے تو وہ اسے سامعین کی عدم توجہی یا عدمِ استطاعت سے تعبیر کر سکتا ہے۔ پس اس شعر پر اس کا افتخار گو حقیقت میں بلا استحقاق ہے لیکن خلافِ عقل نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی غلط فہمی ہنوز باقی ہے۔

ہماری زبان کے شعرا میں تعلّی اور خود ستائی کے رواج کا ایک ذریعہ ہمارے مشاعرے بھی ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ مشاعروں کی داد سے اچھے خاصے صائب الرائے اصحاب غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شعر کے محاسن کا صحیح اندازہ عموماً مشاعروں میں نہیں ہوتا۔ اگر شعر واقعی مؤثر ہو تو مشاعرے کی داد سے شاعر کے احساس افتخار میں جو اضافہ ہوگا وہ گو بعض اوقات ضرورت سے زیادہ سہی لیکن حق بجانب ہوگا لیکن اگر شعر اس قابل نہیں ہے۔ (اور عموماً نہیں ہوتا) تو اس شعر پر شاعر کا فخر، جو ممکن ہے، محض مشاعرے کی داد سے ظہور میں آیا ہو غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس کا اثر اس کے اخلاق پر ہرگز اچھا نہ پڑے گا

(ماخوذ)

علّامہ شبلی نعمانی

اور

غزل

یاد رکھنا دوستو اس بزم میں		آ کے شبلی بھی غزلخواں رہ گیا

(۱)

انگریزی لٹریچر میں میکالے ایک بڑا مورخ اور چھوٹا شاعر سمجھا جاتا ہے ـــــ۔ ادب اردو میں شبلی کی حیثیت گو ایک بڑے مورخ کی ہے مگر بہ اعتبارِ شاعری در اصل وہ چھوٹے شاعر نہیں۔ مولانا شبلی میں ایک بڑا شاعر ہونے کی علامتیں اُن کی چند نظموں اور اشعار کے مجموعوں سے دیکھی جا سکتی ہیں۔

اگرچہ مرحوم نے غزلیں کم اور نظمیں زیادہ لکھیں مگر ہم کو یہاں ان کی تنقیدی و معاشرتی نظموں کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ جس شخص کے دماغ میں معاشرتی و سیاسی خیالات جمع ہوں اس کو غزل میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کرنا تھا۔ مگر شبلی قدیم رنگِ تغزل سے متجاوز نہیں ہوئے۔ اور یہ ان کے بڑے مصنف ہونے کی دلیل ہے۔

شبلی کی غزل میں نہ تو غالب کی سی بلند پروازی ہے نہ اقبال کی سی فطرت طرازی، نہ مولانا حالی کی طرح غیر لٹریچر کی تقلید اور یہ ایک بڑے نقاد کی حقیقی شان ہے کہ باوجود وقیع مورخ اور ایک بڑا مصنف ہونے کے غزل میں وہی سادگی اور وہی نزاکت برقرار رکھے جس کی بنیاد دلی دکنی نے ڈالی تھی اور جس کو میر نے درجۂ کمال تک پہنچایا تھا۔ اگر وہ شاعری میں اسی طرح دل لگاتے جس طرح تاریخ و تنقید میں تو ہم اُن کو ایک بڑا شاعر کہنے میں بے تکلف ہوتے جس طرح غالب اور شیکسپیر کو بڑا شاعر کہتے ہیں لیکن اپنے ہمعصروں یعنی امیر و داغ اور حالی ایسے قدیم و جدید شاعری کے کاملینِ فن کا مقابلہ کرنا اُن کو اچھا نہ معلوم ہوا، نہ اس مقابلہ سے کامیابی کی توقع ہوئی۔ اس لئے .... تاریخی شہرت سے وہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ مصر و انگلستان، ترک و ایران میں بھی نامور ہو گئے۔

(۲)

اگرچہ غالب کی طرح شبلی بھی اردو شاعری کو کبھی وقعت و فخر کے ساتھ نہ دیکھتے تھے، تاہم جو کچھ آپ نے اردو میں کہا وہی زیادہ مقبول ہوا۔ فارسی میں غزلیں، قصیدے۔ مرثیے، رباعیاں اور مثنویاں وغیرہ سب کچھ لکھیں اور اردو میں چھوٹی چھوٹی نظموں کو حیاتِ انسانی کی کامل تنقید ثابت کر دی مگر شاعری کے قدیم سکول کی شان ان کی فارسی و اردو کی اُن غزلوں سے ظاہر ہوتی ہے جو عموماً چھوٹی بحروں میں لکھی گئی ہیں۔ وہ نہایت شستہ ہیں۔ ان میں افراط و تفریط بالکل نہیں نہ اِن سے قدیم رنگِ تغزل کی اوندھی سیدھی تقلید کا اظہار ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل کو قدیم خط و خال سے متعلق فضول تشبیہوں اور لیلیٰ و مجنوں کا دکھڑا سنانے

والی فرسودہ تلمیحوں سے بالکل پاک کردیا ہے۔ اس طرح ان کا انداز بیان موجودہ زمانہ میں شاعری کے قدیم سکول کے حامیوں کا رہنما ہو سکتا ہے۔

ان کی ہر غزل استادانہ ہے اور بعض بعض تو نمونۂ کمال ہیں۔ چنانچہ ذیل کی غزل بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی اہلِ زبان ایرانی نے لکھی ہے۔

آنچہ خوشتر ز انگبیں باشد　　بوسۂ لعلِ شکریں باشد
بہ دو حرفی نہ کردۂ یادم　　راہ و رسمِ وفا نہ ایں باشد
بر لبِ او نشانِ بوسہ بود　　ہمچو نقشے کہ بر نگیں باشد
می زنجم اگر وفا نہ کند　　یار نہ دو آشنا چنیں باشد
دل ز ہر کس کہ برد باز نہ داد　　شیوۂ دلبری ہمیں باشد
زاہد و رند ہر دو در کارند　　شبلی آں بودہ است و ایں باشد

(ماخوذ)

انگریزی

بے ثباتیٔ دنیا

گھڑی نے رات کے دو بجائے ہیں۔ شمعدان میں شمع جاں بلب مریض کی طرح آخری دموں پر ہے۔ اس وقت چوکیدار بھی اونگھ رہا ہے۔ دن بھر کی محنت سے تھکے ہوئے مزدور اور یا وہ جنہیں عیش و مسرت حاصل ہے، آرام کی نیند سو رہے ہیں۔ زاہدِ شب بیدار، مجرم عیاش، یا دین و دنیا سے مایوس کاموں کے سوا اس وقت کوئی بیدار نہیں۔ شرابی بار بار ہلاکت آفریں جام بھر رہا ہے، چور اور رہزن کسی اکیلے دکیلے مسافر کی تلاش میں منڈلا رہا ہے۔ اور زندگی سے بیزار مایوس اپنے مقدس جسم کے خلاف اپنا مجرمانہ ہاتھ اٹھانے کو ہے۔

کائناتِ عالم پہ اس وقت ایک عجیب افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ شمع کی ٹمٹماتی ہوئی کمزور روشنی پر بھی زردی چھائی ہوئی ہے۔ گھڑی کی ٹک ٹک یا کتے کی بھونکنے کی آواز کے سوا باقی ہر طرف ایک ہُو کا عالم ہے۔ اس وقت انسانی غرور و تکبر کا کرو فر اور جاہ و جلال بھی فراموش ہو چکا ہے۔ اور یہی ایک ساعت ہے جس میں انسانی نخوت اور گھمنڈ کی اصلی حقیقت کھل سکتی ہے۔

ایک وقت آئیگا، کہ یہ عارضی سکون جو اس وقت شہر پہ طاری ہے۔ مستقل بنا دیا جائیگا۔ یہ شہر اپنے باشندوں کی طرح فنا ہو جائیگا۔ اور اس کی جگہ صرف ایک صحرا رہ جائے گا۔

اس شہر کی طرح بہت سے عظیم الشان شہر اس دنیا میں آباد ہو چکے ہیں۔ اس شہر کے باشندوں کی طرح ان کے باشندوں نے بھی فتوحات حاصل کی ہونگی بغیر محدود عیش و عشرت کی زندگی بسر کی ہوگی اور کوتہ بینی کی وجہ سے اپنے آپ کو ازلی و ابدی تصور کیا ہوگا لیکن آج انہیں میں سے اکثر کا ہمیں تلاش بسیار کے باوجود پتہ و نشان نہیں ملتا۔ اور جن کے کھنڈرات ملتے ہیں۔ ایک اندوہگین مسافر اور راہ گزر انہیں دیکھ کر درس عبرت حاصل کرتا ہے۔ مسافر ان کھنڈرات کو دیکھتا ہے۔ کہیں اُسے قلعہ کی منہدم دیواریں نظر آتی ہیں، جن پر اب گھاس اُگ آئی ہے۔ ایک مقام پر وہ اس شہر کے "سینٹ ہاؤس" کے کھنڈر دیکھتا ہے جہاں بڑے بڑے مدبر بیٹھ کر نظامِ مملکت پر غور و فکر کیا کرتے تھے لیکن اب سانپوں، بچھوؤں اور اس نوع کے دوسرے حشرات الارض نے اس کے کھنڈروں کو اپنا مسکن بنا رکھا ہے۔ کہیں اسے معبدوں اور تھیٹروں کے کھنڈر دکھائی دیتے ہیں۔ جو زبانِ حال سے دنیا کو عبرت کا سبق دیتے نظر آتے ہیں۔ زمانۂ قدیم کے جاہ و جلال کے آثار آج زمین کے برابر ہموار ہیں۔ کیونکہ عیش کوشی اور حرص و آز نے ان کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ حکمرانوں نے اپنا منظورِ نظر سوسائٹی کے قابل افراد کی بجائے بیہودہ اشخاص اور یاوہ گوؤں کو بنانا شروع کر دیا تھا۔ ان کی دولت کو دیکھ کر غیروں نے ان پر حملہ کیا۔ جو اگرچہ پہلی مرتبہ پسپا کر دئے گئے۔ لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ اور پھر حملہ آور ہوئے۔ متواتر اور مسلسل کوششوں سے بالآخر فتح یاب ہوئے۔ اور مدافعین کو غیر معروف تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیا۔

فرانسیسی

محبّت

محبّت بمنزلۂ ایمان کے ہے۔ بلکہ بعض حالات میں تو یہ ایمان کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جب کسی انسان کے گرد و پیش ہر شے متزلزل دکھائی دیتی ہو۔ حالات میں انقلابات پیدا ہو رہے ہوں۔ جب اس کے دل و دماغ پر تاریکیوں نے تسلط جما لیا ہو۔ اور غیر معروف مستقبل بعید میں اُسے کچھ دکھائی نہ دیتا ہو۔ جب دنیا و مافیہا اس کے نزدیک ایک فرضی داستان یا ایک خواب سے زیادہ حقیقت نہ رکھتی ہو۔ جب کائنات اُسے بھیانک مہیب اور خوفناک نظر آتی ہو۔ جب تصورات کی دنیا دھوئیں کی مانند اُڑ جاتی ہو۔ جب حقائق و واقعات اس کے لئے مشکوک اور مشتبہ ہو جاتے ہوں۔ اس انتہائی یاس کے عالم میں بھی اس کے لئے ایک جگہ ہے۔ جہاں وہ آرام پا سکتا ہے، اور وہ عورت کا وفادار دل ہے! آلام و مصائب کے گرانبار کے نیچے دبے ہوئے سر کو وہ یہاں رکھکر ستا سکتا ہو۔ یہاں اسے زندہ رہنے اور بلاؤں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے ہمت اور دلیری میسر ہو سکتی ہے۔ اور یہیں اُسے امن کی موت مرنے کی طاقت نصیب ہو سکتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ محبّت خداوند تعالیٰ کی "شفقتِ پدری" کا بہترین مظاہرہ نہیں؟ بارگاہِ ایزدی میں پہنچنے کی یہی نزدیک ترین راہ ہے۔ محبّت بھی حقیقت میں ایک طرح کا ایمان ہے۔ اسے قبول کر کے ہی انسان اُن برگزیدہ ہستیوں کے زمرے میں داخل ہوتا ہے جو حقیقتِ حیات سے آشنا ہیں اور حق و صداقت کی مشعل سے دنیا کو منوّر کر رہے ہیں۔ جب تک ہم محبّت سے نا آشنا ہیں، ہماری ظاہری اور باطنی قوتیں، ہماری لیاقت و قابلیت اور دیگر وہ عطیات جو ہمیں قدرت نے بخشے ہیں سب فضول اور بے مصرف ہیں۔ ہماری زندگی بے مقصد اور ہمارا جینا بے معنی ہے کیونکہ اسکی بدولت ہی انسان اپنے خالق کو پہچان سکتا ہے۔

اطالوی

اقوال وتاثرات

جو لوگ "آزادی" کی چیخ پکار کرتے ہیں۔ اور اس کے لئے سب سے زیادہ شور و غل کرتے ہیں ان پر کبھی اعتماد نہ کرو۔ کیونکہ ایسے لوگ تقریباً تمام کے تمام اپنی اغراض کو پیش نظر رکھے ہوتے ہیں۔ اور بسا اوقات تجربات سے بھی جو انسان کے صحیح اور بہترین رہنما ہیں یہی ثابت ہوا ہے کہ اگر ان لوگوں کو اسبات کا خیال بھی ہو جائے کہ خود مختار اور مطلق العنان حکومت کے ماتحت وہ اپنی مقصد بر آری کر سکینگے تو پھر وہ بسرعت تمام اس راہ پر دوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

جو شخص بلا سوچے سمجھے اندھا دھند خطرات کے مقابلے کو نکل آئے وہ احمق ہے۔ لیکن جو شخص خطرات کی حقیقت سے آشنا اور ان کا مقابلہ کرنے کے مآل سے آگاہ ہو کر مگر اس کی پرواہ کئے بغیر بلا خوف و خطر میدان میں نکلتا ہے۔ وہ بہادر اور شجاع ہے۔

اخراجات سے مخلصی پانے کا طریقہ جاننے کا نام دانشمندانہ کفایت شعاری نہیں۔ کیونکہ اخراجات سے مخلصی پانا محال اور بعض اوقات ناممکن ہوتا ہے۔ بلکہ دانشمندانہ کفایت شعاری اس کا نام ہے۔ کہ انسان روپیہ صرف کر کے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرے۔

مذہب کی طرف سے یا بزرگانِ دین کے فرمان کے مطابق لوگ جو عبادت کرتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں۔ یا اور ایسی ہی دیگر مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں۔ مجھے ان کے خلاف کوئی اعتراض نہیں لیکن میرے نزدیک بہترین عبادت یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے انسان کو زیاں نہ پہنچائے۔ اور جو نیکی کر سکتا ہے کرے۔

اگرچہ حیاتِ انسانی قلیل ہے، لیکن یقین جانو جس نے اس قلیل مدت کو عقلمندی سے گزارا۔ اور فضول ضائع نہیں کیا۔ اس کے

سے لئے یہ قلیل عرصہ بھی کافی طویل مدت ہے۔ کیونکہ انسان کی کوشش کا دارومدار اس کی اپنی طبیعت اور فطرت پر ہے۔ اور جو انسان محنتی ہو اور عزمِ صمیم رکھتا ہو۔ وہ قلیل مدت میں کافی سے زیادہ — کام کر سکتا ہے۔

ھسپانوی

شاعر اپنا دل چیر کر خداوند تعالےٰ کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ وہ اپنے رنج و محن اپنے تفکرات، اپنی امیدوں اور زمانۂ گذشتہ کی یاد کے گیت بناتا ہے۔ اُنہیں گاتا ہے، اور اس طرح انہیں باطل کی آلائشوں سے پاک اور صاف کر دیتا ہے۔ اُس کے گیت سب کے لئے ہوتے ہیں۔

ہماری روحیں اس جسمانی خول کے اندر مقید ہیں۔ جس شخص کی روح اس خول کو توڑ کر پھوٹ نکلے وہ شاعر ہے۔ رنج یا مسرت کے زیر اثر جس شخص کی روح اس خول میں سے پھوٹ نکلے، وہ شاعر ہے۔ میں چاہتا ہوں، کہ انسانوں میں ہیجان پیا کرنا ازبس ضروری ہے۔ جس طرح چھلنی اور چھاج میں دانے ڈال کر انہیں پھٹکا جاتا ہے۔ اسی طرح انہیں بھی خوب زور سے پھٹکا جائے۔ ان کا ایک دوسرے کے ساتھ تصادم کرایا جائے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آیا اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر ان کے خول ٹوٹتے ہیں یا نہیں۔ ان کی روحیں ان خولوں سے باہر نکل کر ایک دوسری کے ساتھ ملتی ہیں یا نہیں۔ اور ان سب روحوں کو گوندھ کر ایک رُوح بنایا جا سکتا ہے، جس کا نام نوعِ انسانی کی رُوح ہو۔

لیکن گزشتہ تجربات کی بنا پر ہمیں نہایت افسوس سے اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ اس طرح کے باہمی تصادم ان خولوں کو توڑنے کی بجائے انہیں اور زیادہ سخت موٹا اور ضخیم بنا دیتے ہیں، لیکن شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تصادم زیادہ سخت نہیں ہوتا۔ میں اس بات کا حامی نہیں، کہ لوگوں سے رگڑ کھا کر گزر جاؤں۔ بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں۔ کہ میں ان سے ٹکراؤں۔ ان سے متصادم ہوں۔ اور اگر ممکن ہو، تو مدِمقابل کے ایک کے دو کر دوں۔ میرے نزدیک نوعِ انسانی کی یہی بہترین خدمت ہے اسی طرح یہ سخت خول ٹوٹ سکتے ہیں۔ اور انسانی روحیں ان میں سے نکل کر ایک دوسری میں مدغم ہو سکتی ہیں۔ جن کے اس طرح مل جانے سے ہی "نوعِ انسانی کی روح" بن سکتی ہے۔

جرمنی

زندگی سے بیزاری

زندگی سے بیزاری کے اسباب جسمانی اور اخلاقی ہیں۔ اوّل الذکر کا تعلق طبیبوں سے اور آخر الذکر کی تحقیقات کرنا فلاسفروں کا کام ہے لیکن ہم صرف اس کیفیت کو لیں گے جہاں اس بیزاری کا اظہار نمایاں طور پر ہوتا ہے۔ زندگی کی خوشی کا انحصار ان بیرونی اور خارجی تغیرات پر ہے۔ جو وقتاً فوقتاً رونما ہوتے رہتے ہیں۔ دن رات کا ردوبدل موسموں کا تغیر و تبدل۔ کلیوں سے پھولوں کا بننا۔ اور پھولوں کا ثمرات کی صورت اختیار کرنا اور دیگر اس طرح اور اس قسم کے تغیرات جو ہم وقتاً فوقتاً دیکھتے ہیں اور جن سے قدرت کا یہ مقصد تھا کہ ہم ان سے خوشی اور مسرت حاصل کریں۔ یہ تغیرات ہماری ہستی اور زندگی کا کرشمہ ہیں۔ ہم جس قدر زیادہ راحت ان سے قبول کرتے ہیں۔ ہماری زندگی خوش اور سرور انگیز ہوتی ہے۔ لیکن اگر ان تغیرات سے ہم بیگانہ رہیں۔ ان سے بے پرواہ اور ناآشنا ہو کر رہیں۔ اگر ان عطیاتِ ربانی کو ہم قبول نہ کریں، تو دنیا کا ایک بدترین مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے زیر اثر ہم زندگی کو ایک ناپسندیدہ بارِ گراں

سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک انگریز محض اس لئے اپنے گلے میں پھندا ڈال کر مر گیا تھا۔ کہ روز مرہ لباس تبدیل کرنا اس کے لئے سخت ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ وہ اسے ایک قید سمجھتا تھا اور اس سے رہائی کی صورت اُسے یہی نظر آئی کہ گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لے۔ ایک باغبان کو میں نے یہ کہتے سُنا "کیا میں اپنی زندگی بھر بادلوں کی مغرب سے مشرق کو آمد و رفت دیکھتا رہونگا۔ ہمارے ایک جلیل القدر ہم وطن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہر سال موسم بہار کو سبز لباس میں دیکھ دیکھ کر سخت بیزار ہو گیا تھا۔ اور آخر تنگ آ کر اس نے ایک مرتبہ کہا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر موسم بہار تبدیلی کے طور پر کبھی سرخ لباس میں بھی آئے"۔ یہ کیفیاتِ زندگی سے بیزاری کے آثار ہیں۔ اور اس کے بعد دوسرا قدم یہ ہوتا ہے کہ انسان خودکشی کر لیتا ہے۔

زوسی

ایک مایوس دل کی دنیا

"ساری رات میں نے تڑپتے ہوئے گزاری۔ میں بستر پر تھا۔ اور میری روح اور میرے جسم میں زبردست کشمکش ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ میری رُوح میرے جسم کو چھوڑنا چاہتی ہے۔ اور میرا جسم سے پکڑ کر کھینچ رہا ہے۔ میں زندہ تھا۔ پہلے زندہ تھا۔ اور آئندہ زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ لیکن اچانک ـــــ موت ـــــ اور پھر اس کے بعد ہر شے کی ہلاکت اور تباہی .... تو پھر اس زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مرنا؟ خودکشی کر لوں؟ مجھے اس سے خوف آتا ہے۔ مدت کا انتظار کروں؟ اور یہ انتظار مدت سے بھی زیادہ خوفناک ہے؟ زندہ رہوں؟ آخر کیوں؟ اور کس لئے؟ مرنے کے لئے؟ ان خیالات کے چکر سے میں نکل نہیں سکتا تھا۔ میں نے خیالات کی رَو بدلنے کے لئے کتاب اٹھائی۔ اور پڑھنا شروع کیا ـــ لیکن چند منٹوں کے بعد پھر وہی سوال اور وہ مہیب خیال؟

کہتے ہیں اس حالت میں دعا مانگنی چاہیئے۔ میں مناجات میں مصروف ہو گیا۔ بچپن میں ماں کے گھٹنے کے پاس بھی میں دعا کیا کرتا تھا۔ لیکن وہ دعا طفلانہ تھی۔ میری اس دعا کا مقصد تھا۔ میں نے کہا "اگر تو ہے۔ تو مجھے بتا کہ میں کہاں زندہ ہوں؟ اور میں کیا ہوں؟" میں دوزانو ہو گیا۔ جتنی دعائیں یاد تھیں سب دُہرا ڈالیں۔ اور پھر کہا "اب مجھے بتا میرے پیدا کرنے اور میری زندگی سے کیا مقصد ہے؟" میں خاموش ہو گیا۔ اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ گویا کوئی جواب دینے والا موجود ہی نہ تھا۔ پھر میں نے خود ہی اُس کی طرف سے اپنے سوالوں کا جواب دینا شروع کیا۔ "میری زندگی کا مقصد آنے والی زندگی میں زندہ رہنے کا ہے"۔ لیکن پھر یہ شک اور یہ اذیت کیوں؟ مجھے تو آنے والی زندگی پر اعتقاد نہیں۔ کبھی تھا۔ جب میں سوال نہیں کیا کرتا تھا لیکن اب۔ مجھے کوئی اعتقاد نہیں۔ بالکل اعتقاد نہیں۔ اگر تو ہے۔ تو تجھکو مجھ سے بولنا چاہیئے۔ مجھ سے اور دیگر لوگوں سے۔ لیکن آہ! تو نہیں ہے۔ صرف مایوسی ہی مایوسی ہے ....

مجھے غصہ آگیا۔ میں نے اُس سے کہا تھا کہ اپنے آپ کو دکھا۔ مجھے صداقت کا نور دکھا۔ میں نے سب دعائیں پڑھیں۔ لیکن اس نے مجھے اپنے آپکو نہ دکھایا۔ میں نے سُن رکھا تھا۔ مانگو۔ تمہیں دیا جائیگا۔ میں نے مانگا، مگر مجھے کچھ نہ ملا۔ لیکن شاید میں نے مانگنے کی بجائے اُس سے منہ موڑا ہے۔ پھر مجھے یاد آیا۔ لوگ کہتے ہیں۔ تم اُس سے ایک قدم پرے ہٹو۔ تو وہ تم سے ایک گز پرے ہٹ جائیگا۔ مجھے اس پر اعتقاد اور ایمان نہ تھا۔ لیکن میں دعا میں مشغول رہا۔ لیکن اس نے پھر بھی مجھے اپنے آپ کو نہ دکھایا۔

رجسٹرڈ ..... ایل نمبر ۲۴۸۲

۴۸۶

فہرست مضامین

جلد ۴ — بابت ماہ فروری ۱۹۳۱ء — نمبر ۲

تصاویر :- (۱) رسہ زنگی ، حریف تماشائی سے ...... (۲) خطرناک کھیل (وینس اور کیوپڈ) (۳) شاہی شطرنج - (۴) تعلیم نغمہ - (۵) بہارِ باغ - (۶) مسٹر محمد علی - (۷) مولینا محمد علی

ادبی دُنیا

کے متعلق

آنریبل سر شہاب الدین پریزیڈنٹ پنجاب لیجسلیٹو کونسل

کی

قابل قدر رائے

مجھے ادبی دنیا کے ساتھ ابتدا سے دلچسپی ہے، اس کی ترقی کی رفتار معاصرین کے لئے باعث رشک ہو سکتی ہے۔ یہ اردو ادب کا ایک معیاری رسالہ ہے بلکہ شاید یہ کہنا بیجا نہ ہو کہ اردو میں ایسا بلند پایہ رسالہ آج تک شائع نہیں ہوا۔ اس کے مفید متین اور بلند مضامین، اسکی ذوق پرور نظمیں، اس کے نتیجہ خیز افسانے، مشرق و مغرب کی زبانوں کے اقتباسات، رنگین اور دلکش تصویریں، اور پھر ارزانی یہی خصوصیات ہیں جنکی بنا پر یہ رسالہ اپنے تمام معاصرین سے بازی لے گیا ہے۔

اس کے مضامین عُریانی، حیا سوزی اور پست خیالی سے پاک ہوتے ہیں۔ اس لئے خواتین اور طلبہ کے مطالعے کے لئے بھی بہت موزوں ہے۔

تعلیمی محکموں کا اعتنا اور عام دلچسپی ان تمام باتوں کی شاہد ہے۔

شہاب الدین

حال وقال

یوپی کی "ہندوستانی اکیڈمی" نے انگریزی کی کسی کتاب کے اردو ترجمہ کا کام منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" اور چودھری جگت موہن لال رواںؔ ایم اے کے سپرد کیا ہے۔ معاصر نگار لکھنؤ اس انتخاب پر مطمئن نہیں۔ ہر شخص کو کسی خاص فرد کے متعلق رائے رکھنے کا حق حاصل ہے، لیکن نگار نے اس اختلاف کو اصولی رنگ میں پیش کرتے ہوئے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ ہندو انشا پرداز صحیح اردو لکھنے پر قدرت نہیں رکھتے۔

ہم اس خیال کی بزور تردید کرتے ہیں، نہ صرف تردید بلکہ اس پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ معاصر نگار کا یہ خیال حد درجہ غلط ہونے کے علاوہ شر انگیز بھی ہے۔

ربع صدی تک اردو کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھنے پر بھی اگر دیا نرائن نگم کو اس لئے صحیح اردو لکھنی نہیں آئی کہ وہ ہندو ہیں۔ تو پھر ہندو قوم کے ۲۲ کروڑ افراد کے منہ میں اردو زبان کو ٹھونسنے کا تمہیں کیا حق ہے؟

نیازؔ صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس قسم کے اشتعال انگیز خیالات کا اظہار کر کے وہ اردو زبان اور مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں کر رہے ہیں۔

منشی دیا نرائن نگم نے رسالہ زمانہ کے ذریعہ ملک میں اردو زبان کے بہت سے بلند رتبہ مصنف، شاعر اور ادیب پیدا کر دئے ہیں۔ اردو کے بے مثل اور بے حریف افسانہ نگار منشی پریم چند کا گہوارۂ شہرت زمانہ ہی تھا۔ درگا سہائے سرورؔ کی غیر فانی شاعری زمانہ ہی کے ذریعہ روشناس خلق ہوئی۔ جگت موہن لال رواںؔ کی رباعیات اردو لٹریچر میں نئی چیز ہے۔ اُن کا رنگ تغزل قابل صد تحسین ہے۔ اگر ہندوستانی اکیڈمی نے کوئی کتاب انہیں ترجمہ کرنے کے لئے دیدی ہے تو کوئی گناہ کبیرہ یا صغیرہ نہیں کیا۔

اردو کسی خاص قوم یا فرقے کی زبان نہیں نہ یہ دہلی لکھنؤ کے جغرافیہ میں نظر بند کی جا سکتی ہے۔ ہر شخص جو اس سے دلچسپی رکھتا ہے ملک کے ہر حصے میں کوشش کر کے اس میں مہارت حاصل کر سکتا ہے۔

ہندو اخبارات، ہندو رسائل اور ہندو اہل قلم کے ذریعہ جو اردو ادب کی خدمت ہو رہی ہے سچ تو یہ ہے کہ اردو کے کلمہ گو حامی اس کے لئے اتنے مفید نہ بن سکے۔

ہندوستانی اکیڈمی سر تیج بہادر سپرو کی نگرانی اور ڈاکٹر تارا چند کے اہتمام میں اردو ادب کی گراں مایہ خدمت انجام دے رہی ہے۔ اسے بدنام کرنے کی جا و بیجا کوششوں کو یک قلم بند کر دینا چاہیئے۔

ہم حضرت نیازؔ سے التجا کرتے ہیں کہ وہ خدارا اردو زبان کے تذکرہ میں ہندو مسلم سوال نہ اٹھائیں کہ اس سے اردو کے خلاف ضد آمیز جذبات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

اس نمبر میں سردار کرپال سنگھ بیدارؔ کی نظم "مہتاب" شائع کی جا رہی ہے۔ یہ ذہین و فطین لائق و فائق سکھ نوجوان کئی سال سے مشق سخن کر رہا ہے۔ مگر ضبط و استقلال دیکھئے کہ اس نے اپنے کلام کی اشاعت اس وقت تک پسند نہیں کی جب تک اسے اپنے کلام کی کامیابی دور ہونے کے متعلق یقین نہ ہو گیا۔ ملک کے مشہور اخبار نویس لالہ دینا ناتھ صاحب کی یہ رائے ہے کہ کرپال سنگھ بیدارؔ مستقبل قریب میں قابل رشک شہرت حاصل کر لیگا اور بہت سے مشہور شعرا سے تو اب بھی سبقت لے گیا ہے۔

گول میز کانفرنس کے پنجابی نمائندوں میں چودھری ظفر اللہ خاں صاحب بار ایٹ لا نے متعدد سب کمیٹیوں میں جس قابلیت، تدبر اور رواداری سے کام کیا ہے اُس کا اعتراف نہ کرنا ظلم ہوگا۔ اُن کی متین، مفید، فصیح اور قابلانہ تقریروں سے متاثر ہو کر مسٹر شاستری اور مسٹر سی وائی چنتامنی ایڈیٹر اخبار لیڈر الہ آباد نے بھی بغیر سابقہ تعارف کے نہایت بلند الفاظ میں اُنہیں خراج تحسین ادا کیا۔

چودھری صاحب نے اپنے ایک مخلص دوست کو جو مکتوب گرامی روانہ فرمایا ہے، وہ بہت دلچسپ ہے۔ اور ان کی گوناگوں مصروفیتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ چودھری صاحب کو ان باتوں کی

اشاعت کسی حال میں منظور نہیں۔ اور نہ ان کے مخلص دوست اسے گوارا کرتے ہیں کہ وہ چودھری صاحب کے ذاتی معتقدات کے خلاف، کوئی کارروائی کریں، پھر بھی ہم نے اس موقع پر استحصال بالجبر کو گناہ کبیرہ و صغیرہ سے خارج کر کے، جائز قرار دے لیا ہے، اور نہیں چاہتے کہ بعض ضروری باتوں سے عامۃ الناس کو آگاہ نہ کریں۔

چودھری ظفر اللہ خاں صاحب کی پہلوتہی اور انکار کے باوجود انہیں مرکزی اور صوبجاتی کمیٹیوں کی مشترکہ سب کمیٹی کا رکن منتخب کر لیا گیا۔ اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ محکمہ جات پر تفصیلی رپورٹ کرے کہ کوئی مرکزی محکمہ آئندہ صوبجاتی ہونا چاہیئے یا نہیں۔ اور اگر ہونا چاہیئے تو کس حد تک یہ مسائل ذرا پیچیدہ ہیں اور عام طور سے لیڈر ٹائپ، ان سے ذرا گھبرایا کرتا ہے۔ کمیٹی کے صدر لارڈ زیٹلینڈ تھے دوسرے ہی اجلاس میں ایک قانونی نکتہ میں الجھن پڑ گئی۔

بعض ممبروں نے کہا کہ اس پر قانونی مبصروں کی رائے حاصل کرنی چاہیئے۔ اس وقت اجلاس میں سر شفیع، سر سلطان احمد، سر چمن لال سیتلواد ڈاکٹر امبیدکار اور دوسرے جید اور فاضل قانون دان موجود تھے۔ فاضل صدر نے چودھری صاحب کی طرف اشارہ کیا اور کہا آپ اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔ چودھری صاحب موصوف نے اپنے فطری انکسار سے کام لیتے ہوئے جواب دیا کہ سر محمد شفیع مجھ سے زیادہ لائق اور تجربہ کار قانون دان ہیں، ان سے استصواب کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ چنانچہ سر محمد شفیع، سر سلطان احمد، سر سیتلواد اور مسٹر پیگ نے مسئلہ کی وضاحت کی کوشش کی۔ مگر پھر بھی لارڈ زیٹلینڈ کے نزدیک یہ مسئلہ تشنۂ تشریح ہی رہا۔ اس پر چودھری ظفر اللہ خاں نے اپنی خدمات پیش کیں۔ اور صدر کی طرف سے اجازت ملنے پر انہوں نے صرف پانچ منٹ میں اپنے مخصوص انداز میں مسئلہ کی وضاحت کر دی۔ چودھری صاحب کے طریق استدلال اور شستہ و رفتہ تقریر کی ہر شخص نے داد دی۔ اور راجہ نریندر ناتھ بے ساختہ کہہ اٹھے تم نے کمال کر دیا۔ شام کو مسٹر شاستری نے اپنے جذبۂ اخلاص کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "میں نے آپ کا جس قدر کام ان کمیٹیوں میں دیکھا ہے، اس سے میں نے یہ قطعی نتیجہ نکالا ہے کہ آپ نہایت ذکی اور ذہین ہیں۔"

چودھری ظفر اللہ خاں صاحب کی بے لوث خدمات، کامیاب مستقبل کا پتہ دیتی ہیں۔ ہم چودھری صاحب ممدوح کو ان کی خدمات کی مقبولیت پر مبارکباد دیتے ہیں۔

تاجور

'ادبی دنیا' علم و ادب کی جو خدمت کر رہا ہے، محتاج تشریح نہیں۔ اگر اپنی حقیقی خوبیوں پر فخر کرنا گناہ نہیں، تو 'ادبی دنیا' بھی بجا طور پر فخر کر سکتا ہے کہ زبان اردو کے لئے اس کا وجود آج ناگزیر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ 'ادبی دنیا' کے صوری و معنوی محاسن کا اعتراف اہل نظر کر رہے ہیں۔ اور جوں جوں اس کی خوبیاں ہمہ گیر ہو رہی ہیں، ہمارے خطرات کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اور ہم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے میں محتاط ہوتے جا رہے ہیں۔ 'ادبی دنیا' میں جو خامیاں ہیں ان سے بھی ہم بے خبر نہیں ـــ اور ان کے ازالہ کی پوری کوشش کر رہے ہیں مگر سچ تو یہ ہے کہ بے عیب ذات اللہ ہی کی ہے۔ وہ لوگ جو غیر معمولی طور سے سنجیدگی کا مظاہرہ کرنا اپنے بلند مقاصد زندگی کا ایک لازمی جزو سمجھتے ہیں، یہ اعتراض کرتے ہیں کہ 'ادبی دنیا' نے ظاہری اور صوری محاسن کو بہت اہمیت دے دی ہے۔ ہم اس کا جواب سوائے اس کے اور کیا دے سکتے ہیں کہ دنیا جب تک دنیا ہے، اور وہ روسو اور ہالبس کی "سلطنت سماوی" نہیں بن جاتی۔ 'ظاہر' اور 'صورت' کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ باقی رہے معنوی محاسن، تو اس کا ہم نے ہمیشہ خیال رکھا ہے اور ہم یقین دلاتے ہیں کہ ادارۂ ادبی دنیا کو اپنے معنوی احساس پر کسی سے کم بھروسا نہیں۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ادبی دنیا کے اجراء کا مقصد نہ تو تجارتی ہے۔ نہ جلب منفعت۔ 'ادبی دنیا' جس اولوالعزمی کے ساتھ اپنے ادبی پروگرام کو عملی جامہ پہنا رہا ہے۔ اس کا اعتراف اس کے وہ کرمفرما بھی کرتے ہیں، جو ہر مہینہ ہماری نوید شکست سننے کے لئے گوش بر آواز بیٹھے ہیں۔ اور یہ کہہ کہہ کر آج مایوس ہو چکے ہیں کہ "ادبی دنیا اگلے مہینے بند ہو جائیگا"۔ آج ادبی دنیا $5\frac{1}{2}$ ہزار روپے کا مقروض ہے۔ ہر مہینے اس کے بلند حوصلہ ایڈیٹر علامہ تاجور کی تین سو روپے ذاتی آمدنی ادبی دنیا پر صرف ہو جاتی ہے۔ مگر 'ادبی دنیا' کے عزم و استقلال میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ اور آج بھی وہ بلندیوں پر سے اپنے حریفوں کی باتوں پر مسکرا رہا ہے۔ علامہ تاجور کو ایک لمحہ کے لئے یہ گوارا نہیں کہ وہ قارئین ادبی دنیا یا قدر شناس پبلک کے سامنے صدائے استعانت بلند کریں۔ مگر کیا ادبی دنیا نے اس مختصر مدت میں علم و ادب کی جو خدمت کی ہے۔ وہ اس بات کی بھی مستحق نہیں کہ آپ اپنے حس فرض کو بیدار کریں اور سوچیں کہ آپ اس کے لئے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ ادبی دنیا جیسے رسالہ کے لئے ایک ایک، دو دو خریدار مہیا کر لینا کوئی دشوار کام نہیں۔ اگر ادبی دنیا کے قارئین ادھر تھوڑی سی توجہ کریں تو اس کی اشاعت بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ یہ کوئی منیجرانہ درخواست نہیں۔ دو سال کی مسلسل کشمکش اور جد و جہد کے بعد ادبی دنیا کی طرف سے اس قسم کی درخواست پیش کی گئی ہے۔ اور وہ بھی اس کے مدیر خصوصی علامہ تاجور کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ایسا کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ ہمیں یہ التجا پیش کر کے بات کھونے کا شکوہ پیدا نہ ہوگا۔ اگر ادبی دنیا کی خدمات کو خدانخواستہ آپ شائستۂ اعتنا نہ سمجھتے ہوں تو فرمائیے پھر زبان اردو کے مستقبل کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائے؟ اور کیوں مفت میں اپنی بیش بہا صلاحیتیں اس پر ضائع کی جائیں؟

ادارہ

آئینۂ عالم

مولینا محمد علی کی وفات

۴ر جنوری کو لندن سے چلی ہوئی تار برقی نے یہ خبر سنائی کہ مولینا محمد علی کا انتقال ہوگیا۔ آج اس واقعہ پر ہر ہندوستانی کا دل غم کی چوٹ کھا رہا ہے۔ اور اس شیدائے وطن کی درخواست پر مولینا محمد علی کے اعزہ نے یہ منظور کرلیا ہے کہ ان کی تجہیز و تکفین یروشلم میں ہو۔ چنانچہ ان کی میت یروشلم پہنچ چکی ہے۔ یروشلم میں مرحوم کی میت کا جس طرح استقبال کیا گیا وہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ مولینا محمد علی بین الاقوامی حیثیت کے مالک تھے۔ یہ اعزاز قابل فخر اعزاز ہے کہ مولینا محمد علی پیشوایانِ مذہب کے پہلو میں جگہ پائیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خدمت مولینا محمد علی کی ساری زندگی کا کارکن جذبہ تھا، وہ اتنا اعلیٰ تھا، اتنا استوار تھا۔ اتنا عام تھا۔ کہ ان کا آخری سانس بھی خدمتِ خلق میں گذر گیا۔ شخصی زندگی میں، خاندانی زندگی میں، سیاسیات میں، معاشرت میں، وہی ایک جذبہ خدمت ہمہ وقت کار فرما تھا ہمارے کاروبار زندگی کا سربراہ کار وہی ایک اعلیٰ جذبہ تھا جس نے مولینا محمد علی کو لاکھوں دلوں کا حاکم اور لاکھوں گھروں کا چراغ بنا دیا تھا۔ ان کا جذبہ خدمت وسیع تر میدان مانگتا تھا۔ بلند تر فضا ڈھونڈتا تھا۔ بہت کم با اقبال ایسے ہیں جو اپنی پبلک زندگی کے شباب میں انحطاط کا وقت آنے سے پہلے عین معرکہ کارزار میں کمر باندھے ہوئے چلے جائیں، اور زندگی کی پستی کا ایک قدم بھی ان کو اٹھانا نہ پڑے۔ کارساز حقیقی، ان کا ایسا کارساز تھا، جس نے ان سے آخر تک وہی ایک کام لیا جو دنیا کے بڑے بڑے اشخاص کا تمغۂ امتیاز ہوتا ہے۔ وہ ایک مجبور اور پست قوم کی تباہیوں میں پیدا ہوئے۔ اور قدرت کا یہ غیر معمولی کرشمہ تھا کہ اس عام پستی کی حالت میں بھی ان کی فطرت اسقدر بلند اور آزاد رہی۔ استقامت اور خلوص مولینا محمد علی کی تصویر حیات کا ایک فولادی فریم تھا۔ ان کی فطرت کے لاکھوں لطیف و نازک خط و خال، اس فریم میں اہل بصیرت کیلئے زیب نظر ہیں۔ ہندوستان آج اس لئے بھی ماتم کناں ہے کہ اس کا ایک جوہر کامل دنیا سے چل بسا۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ مولینا محمد علی کی روح کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

آل ایشیاٹک ایجوکیشنل کانفرنس

دسمبر کی آخری تاریخوں میں آل ایشیاٹک ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس پروفیسر رادھا کرشن کی زیر صدارت بنارس میں منعقد ہوا۔ تقریباً تمام ایشیائی ممالک سے نمائندے کانفرنس میں شریک ہوئے۔ چین اور جاپان کے نمائندوں نے کانفرنس میں کافی سرگرمی سے حصہ لیا۔ فن تعلیم کے مختلف نظریوں پر ماہرین تعلیم نے شرح و بسط سے روشنی ڈالی۔ "نمائشی تعلیم" اور "کارآمد تعلیم" کے نازک مسئلے پر دقت نظر کے ساتھ بحث کی گئی۔ غرضیکہ یہ اجتماع بحیثیت مجموعی کامیاب رہا لیکن ہمیں کانفرنس کے شرکاء سے شکوہ ہے کہ انہوں نے نظری مباحث کو زیادہ اہمیت دی، اور عملی باتوں کو بڑی حد تک نظر انداز کردیا۔ اس کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہ کانفرنس "آل ایشیاٹک کانفرنس" تھی، اور اس کا دائرۂ عمل بہت وسیع ہوگیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر کانفرنس عملی اور مقامی باتوں پر توجہ کرتی، تو اسے بہت سی الجھنوں سے دوچار ہونا پڑتا۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے محض نظری مباحث بھی غیر مفید نہیں ہوتے۔ اور قوموں کی ابتدائی نشو و نما میں بسا اوقات معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مگر کم سے کم ہندوستان کو فی الحال "نظری" سے زیادہ "عملی" ہونا چاہئے۔ صدر جلسہ نے اپنی صدارتی تقریر میں گلہ کیا ہے کہ ہندوستانی یونیورسٹیاں آزادی کی ظاہری علامات پر حد سے زیادہ توجہ دیتی ہیں اور اس کے باطنی عناصر سے غافل ہیں۔ نہ معلوم یہ کہاں تک صحیح ہے۔ ہمارے علم میں تو ہندوستانی یونیورسٹیاں اس معاملہ میں جناب صدر سے بھی زیادہ احتیاط سے کام لیتی ہیں۔

آل انڈیا مسلم کانفرنس

آل انڈیا مسلم کانفرنس کا اجلاس سر راس مسعود کی زیر صدارت بنارس میں منعقد ہوا۔ کانفرنس میں حسبِ دستور بہت سی مفید تجویزیں

منظور کی گئیں ہمیں بڑی مسرت ہوئی کہ اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم کے پیچیدہ اصولی مسائل کی طرف یہاں بھی کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ خدا کرے اس کانفرنس میں رزولیوشنوں اور تقریروں کے سوائے کسی اور چیز کی بھی گنجائش نکلے۔

صدر کانفرنس کے قابل قدر خطبے میں بعض فقرے ایسے ملتے ہیں جسے کانفرنس کے سخن فہموں نے تو سراسر بیت سمجھا ہوگا لیکن ممکن ہے بطن شاعر میں یہ معنی سے خالی نہ ہوں۔

ہمیں امید ہے کہ مسلم کانفرنس اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی کوشش کرے گی۔ کانفرنس کی دوسری تجاویز میں یہ تجویز ہمارے نزدیک بہت اہم ہے کہ دہلی میں مسلم لڑکیوں کے لئے ایک کالج قائم کیا جائے۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ تجویز تشنۂ عمل نہیں رہے گی۔

آل ایشیاٹک ومنز کانفرنس

جنوری کے آخر میں لاہور میں خواتین ایشیا اور خواتین ہند کی دو اہم کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ ان دونوں کانفرنسوں کی تقریروں میں تعلیم نسواں اور نسوانی زندگی کی عام اصلاح پر زیادہ زور دیا گیا اور اس حد تک یہ کانفرنسیں اپنے مقاصد میں ضرور کامیاب ہوئیں۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ بعض تقریروں میں عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ مساوات صنفی کی خواہش کی وجہ سے بالکل بگاڑ دیا گیا۔ ہماری مصلح خواتین کی یہ خواہش کہ عورتوں کو وہی تعلیم دی جائے جو لڑکوں کو دی جاتی ہے۔ (خواہ وہ تعلیم بذات خود ناقص ہو) بہت عجیب ہے۔ مغرب میں بعض معلمات کا یہ خاص مقصد رہا ہے۔ کہ لڑکیوں کو اس قسم کے علوم پڑھائیں جو ان کے ہم جماعت لڑکوں کو پڑھائے جاتے ہیں۔ اور انہوں نے اس خیال کی ہمیشہ مخالفت کی کہ لڑکیوں کی تعلیم میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہونی چاہئیں جو انہیں ماں کے فرائض ادا کرنے کے لئے تیار کریں ہمیں امید ہے کہ ایشیا اور ہندوستان کی مصلح خواتین اس خیال سے ہمیشہ اجتناب کریں گی۔

ہمیں مسرت ہے کہ خواتین ہند کی کانفرنس نے بعض ضروری اصلاح کی طرف بھی توجہ مبذول کی ہے۔ مثلاً صغر سنی کی شادیوں کے انسداد پر اس نے پورا زور دیا ہے۔ ہم کانفرنس کے کارکنوں کو ان کی ان کوششوں پر مبارکباد دیتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ایشیائی خواتین کے اتحاد سے عورتوں کے لئے کوئی بہتر راہ عمل تلاش کی جا سکے گی۔

گول میز کانفرنس

لندن میں گول میز کانفرنس کے اجلاس ختم ہو چکے ہیں۔ اور ہندوستانی نمائندے بہت جلد واپس آنے والے ہیں۔ ہمیں کانفرنس کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرنے سے پہلے، ان مشکلات کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔ جن کا اسے مقابلہ کرنا پڑا۔ آج ہندوستانی مندوبین یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ ان کا فرض ادا ہو گیا۔ اور وہ اپنے ساتھ برطانیہ کا اعتماد اور یکجہتی و نیک نیتی کا پیغام لے کر آ رہے ہیں۔ برطانوی مدبرین سے جو کچھ ہو سکتا تھا انہوں نے ہندوستان کے لئے کیا۔ اب اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہونا چاہیئے کہ ہندوستان ضائع شدہ مملکت بن گیا ہے۔ ہم جائز طور پر کہہ سکتے ہیں کہ کانفرنس کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فرقہ دار اختلافات کے صرف چند نکات حل ہوئے، اور بہت سے تاریکی میں پڑ گئے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ حکومت برطانیہ کے ارباب بست و کشاد نے اگر اس کام کو جیسے انہوں نے شروع کیا ہے، جاری رکھا تو مسائل کا تصفیہ دشوار نہ ہوگا۔ اب یہ ہندوستانیوں کا کام ہے کہ وہ اس بنیاد پر جو حکومت برطانیہ نے رکھی ہے، مضبوط عمارت تیار کریں۔ فیڈریشن پر عام اتفاق، کوئی معمولی بات نہیں۔

ہمیں امید ہے کہ کانفرنس کے کام میں دو تین مہینے تک اس قدر حمایت حاصل ہو جائیگی کہ دستور اساسی کا مسودہ تیار کرنے کے لئے ماہرین کی کمیٹیاں بنانی ممکن ہو جائینگی۔

حضرت خواجہ حسن نظامی کی کتابوں کے متعلق جو رعایتی قیمت کا اعلان کیا گیا تھا۔ خواجہ صاحب اس سے متفق نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اُن کی کتابوں کی قیمت پہلے ہی سے بہت کم رکھی گئی ہے۔ ہم نے جو اُن کی مفید تصانیف کا انتخاب کر کے اشتہار دیا تھا اُن میں ہر ایک کتاب ہر قیمت پر حاصل کرنے کے قابل ہے۔

(ادارہ)

تقریب

تاریخ اور وقت:- تاریخ سید حسن برنی کا خاص موضوع ہے۔ اور جس دقت نظر اور اصابت فکر سے وہ تاریخ کے مختلف پہلوؤں اور نقطہائے نظر سے بحث کرتے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔

ایثارِ محبت:- اس سے پہلے حضرت فاخر او ہنری کے ایک افسانے کا ترجمہ کر چکے ہیں، جو ادبی دنیا میں راہب کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ ہم کسی گذشتہ اشاعت میں او ہنری کی اس نادر خصوصیت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ اس کے افسانوں کا انجام غیر متوقع لیکن دلفریب ہوتا ہے۔ یہ افسانہ او ہنری کی اس خصوصیت کی بہترین تصویر ہے۔ افسانہ نگار نے صنعت کے سب سے روشن پہلو یعنی "تضاد و تقابل" اور غیر محسوس طنز سے کام لیا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ اور لکھنا گویا افسانے کے لطف کو ضائع کرنا ہے۔

طوفانی رات:- ٹیگور کے ایک افسانے کا ترجمہ ہے۔ ٹیگور کی تعریف کون کر سکتا ہے۔ وہ ایسا عظیم الشان صناع ہے کہ اس کے موئے قلم کی ایک لطیف جنبش سے ایک روشن و تاباں تصور حیات نمودار ہو جاتی ہے۔ طوفانی رات ایک تصویر ہے جسکی بیک گرونڈ (Back ground) تیز و تند ہواؤں، مینہ کی چھینٹوں سے ملکر بنی ہے۔ اس فضا میں ایک افسانہ محبت ایک ارمان تکمیل تک پہنچتا ہے۔ فطرت کے مظاہر اور انسان کے جذبات کی ہم آہنگی کمال تک پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہ عشق کا جنوں طوفان کے چڑھنے کے ساتھ بڑھتا ہے اور طوفان کے فرو ہونے کے ساتھ فرو ہو جاتا ہے۔ وحدت و تناسب کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔

چچی کا خط:- جناب سید خیرات علی زیدی ادبی دنیا کی بزم میں نو وارد ہیں۔ مقام مسرت ہے ان کی پہلی چیز جو ادبی دنیا میں شائع ہو رہی ہے "مزاحِ لطیف" سے تعلق رکھتی ہے۔ ظرافت کے علمبرداریوں تو بہت انشا پرداز ہیں لیکن کامیاب ظریف وہی ہے جو اپنے دامن کو ابتذال سے بچا کر رکھے فاضل مضمون نگار نے ابتذال سے بالکل پرہیز کیا ہے۔

پٹنہ لائبریری:- جناب سید بادشاہ حسین کا نہایت مفید مضمون ہے۔ پٹنہ لائبریری اپنے مخطوطات کے لئے مشہور ہے۔ سید صاحب موصوف نے اس لائبریری کے گرانقدر نسخوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس مفید مضمون کے لئے ہم ان کے ممنوں ہیں۔

ٹھگ بنانے کی رسم:- کرنل میڈوز ٹیلر کی مشہور عالم کتاب "ایک ٹھگ کے اعترافات" کے ایک دلچسپ باب کا ترجمہ ہے۔ اور کامیاب ہے۔

دکنی مرثیہ گو:- مولینا نصیر الدین ہاشمی کے گراں پایہ اور مفید مضمون کی آخری قسط ہے۔ امید ہے کہ یہ آخری قسط ان کے عواطف کی آخری قسط ثابت نہیں ہوگی اور ان ادبی نوازشوں کا سلسلہ بدستور جاری رہیگا۔

"شباب": مولینا عبد الباقی نے سعدی کے مقولے "جوانی چناں کہ افتد دانی" کی ایک بلیغ تشریح کی ہے۔ اس سے زیادہ لکھنے کی رسوم صحافت اجازت نہیں دیتیں کہ وہ ادارت کے ایک رکن ہیں۔

ساقی کا انجام:- شاعر کے عمل تخیل کے متعلق ایک افسانہ ہے۔ جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیائے تخیل کے رہنے والے دنیائے عمل کے لئے موزوں نہیں۔ جناب عابد کا مخصوص انداز اس میں نمایاں ہے۔

عابد - فاخر - بیدار - وقار کے تخیل کی رعنائیاں عجیب بہار دے رہی ہیں۔ عابد کی غزل میں ایک خاص لطف، ایک خاص وجدان سلیم کا پتہ ملتا ہے۔ فاخر اپنے خاص پیغام کو جس انداز میں پیش کرتے ہیں وہ کچھ انہی کا حصہ ہے۔

ادارہ

تصحیح

اَقَلِیَّت

آجکل میجارٹی اور مینارٹی کے معنی ہیں اکثریت اور اقلیت کے الفاظ سیاسی بحثوں میں اکثر بولے جارہے ہیں۔ مگر بولنے والے حضرات عموماً اقلیت کے صحیح تلفظ سے بے خبر ہیں۔

مروجہ غلط تلفظ یہ ہے

اق۔لیَت ۔ جمع ۔ اق لیتیں

اقلیت کے صحیح تلفظ میں ل اور ی پر تشدید ہے۔

اَقَل لی یَت جمع ۔ اقَل لی یَتیں۔

اَقَلّیَّت

جمع اَقَلّیّتیں

تاجور

خطرناک کھیل

وینس اور کیوپڈ

لئے بیٹھی ہے "وینس" گود میں دل بند کو اپنے
بہت خوش ہو رہی ہے دیکھ کر فرزند کو اپنے

محبت پل رہی ہے حسن کی آغوشِ رنگیں میں
تمنا پھل رہی ہے حسن کی آغوشِ رنگیں میں

یہ اُن خطروں سی واقف ہی جو وابستہ ہیں "کیوپڈ" سے
اُن اندیشوں سی واقف ہی جو وابستہ ہیں "کیوپڈ" سے

کئے جاتی ہے پھر بھی پرورش اس برق پارے کو
ہوا دیگا جو اک دن آتشِ غم کے شرارے کو

سمجھتی ہے کہ یہ بچہ حسینوں کو رُلائے گا
جہاں کے ماہ پاروں مہ جبینوں کو رُلائے گا

جہانبانوں کو اوجِ تختِ شاہی سی اُتارے گا
کمالِ آدمیت اس کے آگے دم نہ مارے گا

حسین شہزادیوں سے بھیک منگوائے گا یہ بچہ
"گُلوں" سے جنگلوں کی خاک چھنوائے گا یہ بچہ

یہ مسجودِ ملائک کا مقدس سر جھکا دے گا
بنی آدم سے اس فردوسِ ارضی کو چھڑا دے گا

جہاں دنیا میں ہوگا حسن - کیوپڈ بھی وہیں ہوگا
پریشاں اس کے ہاتھوں ہر حسین و نازنیں ہوگا

ستم یہ ہے نظر آتا نہیں کیوپڈ کو - اندھا ہے
نہ رکھیگا تمیز نیک و بد کوئی - یہ خطرہ ہے

حسین "وینس" کی خواہش ہے نہ ہو مجھ سا حسیں کوئی
کرے دعویٰ جمال و حسن کا کیوں نازنیں کوئی

غرورِ حسن ہو جس کو سنبھالے گا اُسے "کیوپڈ"
مری اقلیمِ عالی سے نکالے گا اُسے "کیوپڈ"

وہ خوش ہوتی ہے یہ کہہ کر "محبت کا فرشتہ" ہے
یہ ماں کے کام آئے گا - سعادت کا فرشتہ ہے

مگر "وینس" ابھی تک ایک خطرے سی ہی ناواقف
کہ محرومِ بصر بچہ ہو نیک و بد سے کیا واقف

کسی دن عشق کے دل دوز تیروں کی انی ہوگی
اسی بچے کے ہاتھوں جانِ مادر پر بنی ہوگی

اسی کے سامنے آئیگا جو اس کا کیا ہوگا
کہاں جائیگی "وینس"؟ کیا کریگی؟ آہ کیا ہوگا؟؟

وقار (انبالوی)

تنقیدِ شعری

غمِ آرزو کا حسرتؔ سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

حسرتؔ نے ایک شعر میں اپنے اندازِ تحریر کی طرف نہایت لطیف طریقے میں اشارہ کیا ہے۔

رنگینیٔ سخن میں بھی ہے سادگی کی شرط + مشکل ہے اِس فریضۂ آساں کی احتیاط

اِس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ حسرتؔ سلاستِ بیان اور شیرینیٔ انداز کا دلدادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں اکثر ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں حیات کے اکثر رموز اس طرح بے نقاب کئے گئے ہیں کہ موضوع کی گراں باری الفاظ کو بہت کم متاثر کرتی ہے۔ اِس اعتبار سے حسرتؔ کو ایک عدیم المثال صناعانہ حیثیت حاصل ہے کہ اس کی تحلیل و تشریحِ جذبات کا تصور ہمیشہ شاعرانہ تخیل کے زیرِ اثر ایک لطیف چیز بن جاتا ہے۔ وہ حکیمانہ و فلسفیانہ رنگ جو دورِ حاضر کے اکثر شعرا میں پایا جاتا ہے۔ حسرتؔ میں بالکل مفقود ہے۔ ظاہر ہے سائنس اور فلسفے کے حقائق کا استعمال شعر میں جائز ہے لیکن اسی حد تک کہ اس میں احساس کے عناصر شامل ہوں۔ حسرتؔ جس حقیقت کو چھوتا ہے اسے حقیقتِ شعری کا رنگ دے دیتا ہے۔ کسی فارسی شاعر نے شاید حسرتؔ ہی کے لئے کہا تھا۔

در دلِ ما غمِ دنیا غمِ معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

مندرجہ بالا شعر میں شاعر ایک حقیقتِ ثابتہ کا اظہار کرتا ہے۔ غیر شاعرانہ رنگ میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا جائیگا کہ مقصد کے حصول کے لئے کوشش اور ہمت شرط ہے۔

اس حقیقت کو حسرتؔ نے دائرہ عاشقی میں داخل کر کے ایک نیا رنگ دیا ہے۔ زندگی کی ناکامی کو غمِ آرزو کہکر پہلے حقیقت میں احساس کا شرارہ پیدا کیا۔ اس کے بعد "سبب اور کیا بتاؤں" کہکر مایوسی اور ویرانی کی تصویر کھینچی۔ پھر دوسرے مصرعے میں اپنی حیاتِ عاشقی کی تفسیر کی۔

مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

دوسرے مصرعے کے معانی اسقدر وسیع ہیں کہ تصور ان کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ اس عاشق کا تصور کیجئے جس کا ذوقِ دیدار کسی طرح تسکین نہیں پاتا۔ جس کی آرزو غیر فانی ہے۔ غیر محدود ہے جسکا شوق بیکراں ہے۔

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں + مانا کہ ترے رخ سے نگہ کامیاب ہے

اور اس شوق و ذوق۔ اس جنون و آرزو کے باوجود اسکی ہمت پست ہے۔ اس میں قوتِ عمل مفقود ہے۔ بمقصد کے حصول کے لئے قربانی نہیں کرسکتا۔ ان دو چیزوں یعنی بلندیٔ شوق ــــ و پستیٔ ہمت کا لازمی نتیجہ کیا ہوگا۔ غمِ ناکامی۔ اور اس غم کو شاعر نے غمِ آرزو کہا ہے۔ یوں تو آرزو کا لفظ بہت سے وسیع معانی کا حامل ہے۔ لیکن اس جگہ جس خوبی سے استعمال کیا گیا ہے وہ حسرتؔ ہی کا حصّہ ہے۔

پھر اِس صناعیٔ کمال سے قطع نظر دوسرے مصرعے میں شاعر نے جس لطیف انداز میں ہمت اور شوق کے معانی میں فرق ظاہر کیا ہے اسکی تعریف نہیں ہوسکتی۔ شوق اور ہمت گویا عمل اور تخیل کے آئینہ دار ہیں۔ شوق ایک بہشتِ تخیل ہے جو شاعر نے اپنے لئے تیار کی ہے۔ اس کے جگمگاتے ہوئے ایوانوں میں وہ حسن و جمال کے نظاروں سے کیف اندوز ہو رہا ہے۔

ہمت وہ قوتِ عمل ہے جو شاعر میں مفقود ہے۔ اسی قوت کے فقدان نے آخر تخیل کے رنگین و درخشاں محل کو ایک مشتِ خاک بنا دیا ہے۔ اور شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ

غمِ آرزو کا حسرتؔ سبب اور کیا بتاؤں

سچ تو یہ ہے کہ حقائق کا شاعرانہ استعمال ایک بہت مشکل فن ہے اور بہت کم لوگ اس فن کے ماہر ہیں۔ لیکن حسرتؔ کو بلا خوفِ تردید اس فن کا بہترین ترجمان کہا جا سکتا ہے۔

عابد

تاریخ اور وقت

(۱)

ماہ وسال کا تعین

(۱)

وقت کیا ہے؟

کیا وہ محض ایک ذہنی تصوّر ہے، اور صرف ایک خیال؟

یا وہ اپنا ذاتی اور خارجی وجود بھی رکھتا ہے؟

اُس وجود کی کیا نوعیت ہے؟

آیا وہ حادث ہے، یا قدیم، ازلی و ابدی ہے، یا حادث و فانی؟

یہ بحث پُرانی ہے، اور فاضل اجل ابوریحان البیرونی کے الفاظ میں "نہایت دقیق، جس کے متعلق سخت اختلافات ہیں، یہاں تک کہ بعض اُس کے وجود کے بھی منکر ہیں، اور بعض اُسے جوہر قایم بالذات مانتے ہیں"[1]

خود ہمارے زمانہ میں زمان و مکان کی بحثوں میں آئنسٹن کے مہتم بالشان علمی نظریوں نے ایک بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

جہاں حکیم و مفکر قدیم سے اب تک اس طرح سرگرداں ہوں، وہاں مورخ کے لئے کیونکر ممکن ہے کہ وہ انہیں طے کرنے کا ذمہ لے سکے۔ نہ فی الواقع اُسے اس کی چنداں ضرورت ہے۔

جس وقت سے مورخ کو کام لینا پڑتا ہے، اور جس پر تاریخ کی بنیاد ہے۔ وہ اُس کی نظر میں ایک زندہ حقیقت ہے۔

وقت کی دو نوعیتوں میں قدیم سے فرق کیا جاتا ہے (بعض اہل فکر اسے بھی نہیں مانتے)۔ ایک "زمان" جو شمار میں آسکتا ہے۔ اور ایک وہ "مدت" (یا "دہر" جس سے لفظ دہریہ ماخوذ ہے) جس کی نہ ابتدا ہے، نہ انتہا[2]

تاریخ کو اُسو قت سے تعلق ہے، جو شمار میں آسکتا، اور ابتدا و انتہا رکھتا ہے۔

(۲)

ایک زمانہ تھا، جب انسان وقت کا شمار پورے طور پر نہ جانتا تھا۔ قدرت کے کچھ مناظر وقتوں کے اندازے اس کے سامنے پیش کرتے رہتے تھے۔ انہی سے وقت کا شمار آدمی نے سیکھا، اور کچھ خود نکالا۔

ہر روز آفتاب عالم تاب طلوع و غروب ہوتا، اور روز روشن اور شب تاریک کا تماشا ہوتا رہتا ہے۔

یہ منظر شروع سے انسان کے سامنے تھا۔ اور ہر روز اُس کی نظر سے گذرتا تھا۔

اسی طرح ہلال نمودار ہو کر بڑھتا گھٹتا اور چھپ جاتا، اور پھر ہلال نو کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا۔

اور موسم اور فصلیں بھی بدلتی، اور پلٹتی رہتی تھیں۔

انسان اُن چیزوں کو دیکھتا تھا۔ وہ انہیں ابھی ٹھیک طرح سے نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن وہ انہیں دیکھ کر تعجب کرتا اور غور کرتا تھا۔ اُسے ان کے پس پردہ پُر اسرار قوتیں کام کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ اُن سے ڈرتا تھا۔ اُنہیں راضی رکھنا چاہتا تھا، اور اُنہیں پوجتا تھا۔

وہ اُن کے متعلق جو توہمات رکھتا تھا، وہ اُس کی نظر میں یقین اور مذہب کا پایہ رکھتے تھے، اور جن طریقوں سے وہ انہیں خوش کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی عبادت تھی۔

(۳)

انسان اپنے ماضی اور مستقبل پر ہمیشہ سے نظر ڈالتا رہا ہے۔ وہ

---

[1] کتاب الہند ج ۳۲ ص ۱۶۳

[2] ان معنی میں وقت کی یہ دونوں اصطلاحیں یعنی "زمان" و "مدت" (یا دہر) ہم نے البیرونی سے لی ہیں۔

اپنی پچھلی باتیں اور پچھلے کام یاد کرنے اور آئندہ کی فکر رکھنے کا عادی ہے۔

وہ ان دونوں باتوں پر مجبور ہے۔ ہمارے موجودہ کاموں کی بنیاد پچھلے کاموں پر ہے، اور ہمارے موجودہ کام آئندہ کے لئے ہوتے ہیں۔

وقت کا دریا ہمیشہ بہتا رہتا ہے۔ ہر سانس جو گذر چکا ماضی ہے۔ بلکہ جو سانس ہم لیتے ہیں، اس کا ایک سرا حال میں ہے تو دوسرا ماضی میں۔

اس طرح ماضی، حال و مستقبل ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ بلکہ محض ایک نقطۂ نظر کا نام۔

جو ہمارے لئے ماضی ہے وہ کبھی دوسروں کے لئے حال تھا، جو ہمارے لئے حال ہے وہ خود ہمارے اور دوسرے بعد میں آنیوالوں کے لئے ماضی ہوگا، اور جو ہمارے لئے کامل طور پر مستقبل ہے یعنی جسے ہم کبھی نہ پاسکیں گے، وہ آنے والوں کے لئے حال اور ماضی ہوگا۔

پچھلی باتوں اور آنے والوں کاموں کے حساب کیسے لگائیں جائیں، یہ سوال انسان کے سامنے تھا، اور اُسے حل کرنے کے لئے اس نے وقت کو بانٹا۔

دن، مہینوں، سال کی تقسیم تو مظاہر قدرت کی مدد سے کی، اور ہفتوں گھنٹوں، گھڑیوں، پلوں اور بعض دوسری تقسیموں کو خود بنایا۔

(۴)

وقت کی یہ تقسیمیں ہمارے اتنی معمولی چیزیں ہوگئی ہیں، کہ ہمیں کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ کہ ان سب کو قائم کرنے میں انسان نے کتنا وقت لیا۔

دن کا اندازہ جو شب و روز سے ملکر ہوتا ہے، آدمی کو ہمیشہ سے تھا۔ اور چاند کے حساب سے مہینے کا تعین بھی سہل تھا۔

تجربہ سے یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ ۳۵۴ دنوں میں چاند کے بارہ مہینے پورے ہو جاتے ہیں۔ اور اس مدت میں تقریباً ایک برس کی تمام فصلیں اور موسم ختم ہو جاتے ہیں۔

اسی وجہ سے بارہ کی تعداد مقرر ہوئی۔ اسے کئی ہزار برس پہلے سرزمین بابل کے لوگوں نے قائم کیا، اور سال کے پورے مہینوں کی تعداد انہی سے ہم تک پہنچی ہے۔

قمری مہینے سہل اور قدرتی سہی، لیکن کاروبار میں ان سے پورے طور پر کام نہیں چل سکتا۔

طبیعی سال قدیم نظریۂ گردش شمسی کے وجہ سے، جو سورج کا زمین کے گرد گھومنا مانا تھا، سال شمسی کہلاتا ہے، لیکن فی الواقع زمین کے سورج کے گرد گھومنے کی وجہ سے، ارضی سال کہلائے جانیکا زیادہ مستحق ہے، یہ سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ ۴۶ سکنڈ کا ہوتا ہے۔

اس طرح قمری اور شمسی سالوں میں تقریباً ۱۱ ¼ دن کا فرق رہ جاتا ہے۔ موسموں اور فصلوں کا حساب قمری مہینوں سے ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ اور قمری مہینے ان سے ہمیشہ مطابقت نہیں کھا سکتے۔ بلکہ وہ کبھی کسی موسم میں اور کبھی کسی موسم میں گھومتے رہتے ہیں۔

کاروبار میں اس سے کافی دشواری پیش آتی ہے جو بالکل ظاہر ہے۔

(۵)

سرزمین بابل کے رہنے والے ہیئات و نجوم کے اُستاد سمجھے جاتے ہیں، ان علوم کے متعدد انکشافات اُن سے منسوب ہیں۔

لیکن سال شمسی کی تخمینی مقدار دریافت کرکے اُسے اپنی تقویم میں کام میں لانے کا فخر اہل مصر کو حاصل ہے۔

اہل بابل نے اپنی قمری تقویم کو کبھی ترک نہیں کیا۔ اور اُن کے اقتدار میں تمام سامی قوموں میں اس کا رواج رہا۔

نسل انسان نے اپنی تقویم کے لئے سال شمسی اختیار کرنے میں کتنی مدت لی! علمائے مصریات کا خیال ہے کہ مصر میں تقویم شمسی کا آغاز مسیح سے ۴۲۴۱ برس پہلے ہوا۔[1]

یہ انکشاف تاریخ کا پہلا واقعہ ہے، جس کی تاریخ مقرر کی جاسکتی ہے۔ یہ ایک عظیم الشان علمی انکشاف تھا، جو مصریوں سے ہمارے ورثہ میں پہنچا ہے۔

اُس کے دریافت کرنے والے یا رواج دینے والے کا نام، قدیم دنیا کے بہت سے گمنام محسنوں کی طرح ہمیں معلوم نہیں۔ لیکن اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی نسل انسان کا ایک بہت بڑا محسن تھا۔

قدیم مصر کے اہل علم اس سے آگے نہیں بڑھے۔ وہ سال شمسی کی کسر زائد جو چوتھائی دن سے کم ہے معلوم نہ کر سکے۔ اور ان کی تقویم شمسی کا حساب ۳۶۵ دنوں سے چلتا رہا۔

تیسری صدی عیسوی کے ایک لاطینی مصنف سنسوری نوس کا بیان

---

[1] جرمن مؤرخ میئیر اور امریکن مؤرخ بریسٹیڈ دونوں اس تاریخ پر متفق ہیں۔ (برنی)

ہے کہ مصری سال اُس کے زمانہ میں سال شمسی سے ۱۰ مہینے پیچھے تھا۔ اسی اطلاع سے علماءِ مصریات نے مصری سال کا آغاز معلوم کیا ہے۔

(۶)

اسی طرح بہت سی صدیاں گذر گئیں، اور یونانیوں کا زمانہ آیا۔ انہوں نے علوم کے اکثر مبادیات اپنے پڑوسی قدیم مشرقیوں یعنی مصریوں اور بابلیوں سے لئے۔ لیکن انہوں نے اُن کو ترقی دے کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

وہ بہت سے علوم عقلیہ و حکمیہ میں ہمارے معلّم ہیں۔

سرزمین مصر کو یہ دوسرا فخر بھی حاصل ہے کہ سال شمسی کی اُس زمانہ تک کی بہترین مقدار بھی وہیں دریافت ہوئی۔

البتہ اس مرتبہ قدیم مصریوں کے ہاتھوں سے نہیں، بلکہ یونانیوں کے ہاتھوں سے، جو اسکندر اعظم کی فتح کے بعد سے مصر میں حکومت کرتے تھے، اور اُن کا دار السلطنت اسکندریہ علم و حکمت کا مرکز بنا ہوا تھا جس کے کارناموں کی صدائے بازگشت آج تک گونج رہی ہے۔

ابرخس (Hypparchus) نے مسیح سے ڈیڑھ سو برس پہلے اور بطلیموس (Ptolemy) نے اس کے کچھ عرصہ بعد سال شمسی کی مقدار معیّن کی جو اُن کے حساب سے ۳۶۵ دن ۵ ساعت ۵۵ دقیقہ ۲۰ ثانیہ تھی[1]

یعنی ابھی تک اُس میں تقریباً سات دقیقے کا فرق تھا۔

(۷)

قدیم مصریوں کے علاوہ متمدن قوموں میں اہلِ ہند اور چینیوں نے بھی سال شمسی کی مقدار معلوم کرنے میں دلچسپی لی۔

۲۳۵۰ ق م میں اُن کے ایک بادشاہ کے، جس کا نام یاؤ بتایا جاتا ہے، عہد میں سال شمسی کی مقدار ۳۶۵ ¼ دن دریافت ہوئی۔ اور اُس پر چینی تقویم کو مبنی کیا گیا[2]

اہلِ ہند کی کتب ہیئات کے نتائج پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سال شمسی کی مقدار ۳۶۵ ¼ دن سے قدرے زاید جانتے تھے۔

[1] یہ مقدار ہم نے برجندی کی شرح زیج الغ خانی کے ایک قلمی نسخے سے لی ہے، جو ہمارے کتب خانہ میں موجود ہے۔

[2] دیکھو "تاریخ ہئیات" مصنفہ فاربس مطبوعہ ۱۹۰۹ء ص ۹
History of Astronomy by George Forbes.

قدیم تاریخ ہند کے اکثر واقعات کی طرح یہ بتانا دشوار ہے۔ کہ سب سے پہلے اس سرزمین پر یہ انکشاف کب ہوا۔ اور اس کی عزت کسے حاصل ہے۔

لیکن جن کتب ہیئات مثلاً سورتی سدھانت، پراش سدھانت، اور پولس سدھانت میں سال شمسی کی مقدار ۳۶۵ دن ۶ ساعت اور بارہ دقیقے سے کچھ کم زائد بتائی گئی ہے وہ پانچویں یا چھٹی صدی قبل مسیح کی معلوم ہوتی ہیں۔

بعد کی کتب ہیئات، مثلاً آریہ سدھانت (مصنفہ ۴۹۹ء) اور برہم سدھانت، سدھانت شرومنی (۱۱۵۰ء) میں بھی خفیف اختلافات کے ساتھ اسی اندازہ کو مانا گیا ہے[3]

(۸)

یونانیوں اور رومیوں کے بعد دنیا کے علم و حکمت کو مسلمانوں نے زندہ کیا۔ جنہوں دنیا کی بہت سی قدیم قوموں، بالخصوص یونانیوں، ہندوؤں اور ایرانیوں سے، جن کے علمی آثار اُن تک پہنچ سکے، استفادہ کیا۔ لیکن انہوں نے ہر علم کو جو اُن تک پہنچا، آگے بڑھایا، اور دنیا کو بہت سا قدیم علمی سرمایہ بیش قیمت اضافوں کے ساتھ، اُن کے ذریعہ سے پہنچا۔

ہیئات میں انہوں نے ابتدا میں یونانیوں اور ہندوؤں سے درس لیا۔ لیکن انہوں نے اس علم کو بھی ترقی دی اور اپنے نظری اور عملی تحقیقات کے چمکتے ہوئے نتیجے چھوڑے۔

چنانچہ سال شمسی کے متعلق جو تحقیق انہوں نے کی وہ جدید ترین تحقیقات کے نہایت قریب پہنچ جاتی ہے۔

ان سب کا تذکرہ بیحد دلچسپ، لیکن تفصیلات کا محتاج ہے۔ جسے ہم عنقریب ایک مستقل مضمون کا مبحث قرار دینا چاہتے ہیں[4]

یہاں اتنا بتا دینا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بہترین نتیجہ رصد ملک شاہی ہے جس کے مہتمموں میں عمر خیام کا نام خاص طور پر مشہور رہا ہے۔ اور رصد ایل خانی کا، جس کے نگراں نامور محقق نصیر الدین طوسی اور چند دیگر علمائے ہیئات تھے۔

[3] اہلِ ہند کے متعلق یہ معلومات ہم نے اطالیں مستشرق نالینو کی زیج البتانی کے لاطینی ترجمہ و حواشی صفحہ ۲۰۶ سے لی ہے۔ دیکھو۔
Albattani; Opus astronomium Latin versum. a. C. A Nallino, Roma, 1903

[4] مسلمانوں کی تحقیقات سال شمسی کے متعلق تمام مفصل بحث اور نقد و تبصرہ بھی اسی مضمون میں ہوگا۔ (بر.نی)

اُن دونوں رصدوں کے رو سے جن میں سے پہلی پانچویں صدی ہجری کے نصف دوم میں اور دوسری چھٹی صدی ہجری کے نصف دوم میں انجام پائی یعنی سال شمسی کی مقدار ۳۶۵ دن ۵ ساعت، اور ۴۹ دقیقہ تھی، جس میں موجودہ تحقیقات سے صرف ۱۴ ثانیہ کا فرق ہے۔

رصدمراغہ کے شرکا و کار میں ایک اندلس کا رہنے والا عالم محی الدین المغربی (یحییٰ ابن محمدؐ بن ابی الشکرؔ) بھی تھا، جو حلب کی لڑائی میں ہلاکو کے ہاتھ پڑ گیا اور جان بخشی کے بعد مراغہ بھیجدیا گیا تھا۔

اس اندلسی عالم کی جداگانہ تحقیقات سے سال شمسی کی مقدار ۳۶۵ دن ۵ ساعت ۴۸ دقیقہ، یعنی ۴۶ ثانیہ کم تھی۔

یہ تحقیقات مسلمانوں میں دوسرے نمبر پر ہے۔

مسلمانوں کی اور دوسری تحقیقاتوں کے نتائج بھی، (جن میں سے خلیفہ مامون الرشید کے علما، اور البتانی، البیرونی اور الغ بیگ کے تحقیقات قابلِ ذکر ہیں۔) پچھلے تمام نتیجوں سے بہتر ہیں اور اُن میں سے کسی میں دو ڈھائی دقیقوں سے زیادہ کا فرق نہیں ہے۔

ان سب مسلمان عالموں میں عمر خیام کو یہ فخر حاصل ہے کہ سب سے پہلے اُس نے بہترین نتیجہ پیش کیا۔

وہ بحیثیت ایک شاعر کے زیادہ مشہور ہے، لیکن یہ اُس کا علمی کارنامہ اُس کی رباعیات سے کسی طرح کم نہیں۔

سیّد حسن برنی
بی۔ اے

غزل

تری آنکھوں میں ہے شبہائے عشرت کا خمار ابتک
منوّر ہے مئے رنگیں سے جامِ زرنگار ابتک

مجھے تو مارنا چاہے ہے تو آنکھیں پھیر لے ظالم
نگاہوں پر ہے میری زندگی کا انحصار ابتک

مجھے کیا نور سے۔ میرے لئے تاریک ہی دنیا
میری جانب سے ان کے دلمیں باقی ہی غبار ابتک

ابھی تک منظرِ شامِ جدائی یاد ہے مجھ کو
ہوا ہے بیقرار ابتک فضا ہے سوگوار ابتک

ابھی تک دیکھکر پھولوں کو بڑھتا ہے جنوں میرا
فروغِ لالہ و نرگس ہے مجھ کو ناگوار ابتک

کبھی تم نے کہا تھا۔ "تیرا دردِ عشق جھوٹا ہے"
وہ میرے دل میں ہی پیوست مثلِ نوکِ خار ابتک

ابھی تک سُن رہا ہوں داستانِ عشق و محبوبی
نہیں دیکھا ہے مَیں نے چہرۂ زیبائے یار ابتک

عابدؔ

عملِ اکسیر اور سائنس

دو مغربی سائنسدان ساڈی اور ردرفورڈ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۲ء کے درمیان ریڈیم اور دیگر متعلقہ اشیا پر تجربات کرتے رہے ہیں۔ اس اثنا میں ردرفورڈ نے ایک چیز پر جسے تھیوریم کہا جاتا ہے، تحقیق شروع کی۔ اس کے ایک مرکب نمک پر امونیا کا عمل کرنے سے ایک نئی چیز پیدا ہو گئی۔ جو کہ بھی مفرد۔ اور مفرد اوّل یعنی تھوریم سے بالکل مختلف تھی۔ ان نتائج نے دنیائے سائنس میں ایک ہلچل مچا دی۔ اس کے بعد اس نو ایجاد مفرد مادہ پر عمل کرنے سے بہت سے مرکبات بنائے گئے۔

اس تحقیق سے یہ معلوم ہوا، کہ ایک مفرد مادہ کا کسی اور مفرد مادہ سے پیدا ہونا ناممکنات میں سے نہیں ہے۔ کم قیمت اور معمولی دھاتوں کو سونے چاندی میں تبدیل کرنے کا خبط علمِ طبعیات کے ایشیائی ماہرین کے دماغوں میں زمانۂ قدیم سے پایا جاتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق رانگہ، پارہ، جست اور سیسہ کی ناقص دھاتوں کو قیمتی دھاتوں کی شکل میں تبدیل کیا جا سکتا ہے وہ کہتے ہیں کہ ان میں اعلیٰ دھاتوں کا مادہ تو موجود ہے لیکن رطوبت کی زیادتی اور غلبۂ ارضیت کی چند عارضی کیفیتوں کے باعث جو کانوں میں ان پر طاری ہوتی ہیں وہ کمال کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکے اور اگر ان پر چند عمل کئے جائیں تو وہ اس مرتبہ کو پہنچائے جا سکتے ہیں۔

اس زمانہ میں بھی یہ عقیدہ باقی ہے اور مشرقیوں پر اس کا تسلط بہت مضبوط ہے۔ یہ خبط صرف ایشیا ہی تک محدود نہیں بلکہ مغرب کی بھی بہت سی جانیں اکسیر کی دیوی کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھ چکا ہے جرمنی، فرانس اور انگلستان کے سائنسدان مدتوں کسی ایسی چیز کی تلاش میں خاک چھانتے پھرے جو تانبے کو سونے میں تبدیل کر دے۔ یہ نہایت دلچسپ بات ہے کہ اس نایاب مادہ کی تلاش میں ایک قابل مغربی سائنسدان نے انسانی پیشاب پر تجربات کئے، لیکن گوہرِ مقصود نہ ملا، پر نہ ملا۔ بہرحال اس کی محنت کا اجر اسے فاسفورس جیسی چیز کی دریافت میں مل گیا، جو پیشاب میں موجود تھی۔ اس دریافت کے لئے تمام دنیا اس کی آجتک ممنون ہے۔

فاسفورس کا ماخذ چونکہ پلید اور ناپاک ہے اس لئے اور کچھ شرم کی وجہ سے اس نے اسے پہلے پہل عوام کے سامنے پیش کرنے سے احتراز کیا۔ بعد میں یہ راز طشت از بام ہو ہی گیا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے لوگ اکسیر کی دریافت میں سرگرداں اور پریشان رہے ہیں مغرب نے تو مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے دھاتوں کے اس "تناسخ" کو محض ایک خیالی اختراع تصور کر کے بھلا دیا لیکن مشرق جو فطرتاً لکیر کا فقیر واقع ہوا ہے آجتک اسی کوشش میں سرگرم نظر آتا ہے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ابتک کبھی کوئی شخص اس کوشش میں کامیاب ہوا بھی، یا نہیں لیکن اس کے وجود سے قطعی انکار بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔ سائنس کے موجودہ مسلّم اصولوں کے مطابق ہر مادی شے کے ذرات، خورد ترین برقی ذروں کا مجموعہ ہیں۔ یہ برقی ذرے ایک درمیانی مثبت ذرّے کے گرد اسی طرح گھومتے ہیں جیسے سورج کے گرد ستارے۔ مفرد اشیا کے اجسام کا مختلف ہونا صرف ان تیزی سے گھومنے والے ذرّوں کی تعداد پر منحصر ہوتا ہے لہٰذا اگر کوئی ایسا کیمیائی عمل دریافت کیا جائے جو ان ذرات کی تعداد میں تخفیف یا اضافہ کر سکے تو اس امر میں کیا شبہ ہو سکتا ہے اگر ایک مفرد دھات دوسری مفرد دھات میں تبدیل ہو جائے۔

کچھ عرصہ ہوا ہم نے اپنے ذاتی دارالتجربہ میں چند مشرقی نسخوں کو پیش نظر رکھکر اس قسم کے کچھ تجربات کئے تھے۔ جب تانبے کے کچھ ٹکڑوں پر عمل کیا گیا تو وہ طلائی رنگت پکڑ گئے۔ لیکن یہ رنگ چند تیز مرکبات کے مقابلہ میں زائل ہو جاتا تھا۔ اور اصلی اور غیر حس کے لحاظ سے بھی نئی دھات تانبے سے مختلف نہ تھی۔

مشرقی ماہرین نے اکسیر کے عمل کو دو مختلف حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ اولاً عمل معدنی اور ثانیاً عمل نباتی۔ معدنی عمل میں چند معدنی اشیا مثلاً زرنیخ، شنجرف، زاج، کریانی وغیرہ وغیرہ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ عمل نباتی میں صرف کچھ پودوں کے عرق عمل میں لائے

جاتے ہیں۔ ضیافت طبع کے لئے ایک قدیم قلمی بیاض سے ایک پودے کے متعلق جو اکسیر کے کام آتا ہے۔ ذیل کا اقتباس ترجمہ کر کے دیا جاتا ہے

"اکی۔ الف پر زبر، کاف عجمی پر تشدید اور یائے تحتانی ساکن۔ ایک درخت ہے جو ریت میں ملتا ہے۔ اس کا پتا ہندوستانی آک کے مشابہ ہوتا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ اس کی صرف ایک شاخ ہوتی ہے اور اس میں سے دودھ نہیں نکلتا۔"

اس بیاض کی رو سے اس درخت کا عرق اکسیر کا کام دے سکتا ہے۔ یہ درخت ایک نایاب چیز ہے، لیکن بالکل عدیم الوجود نہیں۔

اس قسم کے درخت یا پودے جن کا ذکر پرانی کتابوں یا بیاضوں میں پایا جاتا ہے۔ عموماً عنقا کی طرح غائب ہوتے ہیں۔ جس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ ایک کامیاب ڈھونگ کے سوا انکی کوئی وقعت نہیں۔

بیجد چھان بین اور پیہم ناکامیوں کے بعد مغرب کی طرح یہی کہنا پڑتا ہے کہ اکسیر کے عمل کا وجود دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ شاید کسی دن یہ عقدہ کسی سائنسدان پر واضح ہو جائے اور وہ اس کے انکشاف سے سائنس کے اس قدیم راز کی تصدیق کر دے۔

نذیر ویرش
(گورنمنٹ کالج لاہور)

نغمہ

گرو کل یونیورسٹی کی بزم ادب عالیہ "ہندی ساہتیہ سمیلن" کے "نشاطِ سالانہ" میں مندرجہ ذیل نظم خاص طور سے پسند کی گئی۔

تیرے در کی دھول میں جانے کیا پایا ہی بھکاری نے　　دنیا چھوٹی پر نہیں چھوٹا تیری گلی کا پھیرا رے
"پریت" بری ہے یا اچھی ہے جو کچھ بھی ہے میری ہے　　اب تو پیاری آن بسایا من میں پریم نے ڈیرا رے
میرے دل کی دنیا پیاری! تیرے دل کی دنیا ہے　　تو میرا ہے میں تیرا ہوں، پھر کیا۔ میرا تیرا رے
"پریم" کے بندھن میں پھنسنے سے کتنے بندھن ٹوٹے ہیں　　یہ میں جانوں یا وہ جانے جس کے پریم نے گھیرا رے

جب تم سپنے میں بھی نہ آؤ پیاری پھر کیوں نیند آئے
"وِیوگ" کا "دیپک" جب نہیں بجھتا پھر کیسے ہو سویرا رے

روشن صدیقی

رام کا اخلاق

(ترجمہ از والمیکی رامائن - آرنیہ کانڈ - ۱۶واں سرگ)

اِس طرح مہاتما رام کو پنچ وٹی میں آرام سے رہتے ہوئے شرد رتو[1] کے بعد ہیمنت[2] رتو یعنی سخت سردی کا موسم آگیا۔

ایک بار رات کے پچھلے پہر میں صبح سویرے رگھونندن رام نہایت خوبصورت گوداوری ندی میں نہانے چلے۔

رام نہایت خوش تھے۔ ہاتھ میں کلسا لئے ہوئے جا رہے تھے۔ سیتا اُن کے برابر جا رہی تھیں۔ اور برادر لکشمن پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ اس وقت وہ رام سے اِس طرح ہمکلام ہوئے:۔

اے شیریں کلام! یہ وہ خوبصورت موسم آگیا ہے جسے آپ نہایت پسند فرماتے ہیں۔ یہ موسم کیا ہے گویا سال بھر کی خوبصورتی کا مخزن ہے۔

زمین ہری بھری کھیتی سے سرسبز ہے۔ کہُر چھایا ہوا ہے۔ اور پانی گویا استعمال کی چیز ہی نہیں رہا۔ البتہ آگ سب کو پیاری لگ رہی ہے۔

آفتاب شمالی سمت کو چھوڑ کر جنوب کی طرف چلا گیا ہے! اس لئے اُتر کی دِشا[3] بغیر تلک کی کامنی کی طرح بھلی نہیں معلوم ہوتی۔

سورج زمین سے بہت دور ہوگیا ہے۔ اِس لئے زمین پر برف ہی برف معلوم ہوتی ہے۔ اور کوہ ہمالیہ تو فی الحقیقت برفستان ہی ہوگیا ہے۔

دوپہر کی دھوپ آرام دہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن سایہ۔ پانی اور رات تکلیف دہ ہوگئی ہیں۔

آجکل راتوں کو کھُلے آسمان کے نیچے کوئی نہیں سو سکتا اور سردی کے ساتھ ساتھ رات بھی بڑھ گئی ہے۔

چاروں طرف کہُر اور پالے کا تسلط ہے۔ چاند بھی پھونک مارے ہوئے آئینہ کی طرح اندھا (غبار آلود) ہوگیا ہے۔

اگرچہ آج پورنماشی ہے۔ پھر بھی چندرما کی، چاندنی بالکل پھیکی نظر آرہی ہے۔

برف سے مرطوب مغربی ہوا زیادہ سے زیادہ سرد ہو کر آرہی ہے۔

درختوں اور کھیتوں سے ہرے بھرے جنگل سورج نکل آنے پر کیسے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ سارس اور کُنج پرندوں کا شور ہو رہا ہے

دھان کے کھیتوں میں بالیاں چاولوں سے بھری ہوئی سنہرے رنگ میں کھجور کے خوشنما پھولوں کی طرح لٹک رہی ہیں۔

بہت دور سے برف اور کہُر کے اندر سے سورج اپنی کرنیں پھینکتا ہوا چاندی کی طرح نظر آرہا ہے۔

دیکھئے! ہری گھاس اور پودوں پر پڑی ہوئی شبنم کے قطرے آفتاب کی شعاع پڑتے ہی موتیوں کی طرح چمکنے لگے ہیں۔

پیاسا جنگلی ہاتھی پانی پینے کے لئے اپنی سونڈ پانی کی طرف لے جاتا ہے۔ لیکن پانی کی سردی کے مارے فوراً اوپر کھینچ لیتا ہے۔

یہ پانی کے کنارے رہنے والے جانور جو ہر وقت پانی میں پڑے رہتے تھے۔ اب اندر گھُسنے کی جرأت نہیں کرتے۔ جیسے فنِ جنگ سے ناآشنا لڑائی میں جانے سے گھبراتا ہے۔

کمل کے پھول سردی کے مارے خشک ہو کر مغرب کی تیز ہوا کے جھکڑوں سے گر گئے ہیں۔ اور اب اُن کے صرف ڈنٹھل کھڑے رہ گئے ہیں جو بھلے نہیں معلوم ہوتے۔

ہے پُرش بیا گھر (اے بہادر) ایسے تکلیف دہ اور سخت موسم میں وہ آپ کا بھائی دھرماتما بھرت۔ آپ ہی میں دل لگائے ہوئے نندی گرام میں تپ کر رہا ہے۔

حکومت۔ راج۔ عزت اور منصب کے ہر طرح کے عیش و آرام چھوڑ کر وہ جفاکش تپسوی بھرت تھوڑا سا کھانا مقررہ وقت پر کھا کر ننگی زمین پر سو رہتا ہے۔

وہ بھی اس سخت سردی کے وقت روزانہ سرجو ندی میں اشنان کے لئے آتا ہے۔

[1] شرد رتو - اسوج اور کاتک کا مہینہ۔ [2] ہیمنت - منگسر اور پوش کا مہینہ - [3] دِشا سمت

وہ نہایت آرام اور سکھ سے پرورش پایا ہوا ۔ نازک اندام بھائی بھرت برف سے ڈھکے ہوئے دریائے سرجو میں رات کے پچھلے پہر کس طرح غسل کرتا ہوگا ۔

وہ کنول کے پھول کی سی آنکھوں والا ۔ نہایت خوبصورت ۔ سڈول اور چست جسم کا مہان ستیہ وادی شرمیلا ۔ نفس کش شیریں زبان ، لمبے بازوؤں والا ۔ دشمنوں کے لئے بجلی ، بھائی بھرت سب طرح کے عیش و آرام اور بھوگ چھوڑ کر صرف آپ کی ہی طرف دل لگائے ہوئے ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ آپ کے بھائی بھرت نے سورگ کو جیت لیا ہے ۔ وہ راج کا سکھ چھوڑ کر بن میں رہنے والے رام کے نقش قدم پر چل رہا ہے ۔ اور تپ کی زاہدانہ اور درویشانہ زندگی گزار رہا ہے ۔

لوگ کہا کرتے ہیں کہ انسان کا بچہ ماں کی طرف جاتا ہے نہ کہ باپ کی طرف بھرت نے یہ کہاوت غلط ثابت کردی ہے ۔

جس کا سوامی مہاراج دشرتھ اور بھرت جیسا سادھو فرزند ہے ۔ وہ ماتا " کے کئی "کس طرح ایسی سخت دل اور تنگ نظر ہوگئی ۔

دھرماتما لکشمن کے اس طرح محبت کے ساتھ باتیں کرنے پر مہاتما رام ماتا کے بارے میں توہین آمیز کلمات کو نہیں برداشت کرسکتے ۔ اور فرماتے ہیں ۔

پیارے بھائی ! مجھلی ماں کے بارے میں تمہیں ایسے نازیبا اور ناشائستہ الفاظ ہرگز اپنی زبان سے نہ نکالنے چاہئیں ۔ تم تو اور سب باتوں اور خیالات کو چھوڑ کر سوامی بھائی بھرت ہی کی کتھا کہتے رہو ۔

بلاشبہ میری عقل اور جذبات بن باس کے لئے مضبوط ہیں ۔ لیکن بھرت کی محبت سے گرم ہوجانے کے سبب اُن میں کچھ نرمی سی محسوس ہونے لگی ہے ۔

اُس کی (بھرت کی) پریم بھری میٹھی میٹھی دل خوش کن ، دل کو طاقت پہنچانے والی اور مُردوں میں بھی جان ڈالنے والی باتیں یاد آرہی ہیں ۔

وہ کون دن ہوگا جب میں تمہارے ساتھ پیارے بھائی بھرت اور بہادر شترگھن سے ملونگا ۔

اس طرح بھرے ہوئے دل سے مہاتما رام بھائی لکشمن اور سیتا کے ساتھ دریائے گوداوری پر پہنچے ۔ وہاں جاکر انہوں نے اشنان کیا ۔ اور سورج کی طرف منہ کر کے سیتا اور لکشمن کے ساتھ ایشور کی عبادت کی ۔

ان کاموں سے فارغ ہوکر مہاتما رام ایسے بھلے معلوم ہوئے ۔ جیسے پاربتی اور نندی کے ساتھ بھگوان شنکر معلوم ہوتے تھے ۔

(جناب "خاموش")

رباعیات

گو مست ہوں مستی میں بھی فرزانہ ہوں ، کچھ سوچ سمجھ کر بنا دیوانہ ہوں
بیہوشی بھی میری عین ہشیاری ہے عاقل ہوں مگر عقل سے بیگانہ ہوں

مجھ کو نہیں معلوم کہ دنیا کیا ہے بس آپ ہی جانیں یہ تماشا کیا ہے
خود اپنے کو اپنا کہوں ، کیا میری مجال ؟ سب کچھ ہے یہاں آپ کا میرا کیا ہے

بیتاب

شبنمِ اشکبار

جب اپنی تنگ دستی پر بجٹ نے آہ وزاری کی
ہوئی محو تدبر ذہنیت سرمایہ داری کی
نتیجہ یہ ہوا صاحب کا بھتہ تو رہا قایم
مگر تخفیف میں آئی اسامی چوکیداری کی

اصولِ پرورش سمجھا نہیں اے باغباں تو نے
اگر خونِ حنا سے شاخِ گل کی آبیاری کی
انہیں ہنستے ہوئے پھولوں میں اکثر ایسے غنچے ہیں
ہیں جن سے بے خبر رنگینیاں بادِ بہاری کی

یہ مانا رفعت اُس کی حیرتِ چشمِ تماشا ہے
یہ مانا دیدنی ہے شان قصرِ شہریاری کی
مگر افلاس کے تاریک کاشانوں کو بھی دیکھیں
نظر آئینگی تصویریں وہاں بے روزگاری کی

سیاست کے یہ معنی تو نہیں اے دانشِ مغرب
کہ اس پردے میں پوری ہو ہوس خود اختیاری کی
غریبوں کے دبانے سے غریبی دب نہیں سکتی
ہوا ناسور ہر وہ زخم جس کی پردہ داری کی

مَیں شاعر ہوں مری تقدیر میں رونا ہی لکھا ہے
ملی ہے باغ میں شبنم کو خدمت اشکباری کی

دولت کے آستاں پہ ہے طاقت جھکی ہوئی
پرسان حال کون ہے بے روزگار کا
شخصی حکومتوں کا ہے جمہوریت لباس
ہاں یہ بھی اک فریب ہے سرمایہ دار کا
بی اے ہوا غریب کا بیٹا تو کیا ہوا
سرکار کو لحاظ ہے تحصیلدار کا
ہنستے ہیں پھول بے خبر اس سے کہ باغ میں
منہ خشک پیاس سے ہے ہر اک شاخسار کا
قبضہ کیا خزاں نے چمن میں بہار پر
جاری مگر ہیں گیت لب جوئبار پر

فاخرہ ہریانوی

طوفانی رات

مَیں اور سوشیلا ایک ہی سکول میں پڑھا کرتے تھے۔ بچپن کے ان معصوم ایام میں ہم شادی رچاتے۔ سوشیلا دلہن بنتی اور میں دولہا۔

عشق سے اپنے میں غافل تھا وہ اپنے حسن سے

اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

جب مَیں اُس کے گھر جاتا تو اس کی ماں مجھے پیار کرتیں اور سوشیلا کے پاس بٹھا کر کہتیں:-

دیکھو کسقدر پیاری جوڑی ہے۔

اگرچہ مَیں اُس زمانے میں نادان تھا لیکن ان الفاظ کے معنی خوب سمجھتا تھا۔ میرے دل میں یہ بات گھر کر گئی کہ اور لوگوں کی نسبت سوشیلا پر میرا حق زیادہ ہے۔ اسی خیال سے کہ سوشیلا میری ہے۔ مَیں اسے کبھی جھڑکتا کبھی مارتا لیکن وہ اُف تک نہ کرتی اور اگر مَیں اس سے ناراض ہوجاتا تو وہ میری خوشامدیں کرکے مجھے منالیتی۔ تمام گاؤں میں سوشیلا کے حسن کا چرچا تھا لیکن مجھ جیسے نوجوان وحشی کو اس کے حسن میں کوئی عظمت دکھائی نہ دیتی تھی۔ مَیں یہ جانتا تھا کہ سوشیلا اپنے والد کے گھر میں محض اسی لئے پیدا ہوئی ہے کہ وہ میری نازبرداری کرے اور اسی وجہ سے میں اس کی چنداں پرواہ بھی نہیں کرتا تھا۔ میرے باپ زمیندار اور گاؤں کے چودہری تھے۔

اُن کا خیال تھا کہ جب مَیں اچھی طرح لکھنا پڑھنا سیکھ جاؤں تو وہ مجھے کاروباری معاملات میں تعلیم دلوائیں تاکہ مَیں بڑا ہو کر کسی سٹیٹ کا مینجر ہوسکوں۔ لیکن مجھے اس تجویز سے دلی نفرت تھی۔ ہمارے گاؤں کا نیل رتن گھر سے بھاگ کر کلکتہ چلا گیا تھا اور وہاں انگریزی پڑھکر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی کچہری میں ناظر بن گیا تھا۔ مَیں دل سے چاہتا تھا کہ انگریزی کی تعلیم حاصل کروں اور ہائیکورٹ کے دفتر کا ہیڈ کلرک بن جاؤں۔ مَیں دیکھتا تھا کہ میرا باپ کچہری کے ان ملازموں کی بہت عزت کرتا تھا۔ میں بچپن ہی سے جانتا تھا کہ لوگ ان کی بہت خاطر تواضع کرتے ہیں۔ ان سے ڈرتے ہیں۔ اور انہیں جھک کر سلام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے دل میں بھی ان لوگوں کی بہت عزت تھی۔

دیہات میں دیوتاؤں کی طرح ان لوگوں کی پرستش کی جاتی ہے۔ دنیوی اغراض کے معاملہ میں لوگ ان پر گنیش دیوتا کی نسبت زیادہ اعتبار کرتے ہیں۔ ورنہ کوئی سبب نہ تھا کہ آج سے پیشتر جو اشیا گنیش دیوتا کو چڑھائی جاتی تھیں اب ان کی نظر کی جائیں۔

نیل رتن کی تقلید میں مَیں بھی ایک مناسب موقع پاکر کلکتہ بھاگ گیا۔ پہلے تو میں وہاں اپنے گاؤں کے ایک ملازم کے مکان پر ٹھہرا رہا لیکن بعد میں میرے باپ نے میری تعلیم کے لئے مجھے خرچ دینا شروع کردیا۔ اِس لئے میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے لگا۔

اس کے علاوہ میں سیاسی جلسوں میں بھی سرگرمی سے حصّہ لینے لگا۔ مجھے اِس بات کا احساس ہوگیا کہ مجھے اپنی زندگی مادرِ وطن کے لئے قربان کردینی چاہیئے لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ کام کسقدر کٹھن ہے۔ میری رہنمائی کے لئے بھی کوئی نہ تھا تاہم میرا جذبہ متحرک ہوچکا تھا میں ہر لیڈر کی تقریر سننے کے لئے جاتا۔ دوپہر کی جھلسا دینے والی دھوپ میں دربدر چندہ مانگتا پھرتا۔ کبھی شہر میں جلسوں کے اشتہار تقسیم کرتا۔ لکچر ہال میں میزوں اور کرسیوں کی صفائی کرکے انہیں اور لڑکوں کے ساتھ ترتیب سے رکھتا۔ اگر کوئی شخص ہمارے لیڈر کو بُرا بھلا کہتا تو ہم دیہاتی لڑکے اس سے مرنے مارنے کو تیار ہوجاتے۔ اس پر شہری والنٹیر ہمارا مذاق اڑاتے۔ اور ہمیں تنگ نظر کہتے۔ میں کلکتہ میں ناظر یا ہیڈ کلرک بننے آیا تھا لیکن اب میرے دماغ میں میزنی اور گیری بالڈی بننے کا خبط سما گیا تھا۔ ان ایام میں میرے اور سوشیلا کے باپ کے درمیان اس بات کا فیصلہ ہوگیا کہ ہمیں شادی کی مقدس زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔

جب میں کلکتہ آیا تھا تو میری عمر اس وقت پندرہ سال کی تھی۔ سوشیلا اس وقت بارہ برس کی ہوگی۔ میری عمر اس وقت اٹھارہ سال کی ہوچکی تھی۔ اور میرے باپ کا خیال تھا کہ جسقدر جلد ہماری شادی ہوجائے اچھا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں میری عمر زیادہ ہوچکی تھی۔

لیکن مَیں نے اپنے دل میں یہ قسم کھائی تھی کہ تمام عمر شادی

نہیں کرونگا۔ اور اپنی زندگی مادرِ وطن کی خدمت کے لئے وقف کر دونگا۔

میں نے اپنے والد سے کہہ دیا کہ جب تک اپنی تعلیم ختم نہ کرلوں ہرگز شادی نہیں کرونگا۔

دو تین مہینے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ سوشیلا کی شادی رام لال وکیل سے ہوگئی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں کانگرس کے سالانہ اجلاس کے لئے چندہ اکٹھا کرنے میں سرگرم کار تھا۔ اس لئے اس خبر کا مجھ پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔

میں میٹرک پاس کر چکا تھا اور ایف اے کے امتحان میں بیٹھنے ہی کو تھا کہ میرے والد کا انتقال ہوگیا۔

اب میں تعلیم ترک کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے ملازمت کی تلاش کی اور خوش قسمتی سے مجھے ایک مڈل سکول میں سکینڈ ماسٹری کی جگہ مل گئی۔

میں نے کہا میرے لئے یہ کام نہایت موزوں ہے۔ میں اپنے شاگردوں کو بھارت ماتا کی خدمت کی تعلیم دونگا۔

میں نے کام شروع کر دیا۔ لیکن مجھے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ امتحان میں اچھے نتائج دکھانے کا کام ہندوستان کی خدمت سے زیادہ اہم ہے۔

جب میں لڑکوں کو گرامر یا الجبرا کے سوا اور کوئی بات بتاتا تو سکول کا ہیڈ ماسٹر مجھ پر سخت ناراض ہوتا۔ چند مہینے کے بعد میرا جوش ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ سکول کا یہ دستور تھا کہ ایک ماسٹر کو سکول میں سونا پڑتا تاکہ حفاظت اور نگرانی کا کام اچھی طرح ہو سکے۔ چونکہ میں ابھی کنوارا تھا۔ اس لئے یہ بلا میرے گلے پڑی۔

میرا جھونپڑا اسکول کی عمارت کے بالکل قریب تھا۔ اس کے پاس ایک تالاب تھا اور ارد گرد ناریل کے درخت تھے۔ مکان کے صحن میں نیم کے دو تین اور درخت تھے۔ جن کا ٹھنڈا سایہ گرمی کے موسم میں نہایت لطف دیتا تھا۔ ایک بات میں لکھنی بھول گیا۔ رام لال وکیل کا مکان بالکل ہمارے قریب تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی بیوی۔ میرے بچپن کی رفیق —— سوشیلا۔ اس کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ رام لال بابو سے میری شناسائی ہوگئی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ رام لال بابو کو معلوم تھا یا نہیں کہ سوشیلا میرے بچپن کی ہمجولی ہے۔ میں نے بھی مناسب نہ سمجھا کہ ان سے اس کا ذکر کروں۔

اب میں بھول چکا تھا کہ سوشیلا کبھی میری تھی۔ ایک روز تعطیل کے دن میں رام لال کے مکان پر گیا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ ہم میں کیا گفتگو ہوئی۔ غالباً گفتگو کا موضوع ہندوستان کا مستقبل تھا۔ اتنے میں مجھے چوڑیوں کی جھنکار، ریشمی ساڑھی کی سرسراہٹ اور نازک قدموں کی آواز سنائی دی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ دروازے کے سوراخ میں سے دو آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔

اس وقت بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میرے ذہن میں دو آنکھوں کا —— خوبصورت سیاہ آنکھوں کا وہ آنکھیں جن میں سے کبھی کبھی محبت کی شعاعیں نکلا کرتی تھیں اور جو میرے دیکھنے کے لئے کبھی بیقرار ہو جایا کرتی تھیں، تصور کھنچ گیا۔ کسی نامعلوم طاقت نے میرے دل کو زور سے مسل دیا اور میرے دل میں درد ہونے لگا۔

میں اپنے گھر واپس آگیا لیکن میرے دل میں ایک قسم کی سوزش بدستور تھی۔ میں لکھنے پڑھنے میں مصروف ہوکر اس خیال کو دل سے بھلانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ کہاں ——

رات کو سوتے وقت میں نے دل کو تسلی دی اور پوچھا۔ تجھے کیا تکلیف ہے۔ دل نے مجھ سے سوال کیا۔ بتاؤ تمہاری سوشیلا کہاں ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اسے میں نے اپنی خوشی سے چھوڑا ہے۔ کیا وہ اب تک میرا انتظار کر سکتی تھی! اب تم کچھ کرو تمہیں اسے نظر بھر کر دیکھنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ تم نے اپنے بچپن کی سوشیلا کی چوڑیوں کی جھنکار سنی، اس کی ریشمی ساڑھی کی سرسراہٹ اور نازک قدموں کی چاپ تمہارے کانوں تک پہنچی، تم نے اس فضا میں سانس لیا جس میں سوشیلا سانس لیتی ہے۔ لیکن اب تمہارے اور اس کے درمیان ایک دیوار حائل ہے۔

میں نے کہا اگر ایسا ہے تو مجھے اس کی فکر نہ ہونی چاہیئے۔ سوشیلا میری کوئی نہیں ہے۔

میرے دل نے کہا یہ ٹھیک ہے کہ آج وہ تمہاری کوئی نہیں لیکن کیا وہ تمہاری نہیں ہو سکتی تھی؟ —

آہ یہ سب سچ ہے، وہ میری خوشیوں اور رنجوں کی شریک ہوتی۔ جان سے عزیز اور دل سے پیاری ہوتی۔ لیکن اب وہ میرے لئے غیر ہے۔ ایک اجنبی ہے۔ اُسے دیکھنا میرے لئے ناجائز ہے۔ اس کے ساتھ بات کرنا ناجائز ہے اور اس کا خیال کرنا گناہ ہے لیکن پھر بھی —— سوشیلا کا خیال ستا رہا تھا۔

کسی کام کاج میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ جب دوپہر کے وقت رخصت ملنے پر سکول کے لڑکے شور مچاتے تو نیم کے درخت

کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پسینہ کو خشک کرتی تو میرے دل میں ایک نامعلوم خواہش پیدا ہوتی - میں نہیں جان سکتا تھا کہ یہ کیا خواہش تھی لیکن یہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ لڑکوں کی کاپیاں درست کرنے اور ہندوستان کا مستقبل سوچنے سے میری زندگی نہیں گذر سکتی - سکول کا وقت گزرنے کے بعد اپنے مکان میں رہنا میرے لئے محال ہو رہا تھا - مجھے اس وقت خیال آتا کہ ہماری موجودہ سوسائٹی میں کوئی چیز فطرت کے منشا کے مطابق نہیں - انسان کسقدر بیوقوف ہے کہ وہ نہ حاصل ہونیوالی تمنا میں اپنی زندگی تلخ کر لیتا ہے -

اگر میں چاہتا تو سوشیلا سے شادی کر کے یہ دن عیش سے گذار سکتا تھا - لیکن مجھے تو ہندوستان کا سب سے بڑا لیڈر بننے کا شوق چرایا تھا - کہاں وہ کہاں یہ ---- میں اب ایک سکول کا سیکنڈ ماسٹر ہوں - اور یہ رام لال بابو جسے کوئی نہ جانتا تھا آج سوشیلا کا مالک ہے - سوشیلا اس کے لئے کوئی خاص کشش نہیں رکھتی - اس کے لئے سوشیلا عام لڑکیوں جیسی لڑکی تھی وہ روپیہ پیدا کرتا تھا سوشیلا اس کے لئے کھانا پکاتی تھی - اگر کسی روز کھانا پکانے میں کوئی غلطی کرتی تو وہ اسے جھڑکتا، جب کبھی اس سے خوش ہوتا تو اسے چوڑیاں بنوا دیتا -

رام لال بابو کسی ضروری مقدمہ کی پیروی کے لئے کہیں باہر گیا - اب سوشیلا اپنے مکان میں میری طرح تنہا تھی -

مجھے یاد ہے کہ یہ پیر کا دن تھا - صبح ہی سے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے - دس بجے بارش ہونی شروع ہو گئی - موسم خراب دیکھ کر ہیڈ ماسٹر نے سکول بند کر دیا - تمام دن اور رات بھر بارش ہوتی رہی - اگلے دن دوپہر کے وقت بارش بہت زور سے ہونے لگی - اس کے ساتھ ہی قیامت کا طوفان آیا - جوں جوں رات ہوتی گئی بارش اور طوفان تیز ہوتے گئے - ظاہر ہے کہ اس ہنگامہ میں سونے کی کوشش کرنا بیکار تھا -

اس وقت مجھے یاد آیا کہ اس ہولناک رات میں سوشیلا اپنے مکان میں تنہا ہوگی - ہمارے سکول کی عمارت اس کے بنگلہ سے اونچی اور بہت زیادہ مضبوط تھی - دل میں بار بار یہ خیال آتا کہ سوشیلا کے حالات معلوم کرنے کے لئے باہر نکلوں - مگر ہمت نہ پڑتی - رات کے ڈیڑھ بجے مجھے دریا کی پرشور لہروں کی آواز سنائی دی - دور بہنے والے دریا کا پانی تیزی سے گاؤں کی طرف آ رہا تھا - میں اپنے کمرے سے نکل کر سوشیلا کے مکان کی طرف بھاگا - جب میں سکول کے تالاب کے پاس پہنچا تو سکول کی سڑک دریا بن چکی تھی - سکول کی سطح زمین سے ۱۰ فٹ بلند تھی - لیکن پانی تیزی سے چڑھ رہا تھا - میں دوسرے کنارے کی طرف بھاگا - جب میں کنارے کے قریب پہنچا تو مجھے اپنی طرف کوئی اور شخص آتا ہوا دکھائی دیا - وہ کون تھا - میرے جسم کا ہر عضو کانپ رہا تھا - اور میری روح بیدار ہو چکی تھی - مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے -

ہم دونوں ایک اونچی جگہ پر کھڑے تھے - ہمارے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا -

اس وقت کائنات پر پوری تاریکی چھائی ہوئی تھی - ہم دونوں خاموش کھڑے تھے - ہم نے رسمی طور پر بھی ایک دوسرے کی خیریت نہ پوچھی - ہم صرف ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے - موت طوفان کی شکل میں ہمیں چاروں طرف گھیرے کھڑی تھی ----

آج تمام دنیا کو چھوڑ کر سوشیلا میرے پاس کھڑی تھی - آج میرے سوا اس کا کوئی نہ تھا - آج میرے بچپن کی بھولی سوشیلا جس کے ساتھ میں کبھی دولہا دلہن کے کھیل کھیلا کرتا تھا - مدت کے بعد مجھ سے ملی تھی شادی کی رسمی قیود نے مجھے اس سے علیحدہ کر دیا تھا - طوفان کی خونی لہروں نے اسے میرے پہلو میں لا کر کھڑا کر دیا تھا -

ہم اس وقت تک دو جداگانہ ہستیاں تھے - لیکن طوفان کی ایک اور لہر دونوں کو موت کی آغوش میں دے کر ایک کر سکتی تھی - میرا دل کہہ رہا تھا خدا کرے کہ وہ لہر اب کبھی نہ آئے - سوشیلا اپنے خاوند کے ساتھ عیش و مسرت کی کامیاب زندگی بسر کرے - عزیزوں، رشتہ داروں اور بیٹے بیٹیوں کے درمیان زندگی کے لامحدود سال گذارے - میں نے ایک رات یعنی طوفانی رات میں اس سے زیادہ دائمی مسرت حاصل کر لی -

رات ختم ہوئی، طوفان تھم گیا - ہم دونوں منہ سے ایک لفظ کہے بغیر ایک دوسرے سے خاموشی سے جدا ہو گئے -

میں نے کہا یہ درست ہے کہ میں ناظر، ہیڈ کلرک، یا گیری بالڈی نہیں بن سکا - اور اس وقت صرف ایک سیکنڈ ماسٹر ہوں - لیکن اس ایک رات نے میری زندگی کو ہمیشہ کے لئے مسرور بنا دیا ہے، اور اس نے میرے سامنے حقیقتوں کی ایک دنیا کھول دی ہے - یہ رات میری زندگی کے تمام دنوں اور راتوں سے زیادہ مسرت بخش تھی ۔ (ٹیگور)

(زبیدہ خاتون لدھیانوی)

چند دکنی مرثیہ گو

دورِ آصفیہ

اب ہم ان مرثیہ گویوں کا حال بیان کرتے ہیں جو دورِ آصفیہ سے تعلق رکھتے ہیں، جیسا کہ گزشتہ مضمون میں بیان کیا گیا ہے۔ نواب میر قمرالدین خاں آصفجاہ اول نے ۱۱۳۶ھ میں اپنی خود مختار حکومت قائم کی تھی۔

آصفجاہ ایک ذی علم اور علم دوست حکمران تھے۔ شعر و سخن سے اُن کو خاص دلچسپی تھی خود بھی فارسی کے زبردست شاعر تھے۔ آصف تخلص تھا۔ اسی طرح اُن کے صاحبزادے اور جانشین ناصر جنگ بھی شاعر تھے، ضخیم دیوان یادگار ہے۔ پھر ایک زمانہ آیا جبکہ یہاں کی مسند وزارت پر راجہ چندولال متمکن تھے۔ جن کی شعر فہمی اور سخن سنجی مشہور ہے۔ غرضکہ[1] اس طرح دورِ آصفیہ میں بھی علم و ہنر کی سرپرستی ہوتی رہی اور شعر و سخن سے دلچسپی لی جاتی رہی جس کے باعث مشہور شعرا کی تعداد بھی صدہا ہے، عام شعرا سے قطع نظر صرف مرثیہ گو بھی خاصی تعداد میں تھے۔ جن کی طویل فہرست ہو سکتی ہے، جن میں سے بعض کی یہاں صراحت کیجاتی ہے۔

(۱) ہاشم علی برھان پوری۔ اس دَور کا مشہور مرثیہ گو ہے۔ دیوان حسینی کے نام سے اپنے مرثیے جمع کئے ہیں جس کا ایک نسخہ اڈنبرہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ مصنف کیٹلاگ نے اس کے متعلق متعدد غلطیاں کی ہیں۔

وہ ہاشم علی کو شاہ ہاشم تصور کرتا ہے جو شیخ احمد سرہندی کے مرید تھے۔ جنھوں نے فارسی میں دیوان مرتب کیا تھا۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے خود اس کے کلام سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ گیارہویں صدی ہجری نہیں بلکہ بارہویں صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ اپنے مرثیہ میں اس کی تاریخ کا ذکر اس طرح کرتا ہے ؎

جب منجم نے کیا اس دردنامہ کا حساب
غین وقاف وسین وطا آیا رقم اندر کتاب
سن کے یو تاریخ کون سینے میں دل ہوتا کباب
ختم کر ہاشم علی قاسم کی شادی کے بین

اس سے واضح ہے کہ یہ مرثیہ ۱۱۶۹ھ میں لکھا گیا ہے۔

مصنف کیٹلاگ کو دھوکا اس لئے ہوا ہے کہ دیوان حسینی میں ایک جگہ ایک عبارت جو ایک خواب کے متعلق درج ہے۔ اس میں کاتب کی سہو کتابت سے بجائے ۱۱۴۸ھ کے ۱۰۴۸ھ لکھا گیا ہے۔

قادر کے ایک مرثیہ میں تاریخ تصنیف کا بیان اس طرح ہوا ہے ؎

سن اگیارہ سو اوپر اونچاس سال
سبز بانا قادرا کا لہو میں لال
ختم کر یو مرثیہ پایا وصال
ہائے کیا غم غم یہ غم ہے مستقیم

اس سے ظاہر ہوتا ہے قادر ۱۱۴۹ھ میں زندہ تھا اور ہاشم علی کے مرثیہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اس کا ہمعصر تھا۔ غرضکہ اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ہاشم علی بارہویں صدی سے تعلق رکھتا ہے۔

افسوس ہم کو اس کے پیدائش اور مرنے کا سنہ معلوم نہیں۔ اور نہ کسی تذکرہ نویس نے اس کی صراحت کی ہے۔ برھان پور کا باشندہ تھا اور وہیں انتقال کیا۔ امامیہ مذہب کا پیرو تھا۔

---

[1] راجہ چندولال کے بعد مرحوم اعلیحضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں کا زمانہ آتا ہے۔ جو حضرت داغ دہلوی کے شاگرد تھے جنکی علمی قدردانی مشہور و معروف ہے۔ اس کے بعد اعلیحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان خاں بہادر خلد اللہ ملکہ کا دورِ حکمرانی آتا ہے۔ جبکہ اردو کی ترقی کیلئے یونیورسٹی قائم ہوئی۔ مگر چونکہ ہم جن مرثیہ گویوں کو پیش کرنے والے ہیں۔ ان کا زمانہ راجہ چندولال تک ہی ہے۔ اس لئے اس کے متعلق مزید وضاحت نہیں کی گئی۔

ہاشم علی صرف مرثیہ گوئی کرتا تھا اس کے دیوان میں ردیف وار مرثیے جمع کئے گئے ہیں ۔ اسپرنگر کی کیٹلاگ میں بھی دیوان حسینی داخل ہے ۔

دیوان حسینی میں کل دوسو اڑتیس (۲۳۸) مرثیے ہیں جن میں سے بعض خاصے طویل ہیں ۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاشم علی ایک اعلیٰ درجے کا مرثیہ گو تھا اور اپنے فن میں استادی کا درجہ رکھتا تھا ۔

اس کے مرثیوں میں سوز و گداز، غم والم، واقعہ نگاری وغیرہ کے بہتر سے بہتر نمونے موجود ہیں ۔ صبح کا سماں ۔ گرمی کا موسم ۔ لڑائی کا منظر، سفر کی حالت ۔ تنہائی بے کسی اور بے بسی جدائی وغیرہ کے مضامین پر اچھی طرح طبع آزمائی کی ہے ۔

ذیل میں نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے :-

بی بی شہر بانو کا علی اصغر کے لئے ماتم مختلف مرثیوں میں موجود ہے بعض ملاحظہ طلب ہیں :-

جاؤں کدھر میں کیا کروں یہ گود خالی لے پھروں
پھر اصغر اصغر میں کہوں کس کا جھولاؤں پالنا
یہ دیکھ میرا حال توں توڑی ہوں سر کے بال کوں
میں دل کی حالت کیا کہوں کس کا جھولاؤں پالنا
تجھے کھیلنے کے دن تیرے کیا عمر کیا تھی سن تری
نہیں چین مجکوں بن تیرے کس کا جھولاؤں پالنا
نہیں بھولے مجکوں تو کبھو تجھ یاد کرتے میں رہوں
رو رو کے تجھ بن دن بھروں کس کا جھولاؤں پالنا

---

(۲) **قادر** ۔ اسی دور کا مرثیہ گو ہے ۔ قائم اور میر حسن نے اپنے تذکروں میں ان کا ذکر کیا ہے ۔ قائم کے حوالہ سے اسپرنگر نے بھی اپنے تذکرہ میں ان کا نام درج کیا ہے ۔ خلاصہ یہ ہے " میر عبدالقادر قادر تخلص حیدرآباد کے باشندے تھے ۔ اکثر مرثیے مشہور ہیں ۔ اہل دل تھے ۔ صغر سنی سے فقیرانہ مذاق رکھتے تھے ۔ جب عمر پچاس سال سے متجاوز ہوئی تو شیخ شہاب الدین سہروردی سے بیعت کی ۔ اور خرقہ پہنکر دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی ۔

تعجب ہے شفیق اور خواجہ خان نے اپنے تذکروں میں ان کا ذکر نہیں کیا ۔ بعض اصحاب کا خیال ہے ان کا نام غلام قادر تھا ۔ مگر صحیح نہیں معلوم ہوتا ۔

افسوس ہے ہم کو ان کے پیدائش اور وفات کا سنہ معلوم نہیں مگر جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے ۱۱۴۹ھ میں ان کے زندہ رہنے کا بخوبی ثبوت ملتا ہے ۔ غالباً ۱۱۶۹ھ کے پیشتر ان کا انتقال ہوگیا تھا جس پر ہاشم علی افسوس کا اظہار کرتا ہے ۔

ہاشم علی کی طرح مرزا بھی قادر کے وفات پر افسوس کرتا ہے :-

نہ دیا قادر ابدتل کون مرا [illegible] تب بخسون
چلیا مجہ چھوڑ کس پر توں کہو یاراں صدا حیف

(از بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین مرحوم)

بہرحال قادر ایک مشہور مرثیہ گو تھا ۔ مرثیوں سے اس کی قابلیت کا بخوبی ثبوت ملتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے قادر کو علم نجوم اور علم ہندسہ میں خاص مہارت تھی کیونکہ ایک مرثیہ میں اس کی علمی اصطلاحات کا ایسا اظہار ہوا ہے جو اس کے ماہر فن ہونے پر دلالت کرتا ہے ۔

اڈنبرہ کی بیاض میں اس کے (۱۷) مرثیے اور مولوی صفی الدین والی بیاض میں پانچ مرثیے ہیں ۔ اور کیمبرج کی بیاض میں ایک مرثیہ ہے ۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قادر کو انسانی جذبات کی ترجمانی کا خاص ملکہ تھا ۔ اس کے ساتھ ہی اس کے مرثیوں میں سادگی اور تسلسل بھی ہے ۔

(۳) **روحی** ۔ یہ بھی اسی دور کا مرثیہ گو ہے ۔ تذکرہ قائم کے حوالے سے اسپرنگر نے ان کا ذکر کیا ہے ۔ حیدرآباد کے پیرزادے ہونے کی صراحت کی ہے ۔ تعجب ہے شفیق اور خواجہ خاں حمید نے اپنے تذکروں میں ان کا بھی ذکر نہیں کیا ۔

ہاشم علی کے شعر سے معلوم ہوتا ہے یہ اُس کی زندگی میں مر چکا تھا ۔ اڈنبرہ والی بیاض میں اس کے پانچ مرثیے ہیں کیمبرج والی بیاض میں ایک اور مولوی صفی الدین والی بیاض میں ایک مرثیہ ہے ۔ اول الذکر اور آخر الذکر میں ایک مرثیہ مشترک ہے ۔ لیکن ان کے دیکھنے سے روحی کی قابلیت کا ثبوت ملتا ہے ۔ اس کے اکثر مرثیے غزل معلوم ہوتے ہیں ۔ لیکن ادبی حیثیت سے قابل قدر ہیں ۔

(۴) **غلامی** ۔ اگرچہ غلامی اس دور کا مشہور اور باکمال مرثیہ گو ہے مگر تعجب ہے کسی تذکرہ نویس نے اس کا ذکر نہیں کیا ۔ حال میں رسالہ مخزن میں مولانا تبسم کا ایک مضمون شائع ہوا ہے اس میں پروفیسر محمود شیرانی کے حوالے سے حسب ذیل عبارت دی ہے ۔

" اتفاق سے پروفیسر شیرانی نے اس سال جو لکچر دئے ہیں ان

ہیں غلامی کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ وہ غلامی کا نام غلام رسول بتاتے ہیں جو سورت میں پیدا ہوا اور ۱۲۱۸ھ میں اپنی مثنوی ختم کی اور خود اس نے صراحت کی ہے کہ شعروشاعری صرف ایک سال سے شروع کی ہے۔"

ہم جس غلامی کا ذکر کر رہے ہیں وہ یہ غلامی ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اوپر کے بیان سے واضح ہے کہ غلامی نے ۱۲۱۸ھ کے ایک سال پہلے شاعری شروع کی ہے۔ اس کے برعکس اڈنبرہ کی بیاض جس میں اس کے مرثیے ہیں اپنے اندرونی شہادت سے ۱۱۹۳ھ میں لکھی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے علامہ شیرانی کے غلامی نے اس زمانہ میں شاعری کا آغاز نہیں کیا تھا۔

اس کے علاوہ غلامی کے مرثیوں سے معلوم ہوتا ہے اس کا نام غلام حیدر یا غلام مرتضیٰ تھا۔ بہرحال اس کے متعلق کسی نے کوئی یقینی بات نہیں کہی۔ البتہ ڈاکٹر سید غلام محی الدین زور نے اپنے تالیف ادہ دشہ پاروں میں اس پر ایک نوٹ لکھا ہے۔ جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"اگرچہ کسی شاعر نے اس کا ذکر نہیں کیا اور نہ سچی شہادت ہی سے اس کے متعلق کوئی مواد فراہم ہوتا ہے۔ تاہم وہ بڑا شاعر معلوم ہوتا ہے اس کی تاریخ پیدائش کا ہمیں علم نہیں۔ اڈنبرہ کی بیاض میں جن شعرا کا ذکر ہے۔ ان میں یہ بھی صرف ایک مرثیہ گو تھا لیکن وہ ان سب میں مشہور تھا، کیونکہ اس بیاض میں اس کے کافی مرثیے موجود ہیں۔ اپنے ہمعصروں ہاشم علی۔ اور رضا اور دیگر ساتھیوں کے مقابل میں حقیقت نگاری کے لحاظ سے وہ بہت اچھا شاعر تھا اس کے خیالات بہت اعلیٰ تھے۔ کربلا کے دلشکن واقعات کو اس نے اس انداز میں بیان کیا ہے۔ کہ پڑھنے والا ان کو حقیقی تاریخی واقعات سمجھنے لگتا ہے۔ بعض دفعہ وہ دہلی کی طرح ترقی یافتہ اور میٹھی زبان استعمال کرتا ہے۔ غالباً یہ پہلا شاعر ہے جس نے نظم میں صاف ستھری زبان اور فطری باتوں کا اضافہ کیا۔ اس کے دلفریب اسلوب بیان اور پرواز تخیل کی وجہ سے اسے قدیم دکنی شعرا کی صف اول میں جگہ ملتی ہے۔"

اڈنبرہ کی بیاض میں اس کے ستّرہ مرثیوں میں (۲۷۵) شعر ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

بانو پہ کربلا میں کیسا یہ دکھ پڑا ہے
گودی میں پیارا اصغر بن دودھ مرچلا ہے
ہو رانڈ بیٹھی بیٹی داماد مرچکا ہے
سر کا چھتر بھی ڈھلنا کوئی دم کو آرہا ہے
سمجھانا اس بچی کا اس وقت کیا مصیبت
بابا بناں تڑپنا اور تشنگی کی شدت
اے بیٹی تیرے بابا کھانے گئے ضیافت
معصوم کا یہ سن کر وہ چندجی جلا ہے
کہنے لگی کہ اماں ہے ہے یہ کیا غضب ہے
مرتی ہوں بھوک ستیں پیاسوں سیں جان بلب ہے

(۵) ندیم - شاہ ندیم اللہ بیجاپوری۔ کسی تذکرہ نویس نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ صوفی تھے بقول مولانا باقر آگاہ خدارسیدہ بزرگ تھے۔ شاعری میں کمال تھا۔ مرثیے بھی کہا کرتے۔ بارہویں صدی ہجری کے وسط میں انتقال فرمایا۔

اڈنبرہ کی بیاض میں ان کے گیارہ مرثیے ہیں جن کے (۱۵۲) شعر ہیں۔ ندیم کے مرثیے زبان کی حیثیت سے نہائیت صاف اور پُراثر ہوتے ہیں۔

(۶) عشقی - افسوس ہے کسی قدیم اور جدید تذکرہ میں ان کا حال نہیں ہے۔ البتہ اسپرنگر نے خوب چندذکا کے حوالے سے ایک عشقی کا ذکر کیا ہے۔ جو دکن کے شاعر تھے۔

سردست میں بھی ان کے متعلق کوئی وضاحت نہیں کرسکتا۔ صرف کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ مولوی صفی الدین والی بیاض میں ان کے تین مرثیے ہیں جن کے (۶۱) شعر ہیں۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے عشقی کہنہ مشق شاعر تھا۔ واقعہ نگاری خوب کی ہے۔ زبان بھی صاف ہے۔

بے داداماں ماں پر کیوں جرخ نے نگاری کیا
ماتم پو ماتم غم پو غم دکھ پر سود کہ بھاری کیا
کیا بکتر پے عار ہو برساتوں گرم انگار ہو
جا کافراں سون یار ہو شاہاں سوں اغیاری کیا
ہو کافراں کی دہرائی آل عباسوں بیر اپے
شہ کا کتا کر سرائی کیا لیس کام اختیاری کا

اس کے علاوہ بیسیوں شعرا مثلاً محب جسن۔ دلبان۔ ندا۔ رضا۔ رمضانی۔ حمیدی۔ صادق۔ تقی۔ مخدوم۔ قربان علی وغیرہ کے مرثیے موجود ہیں طوالت کے خوف سے نظرانداز کئے جاتے

جانتے ہیں -

ہمارے چار مضمونوں کے مطالعہ سے دکنی مرثیہ گویوں کا مختصر حال اور ان کے کلام کا نمونہ معلوم ہوسکتا ہے ۔ اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ مرثیوں کی ابتدا دکن سے ہوئی ۔ مگر زمانہ مابعد میں شاعری کی اس صنف نے جو ترقی ایک فن کی حیثیت سے لکھنو میں حاصل کی وہ دکنی مرثیوں کو حاصل نہیں ہوئی ۔ لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو بات مرثیہ پن کی دکنی مرثیوں کو حاصل رہی وہ لکھنو کے مرثیوں میں نہیں پائی جاتی ۔ دکنی مرثیوں کا خاص مقصد مجلس عزا کو رُلانا تھا ۔ وہ اپنے کلام میں سوز وگداز رنج وغم کے مضامین اس طرح بیان کرتے تھے کہ سوز وگداز کا سماں پیش ہو جاتا تھا ۔

دکنی مرثیوں سے ایک اور بات بھی ظاہر ہوتی ہے ان میں جہاں عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ۔ وہاں سنسکرت اور ہندی کے الفاظ بھی مستعمل ہوئے ہیں ۔ بعض جگہ ان الفاظ کے استعمال سے کلام میں خاصہ زور پیدا ہوگیا ہے ۔

معلوم ہوتا ہے دکن میں عام طور پر مرثیہ گوئی کا رواج تھا نہ صرف خاص مرثیہ گو شعرا تھے بلکہ اکثر وبیشتر دیگر شعرا بھی ضرور اس صنف میں طبع آزمائی کرتے تھے ۔ بلکہ یوں خیال کرنا چاہیئے کہ جس طرح دکنی شعرا کا لازمہ کوئی مثنوی لکھنا ہوتا تھا اسی طرح مرثیہ کہنا بھی تھا ۔ اگرچہ جن شعرا نے اپنا پیشہ مرثیہ گوئی قرار دیا تھا * * * *

ان کے مرثیوں کی کوئی کثیر تعداد سوائے ہاشم علی اور مرزا کے اب تک دستیاب نہیں ہوئی ہے مگر ان کے نہ ملنے سے یہ نہ تصور کرنا چاہیئے ۔ کہ یہ مرثیہ گو بہت کم طبع آزمائی کرتے تھے ۔ واقعہ یہ ہے ۔ کہ ہماری عدم توجہ سے وہ گوشۂ گمنامی میں پڑے ہیں ۔ اکثر مرثیہ گویوں کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ہر سال طبع آزمائی کرتے اور مجالس عزا میں سنایا کرتے تھے ۔

یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ باوجود مرثیہ گوئی کے رواج اور اس کی کثرت کے کیوں ان کی ترقی نہیں ہوئی ؟

اس کا جواب یہ ہوگا کہ گو لکھنو کے مرثیوں کی طرح فنی حیثیت سے دکنی مرثیوں کو ترقی نہیں ہوئی ۔ مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں کسی اور حیثیت سے بھی کوئی اور ترقی نہیں ہوئی ۔ کیونکہ اسلوب بیان ۔ طرزِ ادا ۔ زبان کی صفائی ۔ ادبی شان ۔ اظہار واقعہ کی جدت ۔ تخیل کی پرواز وغیرہ حیثیت سے وہاں ضرور ترقی ہوئی ہے ۔ بہرحال اردو کی ترقی میں دکنی مرثیے بھی خاص حیثیت رکھتے ہیں ۔ مگر افسوس اب تک ان کا کوئی مجموعہ زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا ۔ نہیں معلوم وہ وقت کب آئیگا کہ یہ نایاب ذخیرہ عام طور پر دستیاب ہو سکے گا ؟

نصیر الدین ہاشمی

رباعیات

یہ تو نہیں سچ آپ سے کچھ دور ہوں میں — ہستی کا فریب خوردہ ہوں مجبور ہوں میں
بس محو خودی ہوں، نہیں کچھ فکر مجھے — جینے کے لئے آپ سے مہجور ہوں میں

انسان ہوں کیا منہ ہے کہ خنداں ہوں میں؟ — بہتر ہے یہی کہ اشک افشاں ہوں میں
ہمجنس پہ ہمجنس ہنسیں ! صد افسوس !! — بیدردئی احباب پہ گریاں ہوں میں

بیتاب

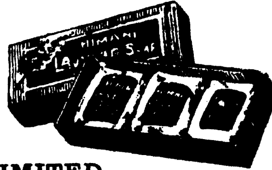
ہمانی لیونڈر سوپ



HIMANI
LAVENDER SOAP

تمام شہرۂ آفاق ٹائلٹ صابونوں سے بہتر ہے اور اُن اجزاء سے تیار کیا گیا ہے، جو دنیا بھر میں صابون کی بہتری اور نفاست کیلئے مشہور ہیں، اس کا استعمال جلد کو صاف اور ملائم رکھتا ہے اور خوبصورتی کو قایم رکھتا ہے، اور بڑھاتا ہے، لیونڈر کی بھینی بھینی خوشبو جو تیار کرتے وقت کثرت سے اس میں ڈالی جاتی ہے، استعمال کے بعد کافی عرصہ تک دماغ کو معطر رکھتی ہے، ہر جگہ فروخت ہوتا ہے،

خط میں ادبی دنیا کا حوالہ ضرور دیجئے



DISTRIBUTORS:
LAURELS LIMITED
Agency Deptt, The Mall, Lahore.

ایجنٹس:- لارلز لمیٹڈ، ایجنسی ڈیپارٹمنٹ، دی مال لاہور

نیشنل انشورنس کمپنی لمیٹڈ

۹- اولڈ کورٹ ہوس سٹریٹ کلکتہ (قایم شدہ ۱۹۰۶ء)

کسی کمپنی میں زندگی کا بیمہ کرانے سے پہلے اُس کے اچھے یا بُرے ہونے کے متعلق خوب اچھی طرح پرکھ لینی چاہیئے۔

ان باتوں میں نیشنل کسی بھی دیگر کمپنی سے گوئے سبقت لیجائیگی

(۱) ہندوستانی سرمایہ، ہندوستانی انتظام اور صرف ہندوستانیوں کے فوائد کیلئے (۲) کمپنی نے کبھی کسی اصطلاحی خامی پر جھگڑا نہیں کیا
(۳) پریمیم کے کم از کم محفوظ نرخ جو کہ زیادہ سے زیادہ انشورنس کی رقم دلاتے ہیں،
نیشنل کھرا اور منصفانہ لین دین کے معاملہ میں موجودہ وقت میں سب سے اول نمبر پر ہے یہ ایماندارانہ پالیسی اس کی قائمی سے ۱۹۰۶ء لگاتار برابر جاری ہے

دی، آر، کھرانہ	آر، ایل، تلی	آر، جی، داس، اینڈ کمپنی
برانچ سیکرٹری	برانچ سیکرٹری مشن	
نیا محلہ راولپنڈی	دی مال لاہور	(اپنے خط میں ادبی دنیا کا حوالہ دینا نہ بھولئے) مینیجرز

(مولوی احمد عبداللہ صاحب ارشد نے مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ادبی دنیا واقع کشمیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا)

رجسٹرڈ ... ۴۸۶ ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد ۴ بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء نمبر ۳

تصاویر:- (۱) (سہ رنگی) پرارتھنا۔ (۲) (یک رنگی) تصادم غرور۔ (۳) حسن طلب۔ (۴) حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد (امام جماعت احمدیہ قادیان) (۵) افلاطون۔ (۶) حضرت کیفی (عالم طفلی میں) (۷) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی (زمانۂ عروج میں) (۸) پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی

حال وقال

پچھلے نمبر میں مولینا عبدالباقی صاحب بی۔ اے رکن ادارۃ نے ادبی دنیا کی مالی مشکلات پر توجہ دلاتے ہوئے قارئین کرام سے ایک ایک خریدار بہم پہنچانے کی درخواست کی تھی۔

میں حال وقال میں اپنا حصہ دیکر لاہور سے باہر چلا گیا تھا۔ میری عدم موجودگی میں مولینا موصوف نے میری مالی مشکلات کو رسوا کر دیا۔ اور ساتھ ہی قارئین 'ادبی دنیا' پر ایک ایک خریدار بہم پہنچانے کی بیگار بھی لگا دی۔ میں اصولاً اس کے خلاف ہوں۔ اس لئے میں اُن کی پیش کی ہوئی درخواست کو واپس مانگتا ہوں۔

'ادبی دنیا' کے معزز خریدار اور محترم ناظرین جو ادبی دنیا کو اپنا پرچہ خیال فرماتے ہیں یا اس کی بقا کو ضروری سمجھتے ہیں وہ درخواست کے بغیر بھی میری مشکلات کو محسوس کرتے ہوئے ادبی دنیا کی اشاعت کے لئے سعی فرماتے رہتے ہیں۔ اور جو مجھے ایک پبلشر اور اپنے آپ کو ایک عام خریدار سے زیادہ اور کچھ نہیں سمجھتے اُن پر ان مینجرانہ عرضیوں کا مطلق اثر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ادبی دنیا کے لئے خریدار بہم پہنچانے اور اشاعت بڑھانے کے لئے چیخ وپکار کی بجائے میں تو صرف اُن کے لئے جو خاموشی کے آئینے میں بھی حال کے خط وخال کو دیکھ سکتے ہیں خاموش رہنا پسند کرتا ہوں۔ ؎

وہ حالِ دل لبِ خاموش سے بھی سُنتے ہیں
یہ جانتا تو نہ شرمندۂ فغاں ہوتا

اس میں شک نہیں کہ ادبی دنیا کی مشکلات اب ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ چکی ہیں اور اس کے گرانبار نقصانات اُٹھاتے ہوئے میرے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں، لیکن خدا کے فضل سے ہمت اور حواس دونوں قائم ہیں۔ اور جب تک یہ ساتھی ساتھ ہیں مستقبل کے بھیانک خطرات کو میں بے حقیقت سمجھتا ہوں۔

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب امام جماعت احمدیہ کی توجہات بیکراں کا میں سپاس گذار ہوں کہ وہ ادبی دنیا کی مشکلات میں ہماری عملی امداد فرماتے ہیں۔ میں نے اُن کی جناب میں امداد کی نہ کوئی درخواست کی تھی، نہ مجھے احمدی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اور نہ ادبی دنیا کوئی مذہبی پرچہ ہے۔ مگر حضرت مرزا صاحب اپنی عزیز مصروفیتوں میں سے علم وادب اور علم وادب کے خدمتگذاروں پر توجہ فرمائی کے لئے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔

ملکی زبان وادب سے جناب موصوف کا یہ اعتنا اُن علماء کے لئے قابلِ توجہ ہے جو اردو ادب کی خدمت کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ آپ نے ادبی دنیا کی مالی مشکلات کی اطلاع سے متاثر ہو کر کچھ خریدار عنایت فرماتے ہوئے ایک تجویز بھی پیش کی ہے جو میں اُنہیں کے الفاظ میں درج کرتا ہوں۔

"میرے نزدیک تو کوئی حرج نہیں اگر آپ معاونوں کی کوئی تعداد مقرر کر کے اُن کے ذمہ کچھ رقم مقرر کر دیں۔ آخر خدمت ادب کے لئے آپ یہ روپیہ لیں گے نہ کہ اپنی ذات کے لئے۔ اگر یہ تجویز منظور ہو تو میں بخوشی حصہ لینے کے لئے تیار ہوں۔"

محترم "میاں صاحب" کی اس مربیانہ ہمدردی کا انتہائی احترام کرتے ہوئے میں اس تجویز کو عملی صورت دینے سے معذرت چاہتا ہوں۔ میری فطرت اس نوع کی تجاویز پر کاربند ہونے سے اِبا کرتی ہے۔ کالج کی ملازمت کے سبب پنجاب کے ہر حصے میں میرے شاگرد موجود ہیں، جن میں سے بہت سے اس اقتدار کے مالک ہیں کہ اگر چاہیں تو اُن میں سے ہر ایک تنہا میری مشکلات کو دُور کر سکتا ہے۔ مشرقی تہذیب کے سائے میں نشوونما پانے کے سبب اس مغربی ادارہ (ڈی۔ ایس کالج) میں رہ کر بھی میں نے اپنے شاگردوں کو اپنے لئے بالکل مشرقی بنا لیا ہے یعنی مجھ میں اور میرے شاگردوں میں استادی اور شاگردی کے وہی غیر فانی اور ناقابلِ شکست تعلقات قائم ہیں۔ جو تاریخ کے صفحات پر شہرت دوام حاصل کر چکے ہیں، لیکن اپنے فداکاروں کی اس فوج در فوج جمعیت کے کسی فرد کو بھی میں نے کبھی اپنی مشکلات پر توجہ دلانا برداشت نہیں کیا۔ عزیز جے ل سنگھ (جس کے نام پر لاہور کا شاندار جمیل تھیٹر تعمیر ہوا ہے اور مال روڈ پر جس کی [illegible] عظیم الشان بلڈنگیں موجود ہیں) میرا شاگرد اور مشرقی انداز میں میرا احترام کرتا ہے۔ اُس کے مجبور کُن اصرار کو رد کرنے میں اس کی آزردگی اور دلشکنی دیکھ کر میں نے اُس کی پیشکش اس حالت میں منظور کی کہ میرے خون کی رفتار سست پڑ چکی

جاتی تھی ۔ اِس ایک استثنا کے سوا مَیں نے کبھی کسی دوست، کسی عزیز اور کسی شاگرد کو اِس گفتگو کا موقعہ نہیں دیا کہ وہ مجھے کسی قسم کی امداد دیں یا رسالے کو خریدیں۔

چونکہ ادبی دنیا ایک تعلیمی پرچہ ہے اور اس کے اصلی سرپرست حضرات اہلِ تعلیم ہیں ۔ لہٰذا اُن سے طلب امداد میں مضائقہ نہیں سمجھتا۔ اور اُنہیں زحمتِ توجہ دیتا رہتا ہوں ۔ مختصر یہ کہ میاں صاحب قبلہ کی مربیانہ ہمدردی اور تجویز کا احترام کرتے ہوئے مَیں تو اُن سے صرف التماسِ دعا کرتا ہوں اور بس کہ

سہارے کی زندگی مجھے مرغوب نہیں ہے

آج سے پندرہ برس پہلے اِسی لاہور میں چار روپے ماہوار کی ایک ٹیوشن سے جس غریب الوطن طالب علم نے اپنی کاروباری زندگی شروع کی تھی ۔ آج پندرہ برس کے بعد وہی بے وطن و بے مددگار چار روپے کا نوکر ۱ ادبی دنیا ۔ ۲ پریم ۔ ۳ اتحاد ۔ اور ۴ شعبۂ تصنیف و تالیف پر پچاس ہزار روپے ہر سال صرف کر دیتا ہے ۔

اِس پندرہ سال کی طویل زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہیں آیا کہ ترقی کی اِس طویل و عریض مسافت کے کسی حصّے کو مَیں نے کسی انسانی مدد سے پھلانگ کر طے کیا ہو ۔ نہیں بلکہ اِس میدان کی ایک ایک انچ مجھے ناپنی پڑی ہے ۔ اور آج میں اپنے ضمیر کا ہمنوا ہو کر یہ کہہ سکتا ہوں ۔ کہ مَیں اپنی ترقیوں میں ــــــ خدا کے سوا کسی کا ممنون نہیں ہوں۔

تو جس خدا نے گذشتہ پندرہ سال کی غریب الوطنی میں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ذلت سے مجھے بچائے رکھا ۔ میری چند روزہ زندگی میں بھی وہ مجھے اپنی رحمت سے محروم نہیں رکھے گا ۔

جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے
جو ہوگا وہ ترے کرم سے ہوگا

ادبی دنیا میں شائع ہونے والی نظموں کا معیار بہت بلند ہو چکا ہے ۔ یہ نظمیں ادبی دنیا کے شائع ہوتے ہی اردو کے اخبارات اور رسالوں میں ایک ایک کر کے ...... نقل کر لی جاتی ہیں ۔ اس سلسلے میں ملی نظموں کا ایک پروگرام تجویز کیا ہے ۔

اردو ادب کے مشہور سحر طراز حضرت فاخر ہریانوی اسلامی تاریخ سے اُن خرد افروز واقعات کو جو ہر قوم اور ہر فرقہ کے لئے سبق آموز بن سکیں ۔ بلند معیار نظموں کی صورت میں پیش کریں گے ۔ حضرت فاخر کی حیرت افزا رنگین نوائی ، ہندوستان گیر قبولیت حاصل کر چکی ہے ۔ کسی تاریخی شخصیت یا واقعہ پر فاخر جب طبع آزمائی کرتا ہے تو اُس کی شاعری ، ساحری نہیں بلکہ الہام میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔

اسلام کی وہ مقدس روایات جو تاریخِ مذاہب کے صفحات میں جگمگا رہی ہیں ۔ اور جن سے متاثر ہو کر جرمنی کے شہرۂ آفاق فلسفی شاعر "گوئیٹے" نے یہ کہہ دیا تھا کہ

"پیغمبر اسلام اگر اپنے آپ کو پیغمبر نہ بتاتے تو ہم اُنہیں خدا مانتے ۔"

اُن انسانیت آموز روایات کو اردو کا الہام بیان شاعر (فاخر) اپنے بے نظیر اندازِ بیان میں دنیا کے سامنے پیش کرے گا ۔

ہندو مذہب کے وہ سبق آموز واقعات جو ہر مذہب کے پیروؤں کے لئے درسِ عمل بن سکتے ہیں ۔ اُن کو جامۂ نظم پہنانے کے لئے مَیں ملک کے مشہور نقاد پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی ۔ پنڈت میلا رام وفا ، حضرت محروم وغیرہم سے درخواست کرتا ہوں ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر مذہب کے مقدس پیشواؤں کے حالات جنہوں نے دنیا میں سچائی اور نیکی کا پرچار کیا ہے دنیا کے ہر مذہب کے پیروؤں کے لئے بے امتیازِ مذہب و ملت شمعِ راہ بن سکتے ہیں ۔ سردار اودے سنگھ شائق وکیل فیروز پور اور سردار کرپال سنگھ بیدار سے بھی ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ گرو نانک اور سکھ مت کے دوسرے پیشواؤں کے سبق آموز واقعات دلکش نظموں میں دُنیا کے لئے پیش کریں گے ۔

پنجاب کے مشہور شاعر حکیم فیروز طغرائی امرتسری کا پچھلے ہفتہ انتقال ہو گیا ۔

مرحوم عربی کے جید عالم فارسی اور اردو کے قابلقدر شاعر تھے ۔ اور امرتسر کی ادبی سرگرمیاں آپ ہی کے دم سے قائم تھیں ۔ مشہور ملی اخبار وکیل امرتسر کے ایڈیٹر تھے ۔ ہم اس صدمے میں مرحوم کے پس ماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی رکھتے ہیں ۔

پچھلے ہفتے انتظامی مشکلات کے سبب ادبی دنیا کی اشاعت میں تاخیر ہوئی ہے ۔ چونکہ اس میں عملے کی غفلت کو دخل نہیں ہے ۔ اِس لئے اِس کی ذمہ داری ہماری بجائے قضا و قدر پر ہے ۔ تقدیر اگر ہماری تدبیر کو اجازت دیگی تو یہ نمبر وقت پر شائع ہو جائیگا ۔

"من کی حقیقت":- اس مبحث پر پہلا دلچسپ مضمون مولانا نعیم الرحمٰن صاحب ایم-اے لیکچرار الہ آباد یونیورسٹی کا شائع ہو چکا ہے۔
اُس کو پڑھ کر ایک بہت بڑے مذہبی ادارے سے ایک عظیم القدر مذہبی پیشوا نے جنہیں کم و بیش پانچ لاکھ امتیوں کی سیادت حاصل ہے۔ ایک سیر حاصل مضمون ارسال فرمایا ہے۔ یہ محققانہ مضمون پہلے مضمون کی توضیح و تشریح ہے۔ ہم مولانا نعیم الرحمٰن صاحب کے ممنون ہیں کہ اُن کی حقیقت نگاری نے ایک عالی جاہ مذہبی رہنما کے خامۂ جواہر چکاں سے ایک بیش بہا مضمون لکھوا دیا۔

اس نمبر میں ملک کے مشہور ادیب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی دو تصویریں شائع کی جا رہی ہیں۔ ایک تصویر اُن کے ادبی نشو و نما کے آغاز کی ہے۔ دوسری حال کی جب کہ وہ آغاز اس ادیب کے ساتھ ہی انجام کی صورت اختیار کرنے کے قریب ہے۔
پنڈت کیفی جنہیں اُن کی گوناگوں علمی فضیلتوں کے سبب علامہ کیفی لکھا جاتا ہے۔ اُن کا خاندان ہمیشہ سے اردو ادب کا خدمتگذار رہا ہے۔ وہ اہلِ زبان ہیں۔ زبان دان ہیں۔ محقق السنہ ہیں۔ اردو اُن کی مادری زبان ہے۔ فارسی میں نظم و نثر پر یکساں درجہ کی مہارت رکھتے ہیں۔ پرانے مکتب کے طالب العلم ہیں۔ اس لئے عربی بھی بقدر ضرورت پڑھی ہے۔
مذہب نے سنسکرت اور ہندی کی تعلیم دلائی۔ پنجاب کو وطن اقامت بنایا تو پنجابی کو سیکنڈ لینگویج (ثانوی زبان) کے طور پر سیکھا۔ انگریزی حکومت کی زبان تھی۔ اُسے بھی منہ لگائے بغیر چارہ نہ تھا۔ بلکہ منہ کے ساتھ اُس سے تو دل بھی لگانا پڑا۔ اردو فارسی کی طرح انگریزی بھی مصنفانہ انداز میں لکھتے ہیں۔ علامہ کیفی کی ہفت زبانی تحصیل زبان ہی تک محدود نہیں بلکہ مذکورہ بالا زبانوں میں ہر زبان کے لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں۔ بڑی بڑی ریاستوں میں ذمہ دارانہ مناصب پر فائز رہے۔ مگر فرضِ منصبی کے ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔
اردو زبان کو اس شدت وحدت کے ساتھ اپناتے ہیں کہ
"مسلمانوں کو اردو کبھی نہ آئے گی۔ اردو میں لکھنے بولنے اور پڑھنے کا حق تو صرف ہندوؤں کو ہے۔"
اِس ادعا پر اُن کے قدم چومنے کو جی چاہتا ہے۔ دلی کے اُس اسکول کے طالب علم ہیں۔ جس سے ذکاءاللہ اور نذیر احمد فخرِ روزگار بن کر نکلے۔ اُسی تہذیب میں پرورش پائی ہے۔ جس کے رنگ میں آزاد و حالی رنگے ہوئے تھے۔ تہذیب قدیم کی اُس بقیۃ الموت ہندو نسل کے ایک ممبر ہیں جس نے ہندو مسلمان میں کبھی امتیاز روا نہیں رکھا جنکی مشترقیت مشرق کے فنا ہونے کے بعد بھی قائم ہے۔ جو نئے دور کے مہابیری ہندوؤں اور علی غزلی مسلمانوں کے درمیان ایک کڑی۔ ایک رابطہ۔ ایک صلح و آشتی کا پیغام ہے۔ اور جو ہندوستانیوں کی بدقسمتی سے اب ہندوستان سے منقطع ہونے کے قریب ہے۔
اسی عالی نسل کا ایک قابلِ فخر ممبر سر تیج بہادر سپرو ہے۔ اور اُسی برگزیدہ نسل سے ہندوستان کا وہ بے مثل مدبر — بے نظیر قانون دان اور بے عدیل رہنما تھا۔ جسے بھارت ورش
"موتی لال نہرو"
کے نام سے یاد کر کے روتا ہے۔

علامہ کیفی قدامتِ عمر اور قدامتِ تہذیب کے ساتھ قدامتِ خیال سے کوسوں دور ہیں۔ برش کو آغا حیدر حسن دہلوی کی طرح کپڑا کچی نہیں کہتے۔ برش ہی بولتے ہیں۔ اردو زبان میں زمانے کے حالات و خیالات کے ساتھ تغیر و تبدل کی ضرورت تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ اردو نظم و نثر کو ترقی یافتہ زبانوں کے ڈگر پر لانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی عثمانیہ یونیورسٹی۔ پنجاب لٹریری۔ لیگ وغیرہ میں علامہ کیفی نے جو محققانہ مضامین پڑھے اُن سے اُنکی عمیق نظری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔
آجکل فصاحت و بلاغت پر ایک ضخیم اور نادر تصنیف کی تکمیل میں مصروف ہیں۔
پنجاب یونیورسٹی میں اردو لیکچرار کی جگہ نکلی تھی۔ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کو بصیرۃ ملی ہوتی تو اس بے مثل ادیب کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے کہ اس سے موزوں تر آدمی یونیورسٹی کو میسر نہ آسکتا تھا مگر ہُوا ہو اس مذہبی سوال کا کہ یہ تعلیمی اداروں میں بھی دراندازی ہو جاتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کی اسی بے بصیرتی کا سبب ہے کہ یہاں عربی کی طرح اردو کی بھی مٹی پلید ہو رہی ہے۔
پنجاب جو اس وقت اردو زبان کا سب سے بڑا اشاعتی مرکز ہے اُس کی یونیورسٹی میں اردو زبان کی تعلیم کا کوئی درخورِ اعتنا انتظام نہیں ہے۔
ہم توقع کرتے ہیں کہ جامعہ عثمانیہ علامہ کیفی کی قابلقدر خدمات سے فائدہ اٹھائیگی۔

ادبی دنیا کے متعلق ایک گمنام تنقید وصول ہوئی ہے۔ تنقید نگار نے زہر خند انداز میں مضامین پر تنقید کی ہے۔ مگر دلسوزی کے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔ ہمیں اُن کے بعض خیالات سے اتفاق نہیں۔ لیکن اُنہیں یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اُن کی اس بے لاگ تنقید کو ہم قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اور مقدور بھر اس سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ اسی کے ساتھ اُن کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ اسی طرح ادبی دنیا کے ہر نمبر پر تنقید فرما کر رسالہ کی خامیوں اور ہماری خام کاریوں پر ہمیں مطلع فرماتے رہیں۔

"خدا اُس شخص پر اپنی رحمت نازل فرمائے جو مجھے میری خامیوں پر متنبہ کر دیا کرے۔" (خلیفہ عمر فاروق)

پروفیسر گنگا رام کوہلی ایم۔ اے نے "موہنی انک" کے نام سے ایک سیاہی تیار کی ہے۔ اس سیاہی کے استعمال کے بعد کوئی شخص دوسری کسی سیاہی کو استعمال نہیں کرے گا۔ بلو بلیک اور قسم قسم کی سیاہیاں بازار میں بکتی ہیں مگر "موہنی انک" میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کاغذ پر پھیلتی نہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس سیاہی کے لکھے ہوئے حروف پر پانی ڈالا گیا۔ پھر اُن حروف کو پانی سے مٹانے کی کوشش کی گئی، مگر پانی ڈالنے اور پانی سے مٹانے کی کوشش سے اُن حروف کی سیاہی مطلق نہیں پھیلی۔ اور نہ حروف میں کسی قسم کی بدنمائی پیدا ہوئی۔ دوسری کسی سیاہی میں یہ خوبی نہیں دیکھی گئی۔ اودے اور سرخ رنگ کی موہنی انک بھی اپنی خصوصیات کی حامل ہے۔ پروفیسر صاحب کی اس کامیاب ایجاد پر ہم انہیں مبارکباد دیتے ہیں۔ ضرورتمند حضرات اس سیاہی کی خرید و فروخت کے متعلق حسب ذیل پتے پر خط و کتابت کریں:۔ لالہ گنگا رام کوہلی ایم اے سائنس پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور۔

ادبی دنیا میں تحقیق طلب ادبی سوالات کا سلسلہ جاری کرنے کے متعلق محترم حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب امام جماعت احمدیہ کی ایک نہایت مفید تجویز ایک مضمون کی صورت میں اس نمبر میں شائع کی جا رہی ہے۔ ادبی دنیا کے پہلے نمبر میں جو ادبی پروگرام شائع ہوا تھا۔ اُس کی ایک شق اسی تجویز کے مطابق تھی۔ ابتدائی پرچوں میں بزم تحقیق کے نام سے ایک مضمون تحقیق طلب ادبی مسائل کے متعلق درج ہوا کرتا تھا مگر وہ سلسلہ میری انتظامی مصروفیتوں کے سبب جاری نہ رہ سکا۔ حضرت مرزا صاحب قبلہ کی مذکورہ تجویز ایک ضروری اور وسیع ادبی پروگرام کو حاوی ہے۔ ہم اُن کی خدمت میں مودبانہ درخواست کرتے ہیں۔ کہ اس مفید سلسلے کا افتتاح بھی وہ اپنے ہی قلم سے فرمائیں۔ اس سلسلے کے لئے بزم تحقیق ایک جامع و مانع عنوان ہے۔ ملک کے دوسرے ارباب تحقیق کو بھی اس نہایت ضروری اور اہم سلسلہ بحث میں حصہ لینے کی ضرورت ہے۔

علامہ عبداللہ عمادی، علامہ عبداللہ یوسف علی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ مولانا عبدالحق، حضرت کیفی دہلوی، علامہ طبا طبائی، اور ملک کے دوسرے صائب الرائے اہل قلم ان مباحث ادبیہ میں حصہ لے کر اردو ادب کو ترقی دینے کی سعی فرمائیں۔ کہ

"گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے"

نیرنگ خیال حکیم یوسف حسن ایڈیٹر نیرنگ خیال کو ہر اُس آدمی سے خدا واسطے کا بیر ہو جاتا ہے۔ جسے وہ اپنے خیال میں

(۱) نسبی حیثیت سے بلند۔

(۲) علمی حیثیت سے مسلم الثبوت۔

(۳) صحافتی حیثیت سے کامیاب۔

(۴) اور ادبی حیثیت سے قادر التحریر۔ سمجھتے ہوں۔ انہیں حیثیات کو مدنظر رکھ کر اُنہوں نے اپنی موت کا نام تاجور اور اُس بیماری کا نام جو اُن کے لئے موت کا پیام بنکر آنکلی ادبی دنیا رکھ دیا ہے۔

لاہور جہاں ہر شخص ان سے واقف ہے۔ اس فضا میں کوئی پڑھا لکھا آدمی ان کو مخاطب بنانے کا ایثار نہیں کر سکتا۔ لیکن لاہور سے باہر کی دنیا جو ہر ایڈیٹر کو قابلیت و شرافت کا مجسمہ اور وقار و انسانیت کا پتلا سمجھتی ہے۔ حکیم یوسف حسن کی جامع حیثیات سے بے خبر ہونے کے سبب ان کے فریب آمیز پروپیگنڈے سے مغالطے میں پڑ جاتی ہے۔ اسی لاہور میں ہمایوں۔ عالمگیر، اور مخزن کے علاوہ درجنوں رسالے ہیں سب کامیابی سے جاری ہیں۔ ہر رسالہ اپنی حیثیت کے مطابق اردو ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ کسی کو کسی کا رونا نہیں ہے۔ مگر جتنے اردو رسالے لاہور سے جاری ہیں اُسی تعداد میں حکیم صاحب کے کلیجے میں ناسور رس رہے ہیں۔ اور ادبی دنیا نے تو مستقل طور پر اُن کی صحت خراب کر رکھی ہے۔

اردو رسائل کو مسلسل خاموشی اور اس یقین کی بنا پر کہ کوئی معاصر ایڈیٹر نیرنگ خیال کی سطح پر اُترنے کو کسی طرح آمادہ نہیں ہوگا اور نیرنگ خیال

آئینۂ عالم

آہ پنڈت موتی لال نہرو! :-

ابھی مولٰینا محمدؐ علی کی وفات کے زخم ہرے ہی تھے کہ ۶ فروری کی صبح کو یہ رُوح فرسا خبر ملی " پنڈت موتی لال نہرو کا انتقال ہوگیا"۔ اِس میں شک نہیں کہ یہ نہایت الم انگیز واقعہ ہے، اور ہندوستان آج اِس پر جتنا بھی نوحہ کناں ہو، کم ہے۔

پنڈت موتی لال نہرو کے سیاسی مسلک سے کسی کو خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، ان کا بدترین مخالف بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے لائق ترین مدبروں کی صفِ اوّل میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ سابق وزیر ہند ارل ونٹرٹن نے ایک موقع پر سچ کہا تھا کہ

" پنڈت موتی لال نہرو۔ برطانی تدبر کا مسکت جواب ہیں"۔

پنڈت موتی لال نہرو اُن چند ہندی زعماء میں سے ہیں۔ جن پر نہ صرف کانگرس کو بلکہ تمام سیاسی جماعتوں کو اعتماد تھا۔ وہ پرانی اور نئی نسل کے درمیان ایک سنہری پل تھے۔ اور مہاتما گاندھی کی قومیت اور اپنے فرزند پنڈت جواہر لال نہرو کی اشتراکیت کے درمیان خلیج پاٹنے کا کام دیتے تھے۔ دہلی کی اسمبلی آج اِس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ جس شان اور جس آن بان سے پنڈت موتی لال نہرو نے اپنے فرائض رکنیت انجام دیے، وہ کچھ انہی کا مخصوص حصّہ تھی۔ سر ولیم ولسنٹ کا جاہ وجلال اور اقتدار جو ان کے جانشینوں کو پھر کبھی حاصل نہ ہوا، سر میلکم ہیلی کا حُسنِ بیان اور زورِ خطابت، مسٹر جناح کے مخصوص پارلیمنٹری عادات اور مظاہرے، مسٹر جیکار کی جادو بیانی، جس نے انہیں اسمبلی کا "ستارہ" بنا رکھا تھا۔ پنڈت مالویہ کی دلکش طرزِ خطابت اور روانی تقریر، کی اہمیت اپنی اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ مگر جس شان، جس قابلیت کے ساتھ پنڈت موتی لال نہرو نے اسمبلی کے فرائض رکنیت انجام دیے۔ وہ ان میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ ہندوستان کی آئینی تاریخ پنڈت موتی لال نہرو کی ان خدمات کو کسی طرح نظر انداز نہیں کرسکتی کہ انھوں نے ہندوستانی اسمبلی کو دوسرے ممالک کی پارلیمنٹوں کے ہم پلہ بنانے میں پہل کی۔ اور بے نظیر قابلیت کا ثبوت دیا۔ پنڈت موتی لال نہرو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ جماعتی تعصبات سے بالا تھے۔ مولوی محمدؐ یعقوب مرادآبادی نے پنڈت موتی لال نہرو سے شدید اختلاف کے باوجود کیا خوب کہا ہے۔

" وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو منسلک کرنیوالی زنجیر کی حیثیت رکھتے تھے۔"

وہ کوہ وقار انسان جس کا نام پنڈت موتی لال نہرو تھا۔ اپنی زندگی کے اصولوں کا ایک سورما تھا۔ پنڈت موتی لال کے اصولوں کی چٹان پر ہزارہا خود غرض اشخاص کی کشتیاں ٹکرا ٹکرا کر غرق ہوجایا کرتی تھیں۔ عمر کا ایک بڑا حصّہ انھوں نے قانون وآئین کی خدمت میں صرف کیا۔ پھر جب اُن کی فطرت عالی نے اپنے لئے ایک وسیع تر میدان عمل مانگا تو وہ سیاسیات کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اِس عزم و قوت کے ساتھ متوجہ ہوئے۔ کہ اپنی بقیہ زندگی معہ اُن تمام آسائشوں اور راحتوں کے جو انہیں میسّر تھیں یک قلم قربان کردی۔ وہ امرا اور رؤسا، کی محفل سے اُٹھ کر، فرش خاک پر آ بیٹھے۔ ہم نے ان پنڈت موتی لال کو بھی دیکھا تھا جو سیاسیات کے گذشتہ ہنگامۂ عظیم سے پہلے، ایک عالی شان ایڈوکیٹ، ایک اولوالعزم رئیس اور ایک بلند مقام شخص تھے۔ اور پھر ہم نے اُن کھدر پوش پنڈت موتی لال کو دیکھا، جن کی صبح اور شام کچھ سے کچھ ہوگئی تھی۔ اُن کی زندگی کی صبح مسند پر ہوئی اور اُس کی شام نقیر کے بور یئے پر! یہ انقلاب عظیم محض سیاست و معاشرت کا انقلاب تھا۔ انسانیت کا جوہر تو وہی تھا، جو خدا کا دیا لے کر وہ دنیا میں آئے تھے اور اپنے ساتھ شمشان بھومی میں لے گئے۔ اُن کی فطرت عالی کبھی زرلفت اور کھدر کے اختلاف سے متاثر نہ ہوسکتی تھی۔ خدا نے انہیں جو کچھ عطا کیا تھا، بہت عطا کیا تھا، اُن کے لئے عطاء الٰہی مقدار میں محدود نہ تھی۔ دولت بہت کمائی اور بہت صرف کی، عزت بہت حاصل کی اور آخر وقت تک اسے محفوظ رکھا محبت دوسروں سے اپنے لئے حاصل کی۔ اور بے اندازہ حاصل کی۔ اسی

طرح اپنے دل کی محبت دوسروں کو بخشی اور بے اندازہ بخشی! جذبۂ قومی انہیں سیاسیات کی قربانگاہ پر لایا، تو کچھ نہ تھا - جو انہوں نے قربان نہ کر ڈالا ہو - یہ فقیر منش انسان اپنی دل کی سلطنت میں کتنا بڑا شہنشاہ تھا! اللہ! اللہ!

مشرق و مغرب کے آئندہ تعلقات:-

برٹرنڈ رسل رسالہ " اورینٹ " میں تحریر فرماتے ہیں:-

کسی جدید ملک میں مطبع بھی بہت مضرت رساں چیز ہے - سوائے ان مقامات کے جہاں اس کی باتوں پر یقین نہیں کیا جاتا - مطبع بہت مضرت رساں اثرات پیدا ہو رہے ہیں - اگر صنعتی نظام کا دور دورہ ہوگیا تو ایشیا نظام تعلیم اور مطبع کی دوہری لعنت میں گرفتار ہو جائیگا - یورپ اور امریکہ کے مقابلہ میں جارحانہ قومیت کا پیدا ہونا بھی لابدی ہے - آج بھی یہ جاپان میں اپنی انتہائی شکل میں موجود ہے - ہندوستان میں یہ جذبہ بیدار کیا جا رہا ہے - اور اگر بیرونی چیرہ دستیوں سے نجات حاصل کرنا ہے، تو چین بھی یقینی طور پر یہ حربہ استعمال کرے گا -

اس اثنا میں مذہب کی کیا حالت ہوگی؟ مغرب اس سوال کا عملی جواب دے رہا ہے - حضرت مسیح کی تعلیمات بدھ کی تعلیمات کی طرح نہایت پر امن ہیں - لیکن آج مسیحیت کی تبلیغ کے لئے جس جوش کا اظہار کیا جا رہا ہے - اس سے مغربی اہمیت زیادہ بڑھتی جاتی ہے - مشرق میں بھی یہی حال ہے - چونکہ صنعتی نظام کا لازمی نتیجہ قومیت ہے - مذہب زیادہ تر قومیت کے قومی اقتدار کے لئے محرک کی حیثیت رکھیگا - خواہ اس مذہب کی تعلیمات میں امن اور شانتی پر کتنا ہی زور کیوں نہ دیا گیا ہو - اگرچہ میں مشرقی تہذیب کو مغربی تہذیب سے بہتر سمجھتا ہوں - لیکن مجھے امید نہیں کہ ان دونوں تہذیبوں میں سے کوئی بھی سوائے مذہب کے اپنے عناصر قائم رکھ سکے - مذہب میں بھی اگرچہ برائے نام کوئی تبدیلی نہ ہوگی - لیکن عملی طور پر اُس کا تعلق عالم بالا سے بہت کم رہ جائیگا - مذہب ریاست کا ویسا ہی خدمت گذار ہو جائیگا جس طرح کسی فوجی افسر کی باندی" خدا نہ کرے ایسا ہو - کیونکہ مشرق کی سچی ترقی کا انحصار سچی روحانیت اور سچی مذہبیت پر ہے -

چینی قوم کی اہمیت:-

چین کی موجودہ حیثیت ادنیٰ نو آبادی کی سی ہوگئی ہے - مگر اس سے پہلے چین ایک زبردست اور مہذب سلطنت تھی - اس کی حیثیت آج کے برطانیہ، امریکہ، فرانس اور جاپان کی حیثیت سے متشابہ تھی - مگر جن باتوں نے چینی قوم کو ایسی زبردست اور طاقتور سلطنت بنایا تھا۔ وہ فوجی قوت، اور ساتھ ہی ساتھ تہذیب اور تمدن کا چرچا - ان کے علاوہ اخلاقی خوبیاں تھیں - مگر موجودہ زمانے میں غیر قوموں کی سیاسی اور معاشی دباؤ سے اور ان کی تہذیب کے سیلاب سے یہ تمام خوبیاں زیادہ نمایاں نہیں معلوم ہوتیں -

جہانتک قومیت کا تعلق ہے چینی قوم کی مثال بالکل ہوا میں اُڑتی ہوئی ریت کی طرح ہے - انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ قومیت کیا چیز ہے - مگر اس کے برعکس خاندانی اور قبائلی جمیعت منظم اور مضبوط ہے اور ان میں خاندانی اور قبائلی پرستش کا خیال نہایت بلند اور پختہ ہے - مثلاً اگر دو اجنبی شخص کہیں رستے میں ملیں اور انہیں یکایک یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ایک ہی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں - تو وہ ایک دوسرے کو فوراً "چچا بھائی" سے مخاطب کرنے لگتے ہیں - ان کے اسی نظریہ کی اگر توسیع کی جائے تو یقین ہے کہ ان کی وطنی جمیعت بھی اسی طرح مضبوط اور قوی ہوگی، جس طرح ان کی خاندانی اور قبائلی جمیعت ہے - اگر چینی اپنی مفقود قومیت کو زندہ کرنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ سب سے پہلے ملک کی ان تمام چھوٹی مگر منظم خاندانی اور قبائلی جماعتوں کی شیرازہ بندی کریں - تاکہ ایک قومی جمیعت بن سکے - جو دوسروں سے ان کی انفرادی قومی ہستی کا اعتراف کرائے -

ایران کی بیداری:-

مشرق کی عام بیداری نے آخر ایران کی مست اور مدہوش قوم پر بھی اثر کیا - اور اُس نے خاندان قاچار کی جابرانہ حکومت کا خاتمہ کر دیا - وہاں کے جدید تعلیم یافتہ نوجوان اس مستبدانہ حکومت سے سخت عاجز تھے - اس وجہ سے انہوں نے ایران سے باہر انگلستان جرمنی اور مصر وغیرہ میں اپنے مرکز قائم کئے تھے - اور خاندان قاچار کی پُرجوش مخالفت کی -

زعیم ایران رضا خاں پہلوی کی شخصیت ایران میں تقریباً وہی ہے جو غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی ترکی میں ہے یا امان اللہ خاں کی کابل میں تھی - اور کچھ بعید نہیں کہ اس محب قوم سپہدار کے عہد میں

خدا، ایرانیوں کو ترقی کے صحیح رستہ پر ڈال دے - اس وقت ایک بڑا خطرہ مجتہدین اور علماء نجف اشرف و کربلا کی طرف سے ہے، جو اکثر دوسروں کا آلۂ کار بن جاتے ہیں - اور اپنی ذاتی منفعت کی امید پر ملک و ملت کے نقصان کی پرواہ نہیں کرتے - لیکن رضا خاں کے عزم صمیم کو دیکھتے ہوئے یہ پیش گوئی کی جاسکتی ہے - کہ جس طرح غازی مصطفٰے کمال نے اس جماعت کو مغلوب کرلیا - اسی طرح وہ بھی ان پر قابو حاصل کریں گے -

اہل ایران ذہین طباع اور دل و دماغ والے لوگ ہیں - ان کی ترقی افغان بلکہ ترکوں سے بھی زیادہ سریع ہوگی -

روسی انقلاب -

روسی انقلاب غالباً دور حاضر کے تاریخی واقعات میں سب سے اہم واقعہ ہے - دوسری انقلابی تحریکوں کی طرح اس عظیم الشان انقلاب میں بھی تخیل کی بلند پروازی اور حقیقت کی اٹل دشواریاں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوئیں - "اشتراک" جس کا علمبردار روسی انقلاب تھا - صرف ایک اصول کی حکومت چاہتا ہے - یعنی عقل کی! سرمایہ داری نے کاروباری زندگی کے جس گوشہ میں عقل کو فرمانروا بنایا تھا - "اشتراک" اس پر قانع نہ تھا - اور وہ زندگی کے تمام شعبوں کو اس سے سپرد کرنا چاہتا تھا - طاقت و اقتدار کے اصول کو حرام جانتا تھا اور محبت کے دعاوی کو حرف غلط سمجھتا تھا، اس کی صدا تھی، عقل، عقل، عقل!!

ابھی روسی انقلاب کے نتائج پر کوئی فیصلہ کن رائے نہیں دی جاسکتی - مگر اس قدر ضرور کہا جاسکتا ہے کہ وہ دنیا سے شخصی ملکیت کو مٹانے کے لئے آیا، اور اس نے دنیا کی سب سے بڑی کسان آبادی کے لئے زمین کو کسان کی شخصی ملک بنا دیا - انقلاب پسندی کی روح بھیس بدل کر نکلا - اور قدامت پسندی کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوا - ٹروٹسکی اس کا علمبردار تھا - مگر وہ خود اسٹالین کے سامنے نہ ٹھہر سکا - دیکھئے مستقبل کے فیصلے کیا ہوتے ہیں!

ہمارا ہندوستان!

ہمیں بڑی مسرت ہے کہ حکومت اور کانگرس میں اب پھر گفتگوئے مصالحت ہو رہی ہے - مہاتما گاندھی ایکبار ہز اکسلنسی وائسرائے سے شرف ملاقات حاصل کرچکے ہیں - امروز فردا میں وہ دوسری مرتبہ وائسرائے سے ملنے والے ہیں -

یہ ہم یقین کے ساتھ کہیں گے کہ دسمبر ۱۹۲۹ء میں لارڈ ارون اور مہاتما گاندھی اور پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی میں جو ملاقات ہوئی تھی - اس میں کانگرسی رہنماؤں کا رویہ غیر مناسب تھا - اور حکومت کی طرف سے بھی کسی خوشگوار اقدام کا ثبوت نہیں دیا گیا تھا - یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ اس مرتبہ اس تلخ تجربہ کا اعادہ نہ ہوگا - ہمیں امید ہے کہ ہز اکسلنسی وائسرائے صرف وائسرائے، کی حیثیت سے مہاتما گاندھی سے تبادلۂ خیالات نہیں کریں گے، بلکہ "لارڈ ارون" کی حیثیت سے بھی مسائل کے تصفیہ کی کوئی صورت نکالیں گے - لارڈ ارون اپنی جن ذاتی خصوصیات کے لئے ممتاز ہیں - امید ہے کہ اس موقع پر اُن کا عملی اظہار کیا جائے گا -

آج تمام ملک دعاگو ہے کہ یہ دو مخلص ترین مدبر مسائل کا کوئی ایسا حل دریافت کرلیں جو حکومت برطانیہ اور ہندوستانی وطنیت میں مفاہمت کی شکل میں ظاہر ہو - وائسرائے چند ہفتے کے بعد اپنے عہدۂ جلیلہ سے سبکدوش ہو جائیں گے - ہماری یہ آرزو ہے کہ اس وقت وہ کہہ سکیں کہ میں نے ایک غیر مطمئن، غیر قانع اور جنگجو، ہندوستان کی زمام حکومت سنبھالی تھی - اور آج میں لارڈ ولنگڈن کے لئے قانع، مسرور اور امن پسند ہندوستان چھوڑ رہا ہوں - اگر اس مرتبہ بھی صلح کی کوششیں ناکام رہیں، تو یہ حقیقت ہے کہ تاریخ ہند، برطانیہ اور ہندوستان دونوں کے تدبر اور سیاسی فہم و فراست پر ماتم کرے گی - ہمیں امید ہے کہ نیا مہینہ ہندوستان کے لئے نئی مسرتوں کا پیغام لائیگا -

عرب کے صحرا کی تسخیر :-

دنیا کے مشہور سیاح اور مستشرق مسٹر برٹ ریم طامس نے عرب کے جنوبی صحرا (ربع الخالی) کو طے کرلیا ہے - یہ صحرا دنیا کے ان عظیم اور وسیع ریگستانوں میں سے ہے - جن میں آج تک اولاد آدم کا گذر نہیں ہوا - اس کا عرض شمالاً جنوباً ۶۵۰ اور طول شرقاً غرباً ۸۵۰ میل ہے - مسٹر طامس نے اس علاقے میں اونٹ پر سفر کیا - سیکڑوں میل وہ بے آب و گیاہ علاقوں میں سے گذرے - ان کی یہ سیاحت دنیا کی دشوار گذار اور مشکل ترین جغرافیائی مہم خیال کی جاتی ہے -

ادارہ

تصحیح

زَعم

کسی کمال کے متعلق کوئی غلط ادّعا کرے تو کہا کرتے ہیں کہ اُسے اپنے متعلق یہ زعم ہے۔ اِس لفظ کا تلفظ عموماً غلط کیا جاتا ہے زعم کے لفظ میں حرفِ **ز** کو لوگ عام طور پر مضموم (پیش دے کر) بولتے ہیں۔ حالانکہ **ز** پر پیش نہیں ہے زبر ہے۔

صحیح تلفظ یہ ہے

زَعم

تاجورؔ

من کی حقیقت

ادبی دنیا کے جنوری نمبر میں مولوی نعیم الرحمٰن صاحب ایم اے پروفیسر الٰہ آباد یونیورسٹی کا ایک مضمون من کی ماہیت کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اس امر پر بحث کی ہے کہ بنی اسرائیل پر جو من نازل ہوا تھا اس کی حقیقت کیا تھی۔ انہوں نے اوّل تو توارۃ کے بعض حوالے نقل کر کے بتایا ہے کہ توارۃ کی رو سے من اور اس کے نزول کی حقیقت کیا تھی۔ پھر طبی طور پر من کی جو ماہیت بتائی جاتی ہے وہ بیان کر کے بتایا ہے کہ توارۃ میں من کی بیان کردہ حقیقت طبی تفصیلات کے مطابق نہیں۔

مجھے یہ مضمون پڑھ کر خوشی ہوئی کہ مسلمانوں میں بھی علمی تحقیق کا ذوق پیدا ہو رہا ہے۔ اور وہ اس حالت جمود سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں جو "یہ کیا ہے" کہنے سے باز رکھ رہی تھی اور اس خوشی میں اس مضمون کے متعلق میں بھی بعض باتیں کہنی چاہتا ہوں۔

بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر کنعان کی طرف آئے تو جس علاقہ میں سے اُنہیں گزرنا پڑا وہ بہت غیر آباد تھا، اور دُور دراز فاصلہ پر بعض شہر آباد تھے۔ اب تک یہ علاقہ ایسا ہی ہے۔ اور اب بھی اس علاقہ سے گزرنا آسان نہیں فلسطین پر انگریزی قبضہ کی وجہ سے اب اس علاقہ میں ریل جاری ہوگئی ہے اور سفر میں سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں، لیکن اس کی غیر آبادی میں کوئی فرق نہیں آیا کیونکہ یہ علاقہ آبادی کے قابل زمینوں سے خالی ہے اور بے آب و گیاہ میدانوں پر مشتمل ہے۔ ترکوں نے جنگ عظیم میں بہت کوشش کی کہ کسی طرح مصر میں داخل ہو کر انگلستان اور ہندوستان کے تعلقات کو قطع کر دیں لیکن پانی کی دقت اور سامان خورد و نوش کی کمی کے سبب عقلوں کو حیرت میں ڈالدینے والی قربانیوں کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انگریزوں نے بھی شروع میں بہت زور مارا لیکن خشک اور چٹیل میدانوں کی وجہ سے وہ بھی سویز کے راستہ سے فلسطین میں داخل نہ ہو سکے۔ آخر جنرل ایلنبی نے نیل سے پانی لے کر سویز کے اوپر سے نلوں کے ذریعہ سے پانی گذارا اور اس علاقہ کو جو بڑے شہروں کے لئے ناقابل گزر تھا قابل سکونت بنا دیا۔

صلیبی جنگوں کے وقت جب فلسطین اور شام کے محاذ پر یورپ کی تمام اقوام کے منتخب بہادر اس نیت سے ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ کہ اسلام کے بڑھنے والے سیلاب کو روک دیں۔ اس وقت بھی دشت سینا مسلمانوں اور مسیحیوں سے رستہ دینے کا ٹیکس لیتا رہا تھا۔ نویں صدی کے آخر اور دسویں صدی کے ابتدائی حصہ میں نہ معلوم کتنے اسلامی اور مسیحی لشکر پانی نہ ملنے اور کھانے کی کمی کے سبب اس دشت میں تباہ ہو گئے تھے۔

پانی کی کمی کے سبب گزرنیوالے قافلوں کو لازماً ان چشموں یا تالابوں کے پاس سے گزرنا پڑتا تھا جو کہیں کہیں اس دشت میں پائے جاتے تھے اور اس وجہ سے جو فریق بھی غالب ہوتا تھا اُسے دوسرے فریق کے آدمیوں کو مارنے کا ایک آسان بہانہ مل جاتا تھا کیونکہ تھوڑے سے آدمی ان چشموں یا تالابوں پر مقرر کر دینے سے اس بات کی کافی ضمانت ہو جاتی تھی کہ حریف کے آدمی نقصان اٹھائے بغیر مصر سے فلسطین کی طرف نہیں جا سکتے چنانچہ اُسامہ بن منقذ اپنی کتاب الاعتبار میں لکھتے ہیں۔ کہ الجعفر نامی چشمہ جو مصر اور فلسطین کے درمیان تھا کبھی کسی وقت فرنگیوں سے خالی نہیں ہوتا تھا ہمیشہ اس جگہ سے لوگوں کو بچ کر جانا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ انہیں سیف الدین ابن سالار وزیر مصر نے شاہ نورالدین کے پاس بھیجا کہ وہ طبریہ پر حملہ کریں تو ہم مصر سے غزہ پر حملہ کر کے فرنگیوں کو وہاں قلعے بنانے سے روکدیں وہ کہتے ہیں کہ جب ہم الجعفر چشمہ پر پہنچے تو اتفاقاً فرنگی اس وقت وہاں موجود نہ تھے۔ لیکن طے قبیلہ میں سے بنو اُبیّ خاندان کے کچھ لوگ وہاں تھے جن کے جسم پر چمڑے کے سوا گوشت کا نام و نشان نہ تھا۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور بالکل بدحال ہو رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ یہاں کس طرح گذارہ کرتے ہو تو اُنہوں نے جواب دیا کہ مردار کی ہڈیاں اُبال کر اس پر گزارہ کرتے ہیں۔ اور کوئی چیز کھانے کی یہاں نہیں ہے۔ ان کے کتے بھی اسی پر گذارہ کرتے تھے۔

ہاں گھوڑے چشمہ کے اردگرد کی گھاس پر گذارہ کرتے تھے، اُسامہ لکھتے ہیں کہ مَیں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ تم لوگ یہاں اس حالت میں کیوں پڑے ہو دمشق کی طرف کیوں نہیں چلے گئے تو انہوں نے جواب دیا کہ اس خیال سے کہ وہاں کی وباؤں سے ہمیں نقصان نہ پہنچے، اُسامہ حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ کیسے بے وقوف لوگ تھے، ان کی اس وقت کی حالت سے بڑھکر وبا کیا نقصان پہنچا سکتی تھی -

میری غرض اس واقعہ کے ذکر سے یہ ہے کہ دشت سینا ایک ایسا خطرناک علاقہ ہے کہ بڑی جماعتوں کے لئے بھی بغیر خاص انتظام کے اس میں سے گزرنا مشکل ہے اور اس میں قیام کرنا تو اور بھی مصیبت ہے - پھر بنی اسرائیل جن کے بیس سال سے زائد کے جوانوں میں سے جنگی خدمت کے قابل مردوں کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ بتائی گئی ہے - اور جو بے سروسامانی کی حالت میں مصر سے بھاگے تھے اس علاقہ میں سے کسطرح گزرے اور کسطرح اڑتیس سال تک اس علاقہ میں انہوں نے بسر کیا، یہ ایک ایسا سوال ہے جو صدیوں سے دنیا کو حیرت میں ڈال رہا ہے -

بائیبل نے اس کا جواب مَن کے نزول اور حورب کی چٹان میں سے بارہ چشموں کے پھوٹنے کے معجزہ سے دیا ہے وہ بتاتی ہے، کہ اس مظلوم قوم کی خدا تعالےٰ نے مدد کی اور اپنے فضل سے اس نے ان کے لئے کھانے اور پینے کا سامان مہیا کیا - مَیں اس وقت پانی کی تحقیق کو چھوڑتا ہوں اور مَن کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ اس کی حقیقت زیرِ بحث ہے -

بائیبل کا بیان پڑھنے کے بعد طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ (۱) مَن کیا چیز تھی - (۲) کیا اس کا وجود معجزانہ تھا - (۳) کیا بنی اسرائیل اُسے کھا کر ایک طویل مدت تک زندگی بسر کر سکتے تھے -

پہلے سوال کا جواب دیتے وقت خود بخود یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے - کہ اس غذا کو من کا نام بنی اسرائیل نے دیا تھا یا پہلے سے اس کا یہ نام تھا - اگر بنی اسرائیل نے اسے اسی نام سے پکارا تھا تو کیوں - کیا اس غذا کی کسی اندرونی خاصیت کی وجہ سے یا کسی دوسری وجہ سے -

خروج باب ۱۶، ۱۵ میں من کا سب سے پہلے ذکر ہے، اُس میں لکھا ہے کہ جب بنی اسرائیل ایلم سے روانہ ہوئے تو راستہ میں خوراک نہ ملنے کے سبب انہوں نے شور مچایا - چنانچہ خدا تعالےٰ نے ان سے گوشت اور روٹی کا وعدہ کیا - شام کو بے شمار بٹیر جنگل میں آ گئے - جنہیں پکڑ کر انہوں نے گوشت کھایا، اور صبح کے وقت ایک چیز زمین پر پڑی ملی جو چھوٹی چھوٹی سفید رنگ کی تھی جسے دیکھکر بنی اسرائیل نے آپس میں کہا "من ہے؟ کیونکہ اُنہوں نے نہ جانا کہ وہ کیا ہے - اس پر موسیٰؑ نے ان سے کہا یہ روٹی ہے، جو خدا نے کھانے کو تمہیں دی ہے"؛ خروج ب ۱۶ ۱۵ - اس آیت کی بنا پر بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے - کہ من کا لفظ اس جگہ بہ طور استفہام استعمال ہوا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کیا چیز ہے - بعد میں یہی لفظ نام کے طور پر بنی اسرائیل میں استعمال ہونے لگا - چنانچہ اسی باب کی آیت ۳۱ میں لکھا ہے "اور اسرائیل کے گھرانے نے اسکا نام من رکھا"!

بعض محققین جارج ایبرز کے اتباع میں اس تشریح کو غلط سمجھتے ہیں - اور ان کا خیال ہے کہ لفظوں کی مشابہت سے مغالطہ ہو گیا ہے - اصل میں یہ لفظ منو ہے اور قبطی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی قبطی زبان میں کھانے کے ہیں - اس لئے بنی اسرائیل نے من سوال اور استفہام کے طور پر اس کا نام نہیں رکھا بلکہ چونکہ خدا تعالےٰ نے کہا تھا کہ یہ موعودہ روٹی ہے - انہوں نے اس کا نام "منا" یعنی (خوراک) رکھدیا کیونکہ اس کا کوئی اور نام انہیں معلوم نہ تھا، ان کا یہ خیال ہے کہ من استفہامیہ کا استعمال ارمیک زبان میں ہے اور یہ قابل تعجب امر ہے کہ اس معنی میں جس میں ارمیک زبان کا کوئی اور لفظ استعمال نہیں ہوا یہ لفظ مستعمل ہو جاتا مگر مسٹر فیلڈ نے اس حیرت کو بائیبل کے ایک قدیم یونانی نسخہ سے دور کرنے کی کوشش کی ہے اس نسخہ میں خروج باب ۱۶ ۱۵ کے الفاظ 'من ہے' کی بجائے 'کیا یہ من ہے' ہیں اور اگر یہ فرق صحیح تسلیم کر لیا جائے - تو من خوراک کے معنی میں درست ثابت ہوتا ہے - اور استفہام کے الفاظ کا علیحدہ موجود ہونا واضح کر دیتا ہے کہ من کا لفظ اس جگہ استفہام کے طور پر استعمال نہیں ہوا تھا -

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عبرانی کا لفظ جو اس جگہ استعمال ہوا ہے اس کے معنے استفہام کے بھی ہوتے ہیں - لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ یہ لفظ بنی اسرائیل کی جلاوطنی اور اس کے بعد کے زمانہ میں ان معنوں میں صرف عزرا اور دانیال کی کتب میں استعمال ہوا ہے - جلاوطنی سے پہلے کے زمانہ میں اس کا استعمال ان معنوں میں نظر نہیں آتا اور اس وجہ سے بعض اہل نظر نے اسے ارمیک قرار دیا -

ہم جب اس لفظ کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے توارة کے دوسرے مقامات کا مطالعہ کرتے ہیں کہ بے جان چیزوں کے متعلق سوال کرنے کا کیا طریق ہے - تو وہاں ہمیں ایک ایسی بات مل جاتی ہے -

جواس سوال کو ہمارے لئے قطعی طور پر حل کر دیتی ہے ۔ اور وہ یہ کہ توارۃ میں جہاں بے جان چیزوں کے متعلق سوال کیا گیا ہے وہاں مَنہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے نہ کہ 'من' کا اور جہاں جاندار چیزوں کا لفظ استعمال کیا گیا ہے وہاں 'مِی' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے چنانچہ خروج باب ۴ ۲۰ میں ہے :" پھر خدا نے موسےٰ سے کہا کہ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے ؟ وہ بولا عصا ۔" اس جگہ عبرانی میں لفظ "مَ زِہ" ہے یعنی یہ کیا ہے ، یہ الفاظ عربی کے الفاظ 'ماذا' سے ملتے ہیں ،

مَ زہ کا یہ استعمال غیر معمولی ہے ۔ ورنہ احبار باب ۲۵ ۲۰ شمار باب ۱۳ ۱۹ اسموئیل باب ۳ ۱۷ ۔ زبور باب ۱۲ ۳ ۔ امثال باب ۳ ۴ اور دیگر مقامات میں کیا کے لئے لفظ مَنہ استعمال کیا گیا ہے اس کے مقابلہ میں جاندار کے متعلق سوال کے موقع پر 'کون' کے لئے پیدائش باب ۲۷ ۱۸ الضاً باب ۳۳ ۵ ۔ خروج باب ۱۵ ۱۱ ۔ اسموئیل باب ۲۵ ۱۰ ۔ زبور باب ۴ ۶ وغیرہ میں عبرانی کا لفظ 'مِی' استعمال ہوا ہے ، اس فرق کو دیکھ کر صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ خروج باب ۱۶ میں جو 'من' کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ کیا کے معنوں میں نہیں کیونکہ پرانی عبرانی زبان میں کیا کیلئے من نہیں بلکہ مَنہ کا لفظ استعمال کرتے تھے ۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جلاوطنی اور اس کے بعد کے زمانہ میں جب 'من' کا لفظ سوال کے لئے استعمال ہونے لگا تو اس سے بیجان نہیں بلکہ جاندار کے متعلق سوال کیا جاتا تھا چنانچہ عزرا باب ۵ ۳ و ۹ اور دانیال باب ۳ ۱۵ میں من کا لفظ سوال کے لئے استعمال ہوا ہے لیکن وہاں سوال جانداروں کے متعلق ہے ، پس معلوم ہوا کہ اوّل تو توارۃ کے نزول کے وقت 'من' کا لفظ سوال کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا ۔ دوم بنی اسرائیل کی جلاوطنی کے زمانہ سے جب یہ لفظ سوال کے لئے استعمال ہونے لگا ہے اسوقت بھی یہ لفظ قاعدہ کے طور پر جاندار چیزوں کے متعلق سوال کرنے کے لئے استعمال ہوتا تھا نہ کہ بے جان چیزوں کے متعلق ۔ اور استثنا کے طور پر اگر کہیں اس کے خلاف استعمال ہوا ہو تو اسے بطور سند نہیں پیش کیا جا سکتا ۔ لہذا خروج باب ۱۶ ۱۵ میں 'من ہے' کے معنی کیا ہیں کے کرنا اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ 'من' کو 'من' اس لئے کہا گیا تھا کہ بنی اسرائیل نے اسے نہ پہچاننے کی وجہ سے 'من' کے لفظ سے اس کے متعلق سوال کیا تھا درست نہیں اور یہ غلط فہمی یورپی مصنفوں کو اس لئے ہوئی ہے کہ وہ عبرانی جیسی مردہ زبان کی تحقیق کرتے وقت اس امر کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ عبرانی کی ماں عربی زبان زندہ موجود ہے ، عبرانی الفاظ کی حقیقت کے سمجھنے میں جب مشکلات ہوں تو وہ عربی زبان سے مدد لے لیا کریں ۔ اس موقعہ پر اگر وہ عربی سے مدد لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ عربی زبان میں 'ما' غیر ذی روح کے لئے اور 'من' ذی روح کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ اور پھر اس علم کی روشنی میں بائیبل کے الفاظ کو دیکھتے تو ان پر واضح ہو جاتا کہ یہی قاعدہ بائیبل کی عبرانی میں بھی مدِنظر رکھا گیا ہے اور اس طرح اس لغزش سے بچ جاتے ۔ مگر اتنی تعریف ان کی ضرور کرنی پڑتی ہے کہ انہوں نے یہ فرق ضرور محسوس کیا ہے کہ من کا لفظ سوال کے معنوں میں جلاوطنی کے زمانہ اور اس کے بعد استعمال ہوا ہے (دیکھو انسائیکلو پیڈیا ببلیکا جلد ۳ زیر لفظ منا) × × × × × × × × ×

× × پہلے نہیں ۔ اور اس کی بنا پر ان میں سے بعض نے من کے معنی استفہام کے سوا کچھ اور لینے کی کوشش کی ہے ۔ چنانچہ جیسا میں لکھ چکا ہوں ، جارج ابرز نے اس لفظ کو قبطی لفظ منو سے ماخوذ قرار دیا ہے جس کے معنی خوراک کے ہیں ۔ اسی طرح جیسنیس (gesenius) نے اپنی لغت میں من کی وجہ تسمیہ عربی لفظ مَنّ سے بتائی ہے جس کے معنی فضل اور احسان کے ہیں اس مصنف کے خیال کے مطابق اس چیز کا نام من اس لئے رکھا گیا تھا کہ وہ خدا تعالےٰ کے فضل سے حاصل ہوتی تھی اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ وجہ زیادہ قرین قیاس ہے ۔

اب میں اس سوال کو لیتا ہوں کہ من کیا چیز تھی ؟ جیسا کہ پروفیسر نعیم الرحمن صاحب نے لکھا ہے بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شبنم کے ساتھ گرتی تھی اور سفید سفید گول دھنیے کے بیجوں کی طرح ہوتی تھی اور لوگ اسے چکی میں پیس کر یا اُکھلی میں کوٹ کر توے پر پکاتے تھے ۔ یا پھلکیاں بناتے تھے اور اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا جب دھوپ نکل آتی تو من پگھل جایا کرتا تھا ۔ خروج باب ۱۶ ۱۴ و گنتی باب ۱۱ ۷ ۔ یہ چیز سبت کے دن نہیں گرتی تھی اور اگر لوگ جمع کر تے تھے تو سڑ جاتی تھی ، سوائے سبت کے دن کے کہ جو اس کے لئے جمع رکھی جاتی تھی وہ نہ سڑتی تھی ۔ یہ من برابر اڑتیس سال تک بنی اسرائیل پر نازل ہوتا رہا ۔ گنتی باب ۱ ۵ اور اس وقت بند ہوا جب انہوں نے موعود زمین میں قدم رکھا اور وہاں کا دانہ کھایا یشوع باب ۵ ۱۲

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا کوئی ایسی چیز ہے جو بائیبل کی بیان کردہ صفات کے مطابق ہو اور جو سینا کے میدان میں پائی جاتی ہو ؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر ہم معجزانہ امور کو نظر انداز کر دیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع

ایک ایسی چیز سینا کے علاقہ میں پائی جاتی ہے جو شبنم کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے اور دھوپ کی گرمی میں پگھل جاتی ہے اور تیل سا اس کا مزہ ہوتا ہے۔ اور سفید رنگ کی ہوتی ہے جس کی ایک قسم کو ہمارے ملک میں شیر خشت کہتے ہیں اور دوسری کو ترنجبین اور ہندی میں اسے یَوَاس شکر یعنی جَوَاسے کی شکر کہتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستان میں یہ چیز جواسے کے درخت سے نکالی جاتی ہے۔ لاطینی میں اسے منا کہتے ہیں اس چیز کی ماہیت پوری طرح طبی کتب میں بھی درج ہے اور انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں بھی درج ہے چونکہ اسے پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب نے تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اس لئے میں اس مضمون کو چھوڑتا ہوں، ہاں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یورپی سیاحوں نے شہادت دی ہے کہ اب تک اس علاقہ میں من ملتا ہے۔ گو وہ شبنم کے ساتھ نہیں گرتا بلکہ ٹیمرکس گیلیکا نامی درخت کا رس ہوتا ہے جس کی چھال کو جب ایک کیڑا جسے اب گاسیپیریا مینیفرا کہتے ہیں چھیدتا ہے تو اس سے یہ رس ٹپکتا ہے، بغیر کیڑے کے انسانی ہاتھوں سے درخت کی چھال میں شگاف کر دینے سے بھی یہ رس گر کر جم جاتا ہے اور مختلف ممالک میں اس درخت سے مختلف طریقوں سے رس جمع کیا جاتا ہے۔ سسلی اور خراسان کا من مشہور ہے، ہندوستان میں بھی جواسے کے درخت سے وید من بناتے ہیں مصر سے مصنوعی بنا ہوا من آتا ہے لیکن اطبا اسے پہچان لیتے ہیں۔ برفارڈٹ جرمن سیاح کا بیان ہے کہ سینا میں موجودہ درختوں کی تعداد کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ سالانہ ڈھائی تین سو سیر تک من تیار ہو سکتا ہے، مگر خیال کیا جاتا ہے کہ پہلے زمانہ میں جنگل زیادہ وسیع ہوتا تھا۔ اور اس سے بہت زیادہ من تیار ہو سکتا تھا لیکن جیسا کہ پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب نے لکھا ہے بائیبل میں بنی اسرائیل کی جو تعداد لکھی ہے اُس کے مطابق انہیں روزانہ چھبیس ہزار سات سو پچاس من کے قریب 'من' کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ اور سالانہ ایک کروڑ من کے قریب لیکن چھ سات سو من سالانہ جو اب وہاں پیدا ہوتا ہے اور ایک کروڑ من جس کی انہیں ضرورت ہوتی تھی ان دونوں اندازوں میں اسقدر فرق ہے کہ خواہ قوت واہمہ کو کتنا ہی آزاد چھوڑ دیا جائے خیال نہیں کیا جا سکتا کہ کسی زمانہ میں اس علاقہ میں اسقدر جنگل تھا کہ ایک کروڑ من 'من' پیدا ہو جاتا تھا۔ خصوصاً جب ہم اس امر کو مدِّنظر رکھیں کہ اس علاقہ کا اکثر حصہ ایسا ہے کہ اس میں درخت پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔

ایک حل تو اس مشکل کا یہ ہے کہ ہم سمجھ لیں کہ بائیبل میں جو تعداد بنی اسرائیل کی لکھی ہے وہ مبالغہ آمیز ہے۔ گنتی باب ۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے بیس سال سے زائد عمر کے لڑنے کے قابل مردوں کی تعداد بارھویں قبیلہ کو چھوڑ کر جنگی گنتی نہیں کی گئی، چھ لاکھ تین ہزار پانچسو پچاس تھی۔ اگر بارھویں قبیلہ کا اندازہ کر لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کل لڑنے کے قابل مرد ساڑھے چھ لاکھ تھے۔ عورتوں بچوں اور جنگ کے ناقابل بوڑھوں کی تعداد کا اندازہ لگانے کے لئے ہم اس تعداد کو دس گنا زیادہ کر لیتے ہیں کیونکہ یہ ایک عام اندازہ ہے کہ چھ فیصدی سے لے کر دس فیصدی تک ملک کی آبادی جنگی خدمت کے قابل ہوتی ہے۔ ہم خیال کر لیتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں سختی سے جنگی خدمت لی جاتی تھی اور کل تعداد بنی اسرائیل کی جنگی سپاہیوں سے صرف دس گنی تھی یعنی ساٹھ لاکھ۔

عقل اس امر کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ بنی اسرائیل ساٹھ لاکھ تھے، کیونکہ اتنے آدمی مصر سے اتنے قلیل عرصہ میں نکل ہی نہیں سکتے۔ پھر برون بار کی بستی جس میں آکر وہ بسے ہیں۔ اسقدر آبادی کی حامل نہیں ہو سکتی فلسطین کی آبادی کا اندازہ ۱۹۲۶ء میں آٹھ لاکھ باون ہزار دو سو اڑسٹھ تھا۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا چودھواں ایڈیشن)

اس ملک کا کل رقبہ نو ہزار مربع میل ہے یعنی پنجاب کے رقبہ کا قریباً چودھواں حصہ اور پھر اس کا ایک بڑا حصہ ناقابل سکونت ہے۔ صرف ریت کے میدان ہیں جنہیں آباد نہیں کیا جا سکتا۔ پس اس ملک میں جو پہلے سے آباد تھا ساٹھ لاکھ آدمیوں کا آ کر بس جانا بالکل خلافِ عقل ہے۔

ایک اور دلیل سے بھی یہ امر خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے۔ کہ بنی اسرائیل ساٹھ لاکھ تو درکنار چند لاکھ بھی ہوں اور وہ اسطرح کہ حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش سے لیکر حضرت یعقوبؑ کے مصر میں داخل ہونے تک تقریباً دو سو سال کا عرصہ بائیبل کے مطابق گزرا ہے۔ اس عرصہ میں حضرت ابراہیمؑ کی نسل کے افراد بارہ تک پہنچے ہیں۔ عیسو کی اولاد کو بھی اگر اسیقدر فرض کر لیا جائے تو دو سو سال میں چوبیس افراد تک ان کی نسل پہنچی ہے۔ اس کے بعد مصر سے نکلنے کے زمانہ تک دو سو سال گزرے ہیں۔ پس عام اندازہ تو یہی ہو سکتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں کی نسل اس دو سو سال میں چھ سات سو افراد تک پہنچ گئی ہوگی لیکن اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ وہ بہت شادیاں کرتے تھے اور اولاد زیادہ ہوتی تھی جب بھی پندرہ بیس ہزار سے زائد تو کسی صورت میں ان کی تعداد نہیں ہو سکتی اور اس امر کو مدِّنظر رکھتے ہوئے کہ بنی اسرائیل

اپنے سفر کے دوران میں معمولی شہروں کے آدمیوں سے بھی ڈرتے تھے اور ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے، کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کے ساتھ دو ڈھائی ہزار سپاہیوں سے زائد نہ تھے۔ اس اندازہ کے ماتحت 'من' کی وہ مقدار جو بنی اسرائیل کے لئے ضروری ہوتی ہوگی بہت کم رہ جاتی ہے۔

لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ کیا بنی اسرائیل من پر گزارہ کر سکتے تھے۔ من جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ایک گوند ہے جو ہے بھی مسہل۔ اس غذا پر انسان چند دن سے زائد گزارہ نہیں کر سکتا۔ پھر بنی اسرائیل نے اڑتیس سال تک اس پر کیونکر گزارہ کیا؟ نئے یورپی محققین بھی اس سوال کی معقولیت کے قائل ہو گئے ہیں اور اب ان کا یہ خیال ہے کہ من کی جو ماہیت بائیبل میں بتائی گئی ہے۔ اس میں مبالغہ اور تداخل ہو گیا ہے، ان کے نزدیک من لچن (Lichen) کے دانوں کا نام ہے جو قحط کے دنوں میں لوگ کھانے لگتے ہیں۔ لچن ایک بوٹی ہے جو سطح کے اوپر ہی اگ آتی ہے۔ جڑ کے لئے اُسے زمین کی ضرورت نہیں ہوتی اس وجہ سے چٹانوں کی سطح اور درختوں کی چھال پر بھی اُگ آتی ہے۔ اس کی بعض قسمیں پتھروں پر اگتی ہیں خصوصاً چونے کے پتھروں پر اور جب اسے پتھر سے الگ کیا جائے تو جوار کے کچلے ہوئے دانہ کے مشابہ ہوتی ہے۔ جب یہ بوٹی پک جائے تو اس کے چھلکے جڑ سے الگ ہو کر گول شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ہلکا ہونے کی وجہ سے ہوا انہیں اُڑا کر دور دور لے جاتی ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا جلد ۳)

علماء نباتات کے نزدیک یہ بوٹی کھمب کی قسموں میں سے ہے۔

اگر نئے یورپی محققین کی رائے تسلیم کر لی جائے تو پھر یہ سوال حل ہو جاتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اس کھانے پر گزارہ کس طرح کیا، لیکن وہ سوال پھر پیدا ہو جاتا ہے کہ بائیبل کی بیان کردہ من کی ماہیت کے ساتھ اس بوٹی کو کوئی مناسبت نہیں، نہ یہ بوٹی میٹھی ہوتی ہے نہ اس کا مزہ تازہ تیل کا سا ہے اور نہ یہ بوٹی دوپہر کو پگھل جاتی ہے۔

میرے نزدیک اس سوال کا جواب ہمیں بائیبل اور اس کی متعلقہ کتب سے نہیں مل سکتا۔ یورپین محقق خواہ کتنا ہی زور لگائیں وہ اس سوال کا پوری طرح جواب نہیں دے سکتے کیونکہ وہ اس سرچشمہ سے دور ہیں، جس سے حقیقی علم عطا ہوتا ہے۔ × × × × ×

× × × × × پس اگر ہمیں صحیح جواب کی ضرورت ہے تو ہمیں چاہیئے کہ قرآن اور حدیث سے استمداد حاصل کریں۔

قرآن کریم اور حدیث میں 'من' کے متعلق مندرجہ ذیل حقائق بیان ہوئے ہیں۔

الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم وھم الوف حذر الموت فقال لھم اللہ موتوا ثم احیاھم (بقرہ ع)

کیا تجھے ان لوگوں کا حال معلوم نہیں جو اپنے گھروں سے موت کے ڈر سے اس حال میں نکلے تھے کہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے، اس پر اللہ تعالےٰ نے انہیں کہا کہ مر جاؤ پھر انہیں اس نے زندہ کر دیا۔ (۲) وانزلنا علیکم المن والسلوی کلوا من طیبت ما رزقنکم (بقرہ ع) اور ہم نے تم پر من اور سلویٰ اتارا تھا اور کہا تھا کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے اعلیٰ اور پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ۔ (۳) بخاری میں سعید بن زید کی روایت ہے قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الکماۃ من المن۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کھمب بھی من کی اقسام میں سے ہے۔ ترمذی میں ابوہریرہ رضہ سے روایت ہے ان ناساً من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالوا الکماۃ جدری الارض فقال نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الکماۃ من المن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے بعض لوگ اعراب کے توہمات کے مطابق باتیں کر رہے تھے کہ کھمب زمین کی چیچک ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو سنکر فرمایا کہ نہیں کھمب من کی اقسام میں سے ہے۔

اوپر کی آیات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں مصر سے نہیں نکلے بلکہ ہزاروں کی تعداد میں نکلے تھے۔

(۲) جو چیز ان کے کھانے کے لئے مہیا کی گئی تھی وہ غذا کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی تھی اور ایسی نہ تھی جو غذائیت یا مزے کے لحاظ سے تکلیف دہ ہو۔

(۳) جو چیز بنی اسرائیل کو کھانے کے لئے ملی تھی وہ ایک چیز نہ تھی بلکہ کئی چیزیں تھیں اور ان کئی چیزوں میں سے ایک کھمب بھی تھی۔

یہ ایک نہایت عجیب بات ہے کہ من کا ذکر قرآن کریم میں تین جگہ پر آیا ہے ایک سورۃ بقرہ میں ایک اعراف میں اور ایک طٰہٰ میں اور تینوں جگہ اس کے ذکر کے بعد کلوا من الطیبات کا فقرہ ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال کی تردید کرنا مقصود ہے

کر وہ کھانا طبیعت پر بوجھ ڈالنے والا یا غذائیت کے لحاظ سے ادنیٰ قسم کا کھانا تھا۔

جیسا ہم لچن کی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کھمب کی قسم کا پودہ ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں لکھا ہے۔ "لچن اور کھمب کے اقسام بالکل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ اور یہ ان اقسام کی شابہت سے جو ایک دوسرے کی طبعی سرحد پر واقع ہیں۔ بالکل ظاہر ہوجاتا ہے۔" لیکن یہ امر ظاہر ہے کہ لچن خود ..... کوئی اچھا کھانا نہیں ہے۔ بلکہ قحط کے ایام میں مجبوراً اسے لوگ کھاتے ہیں۔ اس کے برعکس کھمب اعلیٰ درجہ کے کھانوں میں سے ہے اور گراں قیمت فروخت ہوتی ہے۔ اور خاص طور پر اسے امراء کے لئے بویا جاتا ہے۔ اور فرانس میں تو اس کی اسقدر کھپت ہے۔ کہ پیرس میں ایک زمیندار دن میں تین سو سے تین ہزار پونڈ تک کھمب منڈی میں فروخت کرنے کے لئے بھیجتا ہے۔ اور پھر یہ ہے بھی جلد اُگنے والی چیز۔ چنانچہ انگریزی میں اس چیز کو جو جلد ہو جائے مشروم گروتھ یعنی کھمب کی طرح پیدا ہونے والی کہتے ہیں اور ایسے لوگوں کے لئے جو کھانے سے تنگ ہوں ایسی ہی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جو جلد اُگ آئیں اور جلد استعمال میں آسکیں۔ اب کیا یہ صاحبان بصیرت کے لئے عجیب بات نہیں کہ بائیبل کے کثیر نسخوں اور علم طبیعات کے ماہرین کی امداد کے باوجود یورپ بیسویں صدی میں جس نتیجہ پر من کے متعلق پہنچا ہے اور وہ بھی ناقص صورت میں اس کی اب سے تیرہ سو سال پہلے نہایت جامعیت کے ساتھ، توضیح کردی گئی تھی۔

میں جہاں تک مذکورہ بالا آیات اور احادیث سے سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل سے دشت سینا میں کھمب ترنجبین اور ایسی ہی اور چیزیں جو جلد تیار ہوجاتی ہیں پیدا کردیں جن سے بنی اسرائیل کو بآسانی غذا ملنے لگی اور چونکہ اس کے لئے انہیں محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ اس غذا کا نام من یعنی احسان الٰہی سے ملنے والی غذا رکھا گیا۔ وہ ایک قسم کی غذا نہ تھی بلکہ کئی قسم کی غذائیں تھیں۔ کیونکہ حدیث کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ کئی طرح کا من تھا۔ ہاں سب میں ایک مشابہت تھی۔ اور وہ یہ کہ غذائیں ہل چلاکر اور محنت کرکے بنی اسرائیل کو پیدا نہیں کرنی پڑتی تھیں۔ لیکن چونکہ یہ غذائیں اور بٹیر جواس وقت کثرت سے اس جنگل میں آگئے تھے، شکم میں قبض پیدا کرتے تھے۔ اللہ تعالےٰ نے ترنجبین بھی کثرت سے پیدا کردی۔ جسے دوسری غذاؤں میں ملاکر کھانے سے ان کی صحت درست رہتی تھی۔ لہذا یہ حقیقت ہے من کی جس کا کثرت سے ان ایام میں پیدا ہونا ایک معجزہ تھا۔ لیکن خود اس کا وجود اس دنیا کی چیزوں میں سے تھا، وہ ایسی غذا تھی جسے ایک عرصہ تک کھایا جاسکتا تھا۔ اور اس کی مُصلح ترنجبین بھی ساتھ پیدا کردی گئی تھی۔ تاکہ جنگل کی خشک غذا صحت کو نقصان نہ پہنچائے۔

اس تشریح کے ساتھ سب سوال حل ہوجاتے ہیں یہ بھی کہ من کو لوگ دیر تک کس طرح کھاتے رہے اور یہ بھی کہ وہ سال بھر کس طرح ملتی رہتی تھی۔ اور یہ بھی کہ وہ تیل کی طرح بھی تھی اور اس سے روٹیاں بھی پکتی تھیں۔ اور پھلکیاں بھی بنائی جاتی تھیں کیونکہ وہ ایک چیز نہ تھی بلکہ کئی چیزوں کا نام من تھا۔ اور اس تشریح کو تسلیم کرکے کوئی خلافِ عقل بات بھی تسلیم نہیں کرنی پڑتی، کھمب بٹیر وغیرہ کی قسم کی چیزوں پر ایک ایسی قوم جسے ہم سیاسی اغراض کے لئے جنگل میں رہنا ضروری ہو گزارہ کرسکتی ہے۔ اور قرآن کریم کی بتائی ہوئی تعداد کے مطابق قوم کا اس جنگل میں آسانی سے بسر اوقات کرسکنا ناممکنات میں سے نہیں ہے۔

ابن الفارسؔ

"شاعر کے صحیح خیالات اور تصوّرات ہرگز احاطہ تحریر میں نہیں آسکتے۔ وہ ان کو محاکات کے ذریعہ سے ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پس تشبیہ واستعارہ کی چستی اور موزونی قوّت شاعری کا معیار ہے۔"

شبلی

مگر نواب صاحب اور کنور صاحب نے نہ مانا اور خدا رسول کا واسطہ دیا کہ یہ راز بتا ہی دیجئے تو میرزا صاحب نے ایک آہ کھینچکر کہا میں آج صبح اُٹھا تھا اور جائے ضرور جانے کا ارادہ تھا صحن چبوترہ کے کونہ پر خدمتگار آفتابہ تانبہ کا پانی سے لبریز رکھ کر چلا گیا تھا جو ایک فقیر دیوان خانہ میں گھس آیا۔ اور کہنے لگا نواب صاحب کے دم قدم کا خیر ایک چراغ دلوا دیجئے۔ میں نے کہا بابا اس وقت تو چراغ حاضر نہیں ہے۔ معاف فرمائیے۔ میں نے ہر چند یقین دلایا کہ اس وقت پیسہ نہیں ہے۔ مگر اس نے کہا میں تو کچھ لیکے ٹلونگا تو میں نے کہا یہ تانبہ کا آفتابہ موجود ہے لیجائیے۔ فقیر نے آفتابہ کا پانی پھینکا آفتابہ جھولی میں ڈالا اور چلدیا اس میں قضائے حاجت کا وقت قریب آگیا تو میں نے اس خالی بوتل میں پانی بھرا اور جائے ضرور میں طہارت کے لئے لے گیا، طہارت کر کے باہر آتا تھا جو آپ دونوں حضرات وارد ہوئے اور بات دہو کے میرے پیچھے پڑ گئے اور فرمانے لگے۔

"بتائیے بوتل شریف بیت الخلاء میں کیوں گئی تھی۔ اس میں کلیان آگیا اور اس نے اس قصہ کو سُنکر کہا جناب عالی آفتابہ تو پانچ روپیہ سے زیادہ کا نہ ہوگا۔ تیسرا دن ہے کہ ایک قبا دو سو روپیہ میں اس لئے بنوائی تھی کہ رام پور جائیں گے تو پہنیں گے کھونٹی پر لٹکی ہوئی تھی، دیوان خانہ میں ہم لوگ حاضر نہ تھے ایک سائل آیا اور پیسہ مانگنے لگا فرمایا بھائی پیسہ تو نہیں ہے مگر تمہارا خالی ہات جانا بھی گوارا نہیں ہے، یہ قبا لٹک رہی ہے اُتار کر لیجاؤ کوڑہ کر لینا، فقیر قبا لیکر دروازہ تک گیا تھا جو میں نے اسے آن پکڑا تو سرکار نے کہا کلیان چھوڑ دو ہم نے خود قبا اسے دیدی ہے۔ دیکر کسی چیز کو واپس لینا اوچھاپن کہلاتا ہے۔ ان باتوں کو سُن کر کنور صاحب نے اپنے نوکر کو چپکے سے ہدایت کی کہ چاوڑی جاکر بڑے سے بڑا تانبہ کا ایک آفتابہ مول لیکر مسی جوش اور قلعی کروا کر جلد سے جلد لاؤ، نوکر گیا اور آفتابہ درست کروا کر لے آیا اور کنور صاحب نے وہ آفتابہ میرزا صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ اور میرزا صاحب نے قبول فرمالیا۔ میرزا صاحب کو کسی فرنگی حاکم نے شیشہ کا ایک صندوقچہ تحفہ میں دیا تھا جس کا حاشیہ پیتل کا تھا اور چاروں طرف اس میں اور اوپر تلے شفاف شیشے جڑے تھے گویا چھوٹا سا بلوری حوض تھا۔ میرزا صاحب کی مسند کے سامنے رکھدیا جاتا تھا اور اس میں پانی بھر کر تھوڑے سے رنگین پھول اور ہرے بھرے پتے اُس میں ڈالکر اور قلم سے اس کا پانی ہلا کر ڈھکنا بند کر دیا جاتا تھا تو چاروں طرف کے بیٹھنے والوں کو وہ ایک طلسماتی باغ دکھائی دیتا تھا۔ میرزا صاحب نے اسے دیکھ کر دم بدم تفریح حاصل کرتے تھے۔ کبھی لکھتے لکھتے قلم کے سرے سے حوض طلسمی کے پانی کو ہلا جلا دیتے تھے اور جب پانی تلاطم پیدا کرتا اور پھول پتیاں اوپر تلے ہونے لگیں تو فرماتے

چار موج اٹھتی ہے طوفان طرب سے ہر سو
موج گل موج شفق موج صبا موج شراب

مجھے تو یہی یاد ہے کہ منشی حبیب الدین صاحب سہارن پور کے رہنے والے تھے اور اگر سہارنپور کے رہنے والے نہیں تھے تو اس کے آس پاس کے باشندے ضرور تھے۔ ان کا تخلص سوزاں تھا۔ وہ سرکاری کچہری میں پیشکار تھے۔ درحقیقت وہ لائق فائق اور فارسی اردو زبان کے ماہر اور شاعر تھے، خوش گپ شیریں بیان تھے۔ چرب زبان تھے میرزا صاحب کے ہم عصر تھے اتفاقاً ان کی تبدیلی باہر سے شاہجہان آباد کی ہوئی اور جامع مسجد کے پاس ایک کوٹھا انہوں نے اپنے رہنے کے لئے کرایہ پر لیا انکی سخن گوئی اور سخن سنجی کی چند روز میں شہر کے اندر دھوم مچگئی اور قابل لوگ اُن کے کوٹھے پر جمع ہونے لگے۔ سوزاں صاحب جب بیٹھتے تو میرزا صاحب کی شاعری پر نکتہ چینی کرتے اور میرزا صاحب کی ہنسی اڑاتے اور فرماتے غالب کو صحت لفظی بھی نہیں ہے۔ ایک مرتبہ میرزا رئیس کے بلائے ہوئے ریاست رام پور گئے تھے۔ وہاں بڑی آؤ بھگت ہوئی رئیس کے علاوہ رام پور کے بہت سے پڑھے لکھے میرزا کے شاگرد ہوئے جب میرزا رام پور سے دلی کو پلٹے تو رام پور والے بہت سے احباب کوسی ندی تک میرزا کو پہنچانے آئے اس واقعہ کے متعلق میرزا نے ایک غزل لکھی ہے۔ اس غزل کے ایک مصرعہ میں فرماتے ہیں۔

ع یار پہنچانے ہمیں تالب ساحل آئے

لب دریا۔ یا ساحل دریا ایک بات ہوئی تو لب ساحل کہنا ایسا ہے جیسے جاہل شب برات کی رات یا لیلۃ القدر کی رات کہا کرتے ہیں۔ میرزا جیسے ادیب اور شاعر سے ایسی فاش غلطی! اسی کچہری میں جس میں سوزاں صاحب پیشکار تھے۔ اکرم علیخاں نامی ایک نوجوان ناظر تھے جو طبیب، ذی علم حافظ قرآن اور میرزا کی صحبت کے آدمی تھے بعد وقت ملازمت کے جو کچھ وقت میسر آتا تھا۔ میرزا صاحب کے پاس حاضری میں کاٹ دیتے تھے۔ نہ بولنا نہ چالنا پیکر تصویر کی طرح خاموش بیٹھے رہتے تھے اور میرزا صاحب کی باتیں سنا کرتے تھے۔

گویا میرزا کے عاشق زار تھے۔ میرزا صاحب بھی انہیں اولاد کے برابر چاہتے تھے۔ ناظر صاحب عصر کے وقت کچہری سے سیدھے میرزا صاحب کے دیوان خانہ میں آتے تھے کلیان کو حکم تھا کہ اکرام علی گرمی میں مارا مارا آتا ہے۔ ہمارے شراب پینے کے لئے برف رہے یا نہ رہے۔ مگر اُسے ایک گلاس برف کے پانی کا بنا کر دیدیا کرو اس زمانہ میں کل کی برف عنقا تھی، برف کا ٹھکانہ الہ آباد یا اکبر آباد تھا۔ برف کا ناظر صاحب کو گلاس کیا ملتا تھا گویا جام کوثر ملتا تھا۔

سوزاں صاحب کو معلوم ہو گیا تھا کہ ناظر صاحب میرزا صاحب کے خاص دوستوں میں سے ہیں۔ اس واسطے اُن کے جلانے کے لئے میرزا صاحب کے کلام پر بہت اعتراض جڑا کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ناظر صاحب ان اعتراضوں کو میرزا صاحب کے کان تک پہنچائیں۔ مگر ناظر صاحب ایک بھاری بھرکم شریف زادہ تھے۔ وہ خبر بھی نہ ہونے دیتے تھے مگر اور لوگوں نے سوزاں کی فضول گوئی میرزا صاحب کے کان تک پہنچا دی تھی، حسن اتفاق اپریل مئی کی سخت گرمی پڑ رہی تھی اور شام کا وقت تھا سوزاں صاحب اور ناظر صاحب دونوں دوست کچہری سے ٹہلتے ہوئے چلے آتے ہیں یہاں تک کہ دونوں صاحب بلی ماروں میں پہونچے اور سوزاں صاحب نے کہا، بھائی اکرام علیخاں آج گرمی بلا کی ہے۔ پیاس کے مارے میرا دم نکل جائیگا۔ حسین کے واسطے دو گھونٹ ٹھنڈے پانی کے کہیں سے پلواؤ۔ ناظر صاحب نے کہا، ٹھنڈا پانی بہتیرا، یہ کہہ کر ناظر صاحب اپنے دوست کو ایک مکان میں لے گئے اور سوزاں صاحب نے دیکھا ایک دلکش دیوان خانہ ہے، صحن میں چوکہ چاندنی شطرنجی سے آراستہ ہے مونڈھے کرسیاں بچھی ہیں، آرام چوکی پر ایک معمر آدمی امیرانہ شان و تحمل سے بیٹھا ہے۔ ناظر صاحب سلام کر کے مودب ایک مونڈھہ پر بیٹھ گئے اور سوزاں صاحب نے بھی اپنے دوست کی تقلید کی ابھی سلسلہ کلام نہ چھڑا تھا کہ ایک حجرہ میں سے ایک ہندو نوکر نکلا، اس کے ہات میں بڑا سا گلاس پانی سے لبریز تھا، ہندو نوکر نے وہ ناظر صاحب کو دیا اور ناظر صاحب نے سوزاں صاحب کے حوالے کیا اور گلاس ہات میں آنے سے معلوم ہوا کہ برف کا بہت تیز ٹھنڈا پانی ہے، سوزاں صاحب ڈگڈگا کے پی گئے، ہندو نوکر نے خالی گلاس اُن کے ہات سے لے لیا، اور چھپا کے سے برف کے پانی سے گلاس بھر کر پھر لے آیا اور ناظر صاحب کی خدمت میں پیش کیا، ناظر صاحب نے برف کا گلاس نوکر سے لیکر صاحب خانہ کو سلام کیا اور پانی پی لیا۔ جب یہ دونوں صاحب برف کے پانی سے مگن ہو گئے تو صاحب خانہ نے ناظر صاحب کو مخاطب کر کے سوزاں صاحب کی نسبت فرمایا آپ کی تعریف؟

ناظر صاحب۔ آپ حبیب الدین سوزاں ہیں پیشکاری کے عہدہ پر باہر سے تبدیل ہو کر یہاں تشریف لائے ہیں۔

میرزا نوشہ۔ وہی سوزاں صاحب نا جو محمد غالب خستہ کے کلام پر اعتراض فرماتے ہیں اور ارشاد کرتے ہیں:

یار پہنچا نے ہمیں تا لب ساحل آئے

کی ترکیب غلط ہے۔

ناظر صاحب۔ جی ہاں آپ وہی سوزاں ہیں۔

(خان بہادر سید حکیم ناصر نذیر فراق دہلوی)

محبّت

محبت کیا شیریں حسین لفظ ہے۔ میرے لب جب اسے دہراتے ہیں، تو ناقابل بیان لذت پاتے ہیں۔ یہ لفظ میں نے کسی سے سیکھا نہیں، خود بخود اس سے روشناس ہو گیا ہوں، میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے دل کی گہرائی سے نکل کر میرے خون میں دوڑتا میرے لبوں پر آرہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ میرے لبوں سے اُڑ کر تیرے جمال کی طرف جا رہا ہے۔ وہ جمال جو ہم دونوں کی مشترک جائداد ہے۔ پھر بعینہٖ یہی لفظ میں نے تیرے میٹھے منہ سے نہایت لطافت، اخلاص، صداقت سے نکلتے سُنا، اور اس کے نشے سے متوالا ہو گیا۔

(مشہور فرانسیسی مصنفہ مارگریٹ)

ت

افلاطون اور پیری

کل میں مقام پائرس کو عبادت کی غرض سے گیا۔ پائرس جانے کا مقصد عبادت کرنے کے ساتھ یہ بھی تھا کہ وہاں ایک دیوتا کا جو تہوار ہونیوالا تھا اُس کا تماشہ بھی دیکھوں۔ میرے ساتھ گلاکون بھی تھا۔ جو آرسٹن کا بیٹا ہے۔ یہاں میں ایتھنز والوں کا جلوس دیکھکر بہت خوش ہوا۔ اگرچہ تھریس والوں کا جلوس بھی کم شاندار نہ تھا۔

جب ہم عبادت کر کے اور تہوار کا تماشہ دیکھکر گھر واپس آ رہے تھے تو سیفالس کے بیٹے پول مارکس نے ہمیں دور سے دیکھ لیا۔ اور اپنے نوکر کو ہماری طرف یہ کہہ کر دوڑایا کہ گلاکون کو ٹھہرنے کیلئے کہو۔ پول مارکس کا نوکر دوڑتا ہوا آیا اور اس نے میرا دامن پکڑ کر مجھ سے کہا "میرے آقا آپ سے ٹھہرنے کو کہتے ہیں"۔ میں نے نوکر سے پوچھا کہ تمہارے آقا کہاں ہیں؟ نوکر نے اشارہ کر کے بتایا وہ آ رہے ہیں۔ ذرا مہربانی فرماکر آپ ان کے تشریف لانے تک انتظار فرمائیے۔ گلاکون نے کہا کہ ہم تمہارے آقا کے آنے تک یہاں ٹھہریں گے۔

اس کے بعد پول مارکس مع اپنے دوسرے ساتھیوں کے آموجود ہوا۔ اس کے ساتھ گلاکون کا بھائی اڈیمنٹس، نی سیئس کا بیٹا نیسٹریٹس اور کچھ اور لوگ بھی تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ بھی تہوار کا تماشہ دیکھ کر آ رہے ہیں۔

پول مارکس آتے ہی بولا "سقراط! اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ تم شہر واپس جا رہے ہو"۔

میں نے اسے جواب دیا۔ "تمہارا خیال ٹھیک ہے"۔

پول مارکس نے کہا "دوست تم دیکھتے ہو ہم تم سے کسقدر زیادہ تعداد میں یہاں موجود ہیں؟"

میں نے کہا "یہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ مگر اس سے تمہارا مطلب؟"

اس پر پول مارکس نے کہا "یا تو تم ہم سے طاقت آزمائی کر لو اور میری مرضی کے خلاف جانا ہے۔ تو چلے جاؤ، ورنہ میری یہ بات مان لو کہ آج تمہیں یہیں ٹھہرنا چاہیئے"۔

میں نے کہا "بھائی طاقت آزمائی کی کوئی ضرورت نہیں۔ طاقت آزمائی کے علاوہ دوسری راہ بھی ہے اور وہ یہ کہ میں تم کو اس پر راضی کروں کہ تم ہمیں اپنی خوشی سے واپس جانے دو۔

پول مارکس نے جواب دیا "اگر ہم تمہاری گفتگو ہی سننے کو تیار نہ ہوں تو تم کس کو راضی کرو گے"۔ گلاکون نے کہا "بھئی! بھلا ایسی حالت میں تمہیں کون سمجھا سکتا ہے"۔

پول مارکس نے کہا "تو بس یہ بات طے شدہ ہے کہ اس وقت شہر کو واپس جانیکے بارے میں ہم تمہاری ایک نہیں سنیں گے اور تمہیں آج یہیں ٹھہرنا پڑیگا"۔

اتنے میں اڈیمنٹس بولا "بھئی! ٹھہرنے میں مضائقہ کیا ہے۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ آج رات کو مشعل والی گھوڑ دوڑ ہونے والی ہے۔ یہ آج جس دیوی کی پوجا تھی وہ اسی کی ایک رسم ہے۔ ٹھہر جاؤ گے تو اس دلچسپ گھوڑ دوڑ کا بھی تماشہ دیکھ لو گے۔

میں نے کہا "مشعل والی گھوڑ دوڑ! یہ تو میرے لئے بالکل نئی چیز ہے! تو کیا اس گھوڑ دوڑ کے معنی یہ ہیں کہ سواروں کے ہاتھ میں مشعلیں ہونگی اور جب گھوڑ دوڑ ہوتی ہوگی تو ایک سوار دوسرے سوار کو گھوڑا دوڑاتے ہوئے مشعل دیدیگا۔ کیا تم اسی کو مشعل والی گھوڑ دوڑ کہتے ہو؟"

اس پر پول مارکس بولا "ہاں مشعل والی گھوڑ دوڑ کے معنی یہی ہیں جو تم کہہ رہے ہو۔ اس کے علاوہ رات کو تماشہ بھی ہوگا اور یہ تماشہ دیکھنے کے قابل ہے۔ کھانا کھا کر ہم یہ تماشہ دیکھنے چلیں گے۔ وہاں بہت سے نوجوان دوستوں سے ملاقات ہوگی جن سے خوب باتیں ہونگی۔ اس لئے آج ضرور ٹھہر جاؤ اور اپنے انکار سے ہمیں مایوس نہ کرو"۔

اس پر گلاکن بولا "ایسی حالت میں تو ٹھہرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے"...

میں نے کہا "اگر تم لوگوں کی یہی رائے ہے تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے"۔

اس کے بعد ہم پولی مارکس کے ہاں گئے۔ وہاں اس کے دونوں بھائی لیسینس اور اتھی ڈیمس موجود تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ چالیڈن کے تھریسی میکس۔ پیرمنٹا ئڈس۔ اور ارسٹونی مس کے بیٹے کلیٹی فون سے بھی ملاقات ہوئی۔

پولی مارکس کا باپ سیفالس بھی مکان پر موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ سیفالس بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ بہت دن کے بعد آج اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ تکیہ دار کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اپنے سر کو پھولوں کے ہار میں لپیٹے ہوئے تھا۔ کیونکہ آج اس نے دیوتا کے سامنے قربانی کی نذر پیش کی تھی۔ اس کے قریب نشستیں خالی پڑی تھیں اس لئے ہم اس کے پاس بیٹھ گئے۔

سیفالس نے مجھے دیکھتے ہی سلام کیا اور بولا "سقراط! تم ہمارے ہاں پائرس میں بہت کم آتے ہو حالانکہ تمہیں ہمارے ہاں بار بار آنا چاہئے۔ اگر مجھ میں اتنی طاقت ہوتی کہ شہر تک ٹہل کر جا سکتا تو تمہیں یہاں آنے کی زحمت نہ دیتا۔ بلکہ میں خود تمہارے ہاں آتا۔ لیکن چونکہ میں اب کمزور اور بوڑھا ہو گیا ہوں اس لئے تم کو لازم ہے کہ میری بات مان لیا کرو۔ اور میرے پاس اکثر آیا کرو تاکہ تم سے اور مجھ سے فلسفہ کے مسائل پر گفتگو ہوا کرے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جس قدر دنیوی لذات کے حصول کی جسمانی طاقت گھٹتی جاتی ہے۔ اسی قدر فلسفیانہ نکات پر غور کرنے کی خواہش دل میں بڑھتی جاتی ہے۔ لہذا ہماری درخواست نامنظور نہ کرو۔ اور اپنی صحبت سے مجھے اور میرے بچوں کو مستفیض کیا کرو۔

میں نے جواب دیا "سیفالس! حقیقت یہ ہے کہ مجھے صرف بوڑھے لوگوں سے بات کرنے میں لطف آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو منزل حیات ہمیں ابھی طے کرنی ہے اس سے وہ پہلے گذر چکے ہیں۔ اس لئے ہمیں ان سے معلوم کرنا چاہئے کہ اس دشوار گذار منزل کے متعلق ان کے تجربات کیا ہیں؟ اور یہ منزل کیسی ہے اور چونکہ تم زندگی کی اس منزل میں پہنچ گئے ہو جسے شعرا مخزن تجربات کہتے ہیں۔ لہذا تم سے زیادہ میں کسی کی رائے سے فائدہ اٹھانے کا خواہاں نہیں ہوں۔ اس دلچسپ صحبت میں میں تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جس عمر سے تم گذر رہے ہو وہ تکلیف دہ ہے یا عافیت بخش؟ اس کے متعلق جو تمہاری رائے ہو اس سے ہمیں مستفید کرو۔"

سیفالس نے کہا "سقراط! مطمئن رہو۔ میں بے تکلف تمہیں اپنے تجربات سے آگاہ کروں گا۔ بوڑھے لوگ جب آپس میں ملتے ہیں۔ تو ایام رفتہ کی مسرتوں کو یاد کر کے افسوس کرتے ہیں اور جوانی کی سرمستیوں محفلوں مجلسوں اور شراب ارغوانی کی صحبتوں کو یاد کر کے حسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ انہیں بہت افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ جوانی جو بڑی نعمت تھی ان سے چھین لی گئی۔ ان کے خیال میں جوانی کی زندگی کے مقابلہ میں بڑھاپے کی زندگی بالکل بے وزن ہے۔ بعض بوڑھے اس کی بھی شکایت کرتے ہیں کہ ان کے اقربا ضعیفی کی وجہ سے ان کی توہین کرتے ہیں۔ اور اس سے ان کو سخت تکلیف پہنچتی ہے۔ لیکن سقراط! واقعہ یہ ہے کہ ان شکایت کرنے والے اور افسوس کرنے والے بوڑھوں کو اپنے غم کا اصلی راز معلوم نہیں! اگر ان مصیبتوں کا باعث بڑھاپا ہوتا تو مجھے بھی یہ مصیبتیں محسوس ہوتیں اور ہر بوڑھے کو بڑھاپے کی مصیبت محسوس ہوتی۔ لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا۔ ہمارے اکثر بوڑھے دوست بڑھاپے کی شکایت نہیں کرتے۔ سوفکلس نامی مشہور شاعر سے کسی نے پوچھا کہ کیا بڑھاپے میں تمہارا جی چاہتا ہے کہ کسی حسینہ کی طرف التفات کرو۔ اس نے کہا لاحول ولا قوۃ! خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس شیطانی جذبہ سے نجات ملی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جوانی سے نجات پانا کسی پاگل اور وحشی ظالم آقا کے چنگل سے نجات پانے کے مترادف ہے"۔

میرا خیال ہے کہ سوفکلس نے نہایت واضح حقیقت بیان کی۔ کیونکہ بڑھاپے کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ انسان کو اس وقت ان شیطانی جذبات سے نجات مل جاتی ہے جو انسان کو بے قابو، بیہودہ اور پاگل بنا دیتے ہیں۔ جب خواہشیں دب جاتی ہیں اور تمام جذبات حیوانیہ سے بڑھاپے میں انسان کو آزادی مل جاتی ہے۔ تو اس وقت سوفکلس کا قول بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ان جذبات سے نجات حاصل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان نے بہت سے ظالم اور خونخوار اور وحشی آقاؤں کی غلامی سے نجات پائی ہے۔ لیکن سقراط! واقعہ یہ کہ بوڑھوں کو جوانی کے جانے کا جو افسوس ہوتا ہے اور اپنے عزیزوں سے جو وہ لڑتے ہیں تو اس کا ایک اور سبب ہے اور وہ بڑھاپا نہیں ہے بلکہ خود ان کا کیرکٹر ہے۔ اگر ان کا مزاج خراب نہیں اور وہ صاحب فکر ہیں تو بڑھاپا کوئی بُری چیز نہیں۔ لیکن اگر انسان کو غور و فکر کی عادت نہیں ہوتی اور وہ بدمزاج

ہوتا ہے تو جوانی بھی اس کے لئے ویسی ہی تلخ اور سخت ہوتی ہے جیسی ضعیفی۔

میں نے سیفاکس کے اس عالمانہ گفتگو کی بہت تعریف کی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میری تعریف سے متاثر ہو کر اپنے نادر خیالات کا بے تکان اظہار کرتا چلا جائے۔ میں نے چھیڑنے کے لئے اعتراضاً کہا۔

"سیفاکس! کہنے کو تم ٹھیک ہو لیکن لوگ تمہارے ان خیالات سے اتفاق نہیں کرتے اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ تم اپنے کیریکٹر کی خوبی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی بے شمار دولت کی وجہ سے بڑھاپے کو خوشدلی سے گذارتے ہو۔ کیونکہ امیروں کو ہر طرح کی راحتیں میسر ہوتی ہیں۔

سیفاکس نے کہا کہ معترضین کے اس اعتراض کا جواب اگر میں نفی میں دوں تو وہ میری تردید کو تسلیم نہیں کریں گے۔ اگرچہ ان معترضین کا خیال ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ لیکن وہ بالکل صحیح نہیں ہے۔ سیریفیٹن نے تھیمسٹوکلس سے طنزاً کہا کہ "تیری شہرت تیری ذاتی خوبیوں کی وجہ سے نہیں، بلکہ تیرے وطن ایتھنز کی وجہ سے ہے۔ چونکہ ایتھنز ایک مشہور مقام ہے۔ اس لئے اس کی وابستگی کے سبب تو بھی مشہور ہو گیا"

اس کا جواب تھیمسٹوکلس نے سیریفیٹن کو یہ دیا۔ اگر میں تمہاری طرح سیریفس کا رہنے والا ہوتا تو ہرگز مشہور نہ ہوتا اور اگر تم ہماری طرح ایتھنز کے رہنے والے ہوتے تو اس صورت میں بھی کسی قسم کی کوئی شہرت حاصل نہ کرتے کیونکہ اگر تم ایتھنز میں رہ کر بھی اسی طرح بے وصف انسان ہوتے جس طرح اب ہو تو تم کو کون جانتا اور اگر میں سیریفس میں رہ کر تمہاری طرح ناکارہ ہوتا تو مجھے کون پوچھتا" سیفاکس نے کہا کہ میں بھی تھیمسٹوکلس کی طرح کہتا ہوں کہ وہ لوگ جو دولتمند نہیں ہیں اور بڑھاپے میں ناخوش رہتے ہیں، ایک حد تک ان کی ناخوشی جائز ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بالکل ٹھیک ہے کہ بڑی سے بڑی دولت کسی بدمزاج انسان کو اپنے حالات اور اپنے یگانوں سے خوش نہیں رکھ سکتی وہ اپنی بدمزاجی اور بدخصلتی کی وجہ سے اپنی ذات اور اپنے ماحول دونوں سے نالاں رہتا ہے۔ لہذا بڑھاپے اور جوانی کو خوشی سے کاٹنے کا اصلی راز خوش مزاج اور خوش خصلت ہونا ہے۔

(سید فضل الرحمٰن
پٹنہ)

شاعر کا ترانۂ تخیل

عالمِ کیف میری دنیا ہے ‏ ‏ ‏ چشمِ حیراں مرا تماشا ہے
بزمِ قدرت کا ہوں تماشائی ‏ ‏ ‏ ذوق و عبرت میری شناسائی
اک بلندی مرے تخیل میں ‏ ‏ ‏ اک لطافت مرے تأمل میں
کیا کہوں کیا یہ میرا سینہ ہے ‏ ‏ ‏ اک خیالات کا خزینہ ہے
ہوں میں شبہائے تار پر حیراں ‏ ‏ ‏ چاندنی کے نکھار پر حیراں
میرا غنچہ میں ہے سکوت نہاں ‏ ‏ ‏ پھول میں بات کا ثبوت نہاں
ایک حیرت ہے میری بیداری ‏ ‏ ‏ اک پریشانی نیند میں طاری
بول بالا ہو حسن والوں کا ‏ ‏ ‏ ہے نتیجہ مرے خیالوں کا

نایاب (ریاست بہاولپور)

خدا

اسی کے حکم سے بہتی ہے چاندی آبشاروں میں
حسین فطرت لیے بیٹھی ہے بربط کوہساروں میں

اسی کے حکم سے دن رات گردش ہی بگولوں میں
چراغاں کر رہے ہیں کرمکِ شب تاب پھولوں میں

حسیں کرنیں اسی کا دلربا پیغام دیتی ہیں
زمانے پر سنہری خدمتیں انجام دیتی ہیں

ملائک منتشر ہیں صبح کی اُجلی فضاؤں میں
نقاب نور پہنے اُڑتے پھرتے ہیں ہواؤں میں

اسی کے حکم سے شاخیں گلوں کے ساتھ بڑھتی ہیں
سحر کی گود میں رنگینیاں پروان چڑھتی ہیں

سب اس کے حکم کی تعمیل صبح و شام کرتے ہیں
نہیں کرتے جو کچھ وہ بھی اسی کا کام کرتے ہیں

جب اس کے رحم کی کرنیں دلوں کو جگمگاتی ہیں
مسرت سے غریبوں کی نگاہیں مسکراتی ہیں

امیروں کی دعائیں اس سے عرضِ حال کرتی ہیں
گناہوں کا زبانِ اشک سے اقبال کرتی ہیں

اسی سے ہی فلک تک جرأت پرواز آہوں کو
بدل دیتا ہے وہ نیکی سے صد سالہ گناہوں کو

بچاتا ہے سمندر میں ہوا سے بادبانوں کو
وہی طوفان سے محفوظ رکھتا ہے چٹانوں کو

پہاڑوں کے سفر میں راہبر ہے آبشاروں کا
محافظ ہے شبِ تاریک میں روشن ستاروں کا

عطا کرتا ہے شوقِ دشت پیمائی بگولوں کو
سکھاتا ہے وہ آئینِ چمن رنگین پھولوں کو

کہاں تھی ہمتِ پرواز پہلے ننھی جانوں میں
جواں کرتا ہے بے پر طائروں کو آشیانوں میں

جب انساں اس کی عظمت کے مقدس گیت گاتے ہیں
کنارِ شب میں نوزائیدہ انجم مسکراتے ہیں

ہوائیں اس کے در پر سجدۂ شکرانہ کرتی ہیں
طواف اُس کی حریم ناز کا روزانہ کرتی ہیں

فاخر ہریانوی

آر ۱۰۱ کا سانحہ

مغرب کے ایک انسان نے "ہوائی جہاز" بنایا۔ اور دعویٰ کیا کہ اب ہوائی سفر خطرات سے محفوظ ہوگیا ہے۔ مغرب نے اس صدا پر یقین کیا اور خوشی کا اظہار کیا۔ مگر مشرق کے عافیت پسندوں نے اس کا مضحکہ اُڑایا۔ اور اس آواز کو 'جنون' اور 'خود پسندی' سے تعبیر کیا۔ "مغرب" والوں نے اس دعویٰ کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے کے لئے ہوائی سفر اختیار کئے اور اپنی عزیز جانیں "اولوالعزمی" کے دیوتا کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیں۔

حقیقت میں آر ۱۰۱ کی کامیاب پرواز سے انسانی فتوحات میں قابلقدر اضافہ ہوتا مگر قدرت کو انسان کی "اولوالعزمی" کا ابھی اور امتحان لینا باقی تھا۔ چنانچہ آر ۱۰۱ بہت جلد نذر آتش ہوگیا۔ اور یورپ کے بہت سے معزز سپوت موت کی آغوش میں دائمی نیند سو گئے۔ مشرق نے یہ واقعہ سنا۔ اور اس پر فاتحانہ انداز میں تنقید کی۔ اور "مغربی دیوانوں" کی ناکامی دیکھ کر پھولا نہ سمایا۔ مغرب نے بھی یہ واقعہ سنا۔ اور ہمت اور اولوالعزمی کے دربار سے یہ انعام حاصل کرکے حیرت زدہ ہوا۔ ظاہر میں انسان کی بے بسی کا اس سے بڑھ کر اور کیا مظاہرہ ہوسکتا ہے۔ کہ محفوظ ترین ہوائی جہاز کی بمشکل تمام فرانس تک رسائی ہوسکی۔ حالانکہ غیر محفوظ ہوائی جہاز میں نئی دنیا تک پرواز کی جاچکی ہے۔ لیکن یورپ کا تحیّر بہت جلد مستعدی اور سرگرمی سے بدل گیا۔ چنانچہ اخبار بین حضرات جانتے ہیں۔ کہ ان شہیدانِ عزم کا جلوس بڑی دھوم دھام سے نکلا اور جلوس کی افتتاحیہ رسم ادا کرتے ہوئے مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیراعظم برطانیہ نے ان ہلاک شدگان کا ذکرِ خیر کرنیکے بعد یہ کہا "ہماری یہ ناکامی آئندہ کامیابی کا پیش خیمہ ہے اور اب ہم ہوا کو ضرور فتح کرکے رہیں گے"۔

یہ تقریر پڑھ کر میری عجیب حالت ہوئی۔ اخبار میرے ہاتھ سے گر گیا۔ اور میری زبان سے یہ الفاظ نکلے۔

"بے شک مغرب مغرب ہے"

کسقدر تعجب کا مقام ہے کہ مغرب ایک تجربہ کے امتحان کے لئے اپنے فرزندوں کی عزیز جانیں پیش کرتا ہے۔ اور یہ تجربہ ناکامی پر منتج ہوتا ہے۔ ...... مغرب اس واقعہ سے متاثر ہوتا ہے تو پکار اُٹھتا ہے کہ "ہماری ناکامی آئندہ کامیابی کا پیش خیمہ ہے۔ اور اب ہوائی سفر خطرات سے محفوظ ہوکر رہیگا"۔ مگر مشرق جسے اس واقعہ سے دور کا تعلق ہے۔ یعنی وہ محفوظ ہوائی سفر سے صرف فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ مغرب کی اس ناکامی پر بغلیں بجاتا ہے۔

ع آفریں باد بریں ہمتِ مردانہ تو

آر ۱۰۱ کی تعمیر میں مشرق کا کچھ صرف نہیں ہوا نہ اس کی تباہی سے کسی مشرقی کی جان ضائع ہوئی تاہم اس واقعہ پر خوش ہونا اپنی کم ہمتی کا مظاہرہ نہیں تو اور کیا ہے۔ (کیا مشرق نے واقعی اس واقعہ پر اظہارِ مسرت کیا؟۔ ا۔ د)

آر ۱۰۱ کس موجد کے دماغ کا نتیجہ تھا۔ اس میں کتنی نشستیں رکھی گئی تھیں۔ اس کو آگ کیسے لگی وغیرہ یہ باتیں میرے کام کی نہیں۔ میرے لئے تو قابلِ غور یہ "ہوا کو فتح کرکے رہیں گے"۔ یا "ہوائی سفر خطرات سے محفوظ ہوکر رہیگا"، ہے۔ میں اس قوم کی جرأت اور اولوالعزمی پر غور کرتا ہوں۔ جس کے سپوت ایک تجربہ کے امتحان کے لئے اپنی جانوں کی پروا نہیں کرتے، اور جس کے افراد اپنے بہت سے مقتدر ترین ملکی بھائیوں کی جانیں گنوا کر بھی اپنے ارادہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر مستعد نظر آتے ہیں۔

بلاشبہ ہوائی سفر خطرات سے محفوظ ہوکر رہیگا۔ چونکہ جو قوم ہوا کے سمندر میں پیر سکتی ہے وہ اپنی حفاظت کا انتظام بھی کرسکتی ہے۔ صدیوں اڑن کھٹولا کا طلسم ہمارے دماغ میں بسا رہا۔ حیرت ہے ان مغرب والوں پر جنہوں نے سچ مچ کا اڑن کھٹولا بنا لیا۔ پھر کہا جاسکتا ہے کہ وہ قوم ہوائی سفر کی حفاظت کے لئے کیا کچھ نہ کر گذرے گی۔ حقیقت میں یورپ کی ترقی کا راز اولوالعزمی ہے۔ کیونکہ اپنے خیالات بلند رکھنا اور ان کے مطابق کارزارِ حیات میں سرگرم ہونا کامیابی کا دوسرا نام ہے۔ جن لوگوں نے دنیا میں بلند رتبے

حاصل کئے۔ جو شہرت کے آسمان پر ستارے بنکر چمکے جو ہمیشہ عروس کامرانی سے ہمکنار رہے۔ ان کے سوانح حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کی ترقی "الوالعزمی" کی رہین منت ہے۔

اگر نپولین اعظم (شہنشاہ فرانس) فوج کا معمولی عہدہ دار ہونے پر قناعت کرتا۔ اگر بنجمن فرنکلن (صدر جمہوریہ امریکہ) تہذیب و تمدن کے مراکز سے چالیس میل دور ایک کٹیا میں زندگی بسر کرنے پر مطمئن ہو جاتا۔ اگر جیمز گارفیلڈ (صدر جمہوریہ امریکہ) بڑھئی بن جانا ہی غنیمت جانتا۔ اگر مسولینی (اٹلی کا مختارکل۔ ڈکٹیٹر) اپنے خیالات کے خلاف باپ کا پیشہ اختیار کر لیتا (مسولینی کا باپ لوہار تھا) اگر رضا خاں (شہنشاہ ایران) سائیس بن جانے پر قانع رہتا۔ تو یقیناً کامیابی آج ان کی لونڈی نہ ہوتی۔ اور دولت اور اثر و اقتدار ان کے غلام نہ بنتے۔ مگر دنیا جانتی ہے کہ ان لوگوں نے بلند خیالی اور الوالعزمی کے طفیل دنیا کے بلندترین رتبے حاصل کئے۔ رہتی دنیا تک تاریخ میں ان کے نام محفوظ رہیں گے۔ اور ان کی زندگیاں دوسروں کے لئے مشعل راہ بنیں گی۔

الوالعزمی نے نئی دنیا سے ہمارا تعارف کرایا۔ قابل قدر ایجادوں سے روشناس کرایا۔ اور فطرت کے مخفی خزانے ہمارے قدموں میں ڈال دیئے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن قوموں نے اپنے خیالات کو بلند بنایا اور انہیں عملی جامہ پہنایا، وہ ہمیشہ کامیاب رہیں۔ عرب کے بدو صرف اس لئے ساری دنیا پر چھا گئے کہ ان کے عزائم بلند تھے۔ انگلینڈ کے مٹھی بھر باشندے ایک تہائی دنیا پر اس لئے مسلط ہیں کہ ان کی قوت ارادی زبردست ہے۔ دور کیوں جائیں۔ جاپان، ننھے منے جاپان نے جنگ میں الوالعزمی کی بنا پر روسی دیو کو چاروں شانے چت پچھاڑ دیا۔

مگر آہ یہ کسقدر تلخ حقیقت ہے۔ کہ "روحانیت" اور اخلاق میں "برتری" کا شرف رکھنے والا مشرق اپنے یہ خصائص بھی کھو بیٹھا ہے۔ وہ الوالعزم نہیں ہے۔ پابند وقت نہیں ہے۔ بنی نوع کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی کام نہیں کر رہا۔ اور فطرت کے بے پایاں (بھرپور) خزانہ سے فائدہ نہیں اٹھا رہا ہے۔ ڈاکٹر اقبال کا گلہ کسقدر بجا ہے۔ ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

روحانیت و اخلاق کوئی دیوتا نہیں جس کے سر پر سرخاب کے پر لگے ہوں۔ نہ وہ "ہما" ہے جس نے تمہیں روحانیت کا شہنشاہ بنایا۔ بلکہ روحانیت و اخلاق تکمیل انسانیت کی راہیں ہیں۔

روحانیت صفات حمیدہ کا نتیجہ ہے۔ الوالعزمی۔ پابندیٔ وقت انسان کی بہتری کی تجویزیں سوچنا۔ اور مفید ایجادیں کرنا۔ صفات حمیدہ ہیں۔ جن کا سرمایہ دار آج مغرب ہے۔ پھر کیا تم نے اپنی یہ دولت بھی مغرب کو سونپ دی۔

ہمارے شہروں قصبوں اور دیہات کی گلیوں میں گداگروں کی کثرت ہے جو باوجود توانا و تندرست ہونے کے "بابا ایک پیسہ" کی صدا لگا رہے ہیں۔ لندن کی یہ حالت ہے کہ وہاں کا بوٹ پالش کرنے والا لڑکا ایک نواب کو صرف اس لئے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ کہ وہ کیوں اسے بغیر محنت کئے ایک شلنگ دینا چاہتا ہے۔

ہمارے ملک کے اکثر گریجویٹ معمولی مشاہرہ کے کلرک ہیں۔ مگر مغرب کے ایک بیرسٹر گریجویٹ کی الوالعزمی دیکھئے۔ اس کے باپ نے اسے ہائی کورٹ کے دفتر میں معقول معاوضہ پر کلرکی کی ایک جگہ دلوا دی۔ کچھ روز کام کرنے کے بعد اس نے استعفیٰ دیدیا۔ اور باپ کے استفسار پر جواب دیا کہ "جناب میں دوسروں کے خیالات کا ٹائپ کرنے والا کلرک نہیں بننا چاہتا۔ میری آرزو ہے کہ میں خود وہ آدمی بن جاؤں، جس کے خیالات دوسرے ٹائپ کریں"۔ اور حقیقت میں وہ چند سال بعد اسی ہائی کورٹ کا جج بنا بیٹھا تھا۔

بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ مشرق اپنی خصوصیات کھو بیٹھا ہے، اور جب تک وہ الوالعزم نہیں بنتا۔ دنیا میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں۔ کہ کامیابی مادی اشیا سے متعلق ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ کوئی مادی شے اس وقت تک وجود میں نہیں آتی۔ جب تک وہ کچھ مدت کے لئے خیالی شے نہ رہی ہو۔ ایک مغربی فلاسفر کہتا ہے "ہوائی قلعے بنیاد ہیں ارضی قلعوں کی"۔

اس لئے اگر ہم اپنی قومی زندگی کی تعمیر چاہتے ہیں یا اگر ہمیں انفرادی ترقی مطلوب ہے۔ تو ہمیں الوالعزم بننا چاہئے۔ اپنی شخصیت کو ادنیٰ خیالات سے پست نہیں کرنا چاہئے۔ مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہئے۔ اگر ہمیں تجارت میں کامیابی حاصل کرنے کی آرزو ہو تو استقلال سے کام کرتے رہنا چاہئے۔ اور نفع کی قوی امید رکھنی چاہئے۔ کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔

راجہ میر زمان خاں

پُرانا قرش

جمعہ کی پینٹھ میں، ایک کباڑی کی دوکان پر، پروفیسر بابیلاس ایک پرانا قرش[1] پاکر یہ سمجھا کہ گویا اسے قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے۔

یہ قرش مصر قدیم کے ایک غیر معروف فرعون خاق عاتن کے زمانہ کا ڈھلا ہوا تھا جو بارہ گھنٹے سے زیادہ بادشاہ نہ رہ سکا۔

ابھی وہ دربار تاج پوشی سے فارغ ہوکر محل میں داخل ہی ہوا تھا کہ باغیوں نے ملک میں غدر برپا کردیا اور اسے تخت سلطنت سے معزول کرکے ملک میں جمہوری سلطنت قائم کر دی۔

مورخ اعظم پروفیسر بابیلاس نے ایک ضخیم کتاب میں اس کے تاریک دورِ حکومت پر روشنی ڈالی تھی لیکن افسوس کہ جب یہ کتاب طبع ہوکر پریس سے بازار میں آئی تو تاریخ کے پروفیسروں نے اس کا مذاق اُڑایا اور اڈیٹروں نے تمسخر آمیز الفاظ میں اس پر تنقید لکھی — معترضین کا دعویٰ یہ تھا کہ قدیم فراعنہ مصر میں اس نام کا کوئی فرعون ہی نہیں گزرا۔

آج جب سلیم کباڑی نے اسے یہ قرش دکھایا تو وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔ اس نے اپنے دل میں کہا بیشک، یہ پرانا قرش جس پر خاق عاتن کا نام کندہ ہے اس کے معترضین کے لبوں پر مُہر لگا دیگا۔ اس کی کتاب اب ایک آنہ سیر کے حساب سے پنساری کی دکان پر نہیں بکیگی بلکہ اسے دنیا کی بہترین لائبریریوں میں خوبصورت الماریوں کی زینت بنایا جائے گا۔ اور کیا تعجب ہے اسے تاریخ کا نوبل پرائز بھی ملجائے۔

سلیم کباڑی کی دکان پر جو پرانی چیز آتی تھی وہ اسے پروفیسر کو دکھانے کے لئے الگ اٹھا رکھتا تھا، کیونکہ اسے یقین تھا کہ پروفیسر ایسی چیزوں کا عاشق ہے۔ عام لوگ جن پرانی چیزوں کو کوڑیوں کے مول بھی لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے وہ ان کی منہ مانگی قیمت دیتا ہے۔

کباڑی نے کہا پروفیسر صاحب! میں اس قرش کی قیمت ایک گنی لونگا۔

پروفیسر نے فوراً ایک گنی اس کے ہاتھ پر رکھدی اور دوسری چیزیں دیکھے بغیر خوشی میں ناچتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔

گھر پہنچ کر پروفیسر اپنی لائبریری کے کمرہ میں آیا اور اس پُرانے قرش کو اپنے لکھنے پڑھنے کی میز کی دراز میں رکھدیا اور پھر باقی پینٹھ دیکھنے کے لئے واپس چلا گیا۔

دوسرے دن صبح کو چائے سے فارغ ہوکر جب پروفیسر اپنی لائبریری کے کمرہ میں آیا تو اسے اپنا پرانا قرش یاد آیا۔ اس نے میز کی وہ دراز کھولی جس میں قرش رکھا ہوا تھا۔ پروفیسر کے چہرہ کا رنگ اُڑ گیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا — وہاں قرش کا پتہ نہ تھا۔ پروفیسر تجرد کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے گھر میں سوائے ایک ماما کے جو برسوں سے اس کے ہاں ملازم تھی۔ اور جس کی دیانت کا وہ کئی مرتبہ امتحان کر چکا تھا اور کوئی پھٹکتا بھی نہ تھا۔ پروفیسر نے دیوانوں کی طرح چیخنا شروع کیا میلانی —! میلانی —!!

دیانتدار میلانی ان وحشتناک آوازوں کو سُنکر گھبرائی ہوئی اپنے آقا کے کمرہ میں داخل ہوئی۔ میز کی اس دراز کو کھلا دیکھکر جس میں سے اس نے آج صبح اپنے آقا کی اجازت کے بغیر قرش نکالا تھا وہ فوراً معاملہ کی تہ کو پہنچ گئی۔

میرے آقا! شاید آپ اس قرش کو تلاش کر رہے ہیں جو اس دراز میں رکھا ہوا تھا؟ آپ اطمینان رکھیں وہ میں نے لیا ہے۔

تو نے میلانی — تو نے —؟ تو وہ اب کہاں ہے؟

کوئلہ والے کے نوکر کو انعام میں دیدیا۔ میں نے اسے مدت سے انعام نہیں دیا تھا۔ آج صبح جب وہ کوئلے لیکر آیا تو مجھ سے انعام مانگنے لگا۔

نیکبخت! یہ تو نے کیا غضب کیا؟ جلد مجھے اس کوئلہ والے کا

[1] ایک مصری سکہ

پتہ تھا۔

میلانی کو اپنی دیانت پر اعتماد تھا۔ اس نے پروفیسر کو کوئلے والے کا پتہ بتا دیا۔

پروفیسر دو دو تین تین سیڑھیوں پر قدم رکھتا ہوا زینہ سے اُترا اور تیر کی طرح بازار میں سے گزرتا ہوا کوئلہ والے کی دکان پر پہنچ گیا۔ اس نے گھبرا کر دکان کے منیجر سے کہا:۔

جناب مجھے آپ کے اُس نوکر سے ملنا ہے جو صبح پروفیسر بابیلاس کے مکان پر کوئلے پہنچانے گیا تھا۔

آہا! آپ جوزف سے ملنا چاہتے ہیں ——— لیکن ہم نے آج صبح اُس نالائق کو اپنی دکان سے نکال دیا ہے۔ جناب وہ ہر وقت شراب میں مست رہتا تھا۔ لیکن اگر آپ اُس کے مکان پر جانا چاہیں تو اُس کا پتہ یہ ہے۔

جوزف کے مکان کا پتہ معلوم ہوتے ہی پروفیسر بھاگا اور اس کے مکان پر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ جوزف کی بیوی نے دروازہ کھولدیا۔ اور جب اسے معلوم ہوا کہ پروفیسر اس کے شوہر سے ملنا چاہتا ہے۔ تو اس نے چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا۔

جناب! وہ شرابی کبابی بھلا گھر میں بیٹھنے والا ہے؟ آج پہلی تاریخ ہے اسے تنخواہ ملی ہے جب تک وہ اسے تہس نہس نہ کر لیگا دم تھوڑا ہی لے گا۔ اس کے بیوی بچوں کے حلق میں تین دن سے جوار کا دانہ اڑ کر نہ گیا ہو تو اس کی بلا سے۔ اسے تو اپنی شراب سے مطلب ہے۔ اگر آپ کو اس سے ملنا ہے تو کسی شراب خانہ میں جائیے جہاں وہ اوندھا پڑا ہوگا۔

پروفیسر نے عورت کا سلسلۂ گفتگو قطع کرتے ہوئے اس شراب خانے کا پتہ پوچھا جہاں جوزف اکثر جاتا تھا اور پھر اسے لعن طعن کرتے چھوڑ کر ادھر کی راہ لی۔

گرمی کا موسم تھا۔ آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا تھا۔ اس بھاگ دوڑ میں پروفیسر کو پیاس محسوس ہونے لگی تھی "الدرۃ الفریدہ"[۱] میں پہنچ کر اس نے پہلے شراب کا ایک گلاس طلب کیا۔ دکاندار نے معذرت طلب کرتے ہوئے کہا جناب آج ہمارا ذخیرہ بالکل ختم ہوگیا ہے ——— آج پہلی تاریخ ہے نا، اس لئے پینے والے زیادہ آئے تھے ——— ہمیں افسوس ہے کہ آج مسٹر جوزف جیسے ہمارے پرانے گاہک بھی محروم لوٹے ہیں۔

پروفیسر نے بات کاٹتے ہوئے کہا مسٹر جوزف ——— ؟ کیا وہ یہاں سے لوٹ گئے ہیں ——— ؟ کیا آپ براہ کرم بتا سکتے ہیں کہ وہ اب کہاں گئے ہونگے؟

دکاندار نے کہا "الذئب الخبیث" میں۔

پروفیسر بھاگتا ہوا "الذئب الخبیث" پہنچا۔ یہاں پولس تلاشی لے رہی تھی اور اس نے قمار بازی کے جرم میں کئی اشخاص کو گرفتار بھی کر لیا تھا۔

پروفیسر نے دکاندار سے پوچھا یہاں مسٹر جوزف تو نہیں آئے؟

دکاندار نے آہستہ سے کہا جناب میں نے انہیں آتے ہوئے تو دیکھا تھا مگر وہ دور سے پولس والوں کی صورت دیکھتے ہی غائب ہو گئے ——— صاحب یہ بڑا اچھا ہوا کہ وہ آج ذرا دیر سے آئے تھے ورنہ اپنے دوستوں کے ساتھ وہ بھی دھر لئے جاتے۔ ویسے بھی ان کا نام دس نمبر والوں کی فہرست میں لکھا ہوا ہے ——— آپ سے ملیں تو میری طرف سے مبارکباد عرض کر دیجئے گا۔

پروفیسر نے کہا کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ اب کہاں ہونگے؟

دوکاندار نے جواب دیا "الغادۃ الحسناء" میں۔

پروفیسر ہانپتا کانپتا "الغادۃ الحسناء" پہنچا۔ وہ پسینہ میں شرابور تھا اور اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ وہ میز کے سامنے جا بیٹھا اور فوراً ایک گلاس کا آرڈر دیا۔

جو لڑکا شراب کا گلاس لیکر آیا اس سے پروفیسر نے پوچھا یہاں مسٹر جوزف تو نہیں آئے؟

لڑکے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور جب آپ شراب خانہ میں داخل ہو رہے تھے تو یہاں سے نکل کون رہا تھا؟

پروفیسر نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ اوہو! میں نے اُنہیں نہیں دیکھا۔ لیکن اب مجھے فوراً ان کا تعاقب کرنا چاہئیے ——— وہ کس طرف گئے ہونگے؟

لڑکے نے کہا وہ یہاں سے "ندوۃ المتنزہین" گئے ہونگے۔ انہیں وہاں آج مہینہ بھر کا حساب صاف کرنا ہے۔ آج پہلی تاریخ ہے نا؟

پروفیسر نے شراب کا گلاس جس میں سے اس نے ابھی ایک

۱ے شراب کی دکان کا نام۔

گھونٹ بھی نہیں پیا تھا میز پر رکھدیا اور بھاگتا دوڑتا "الغادۃ الحسناء" سے "ندوۃ المتنزہین" پہنچا ——— اور "ندوۃ المتنزہین" سے "الاب لولیت" ——— اور "الاب لولیت" سے "قہوۃ التجار" ——— اور قہوۃ التجار سے "الوردۃ المورقہ" لیکن پروفیسر جس شراب خانہ میں بھی پہنچا اسے یہی معلوم ہوا کہ جوزف ابھی ابھی وہاں سے حساب کتاب صاف کر کے اگلے شراب خانہ میں گیا ہے۔

لیکن جب وہ "الوردۃ المورقہ" سے "الصدیق ارلنست" پہنچا تو وہاں اسے جوزف مل گیا۔ وہ ایک پھٹے ہوئے کوٹ اور ٹوٹی ہوئی جوتی والا نوجوان تھا جو کونہ میں ایک کرسی پر نشہ میں چور پڑا ہوا تھا۔

بہت دیر انتظار کرنے کے بعد جوزف کے ہوش و حواس کچھ ٹھکانے ہوئے تو پروفیسر نے اس سے اُس قرش کے متعلق سوال کیا جو وہ آج صبح میلانی سے لایا تھا۔

جوزف نے اپنی واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور قرش نکال کر میز پر رکھدیا۔

پرانے قرش کو دوبارہ پاکر پروفیسر خوشی میں دیوانہ ہوگیا اور اس نے جوزف سے کہا میں اس قرش کے عوض وہ تمام رقم دینے کے لئے تیار ہوں جو میری جیب میں اس وقت موجود ہے۔

بات پکی ہوگئی۔ پروفیسر نے اپنی جیب جوزف کے آگے جھاڑ دی۔ اور جوزف نے پرانا قرش پروفیسر کو دیدیا۔ پروفیسر کے لئے دنیا ایک مرتبہ پھر مسرتوں کا گہوارہ بن گئی۔

پروفیسر جب "الصدیق ارلنست" میں داخل ہو رہا تھا تو اسے بلا کی پیاس لگ رہی تھی۔ لیکن جوزف کی ملاقات اور پھر قرش کے مل جانے کی خوشی میں کچھ دیر کے لئے وہ اپنی پیاس بھی بھول گیا تھا۔ اب جو وہ پرانا قرش لیکر "الصدیق ارلنست" سے اپنے گھر لوٹا تو وہ ابھی "الوردۃ المورقہ" ہی تک گیا تھا کہ پیاس کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر بھڑک اٹھیں۔ وہ بہت افسوس کرنے لگا کہ کیوں اس نے اپنی ساری جیب خالی کر دی۔

جب وہ "قہوۃ التجار" کے سامنے آیا تو اسے شدید پیاس محسوس ہونے لگی ——— جب وہ "الاب لولیت" کے سامنے پہنچا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے حلق میں کانٹے بچھے ہوئے ہیں ——— جب وہ "ندوۃ المتنزہین" کے سامنے پہنچا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ ان کانٹوں میں آگ لگ گئی ہے ——— جب وہ "الغادۃ الحسناء" کے سامنے پہنچا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ آگ اس کی رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے ——— اور جب وہ "الذئب الخبیث" کے سامنے پہنچا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس آگ کا دھواں مشرق و مغرب پر محیط ہوگیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

اب اس کے لئے اپنی رفتار کے تسلسل کو جاری رکھنا ناممکن تھا وہ اپنے آپ کو دھکیلتا ہوا "الذئب الخبیث" میں داخل ہوگیا اور ایک کرسی پر گر گیا اور ہاتھ کے اشارہ سے ایک گلاس طلب کیا۔

تھوڑی دیر بعد مورخ اعظم پروفیسر بابیلاس اپنے منہ کو رومال سے صاف کرتا ہوا "الذئب الخبیث" سے برآمد ہوا۔ مگر اب اس کی جیب میں وہ پرانا قرش نہ تھا جس پر مصر قدیم کے ایک غیر معروف فرعون خاق عاتن کا نام کندہ تھا، جو صرف بارہ گھنٹے بادشاہ رہا۔

(الفکاہنہ مصر) — قاضی زین العابدین سجاد

پشتو

محمود کو دیکھو۔ اور ایاز کے کیا کہنے ہیں۔ جس کا غلام محمود ہو، نیکوں کا مقصد صرف نیکی ہے۔ وہ وقت کے پابند نہیں۔ اگر دل صاف نہ ہو تو اہل طریقت کی پیروی کام نہیں آسکتی۔ جو شخص مجنوں کی طرح دل کا صادق ہو۔ ہم اس پر سلام بھیجتے ہیں۔

(دیوان رحمان)

ستاروں کی دُنیا

یہ ستارے جو ہر رات آسمان پر چمکتے نظر آتے ہیں۔ ایک بڑے نظام سے وابستہ ہیں۔ سورج اِن کا بادشاہ ہے، اور اس کا حجم زمین سے ۳۰۰۰۰۰ گنا زیادہ ہے۔ اسی کے پرتو سے چاند اور ستارے منور ہوتے ہیں۔

یورپ والوں نے علم نجوم میں نہایت دلچسپ تحقیقات کی ہیں۔ سیرز (Seares) ایک انگریز ماہر علم النجوم نے کہا ہے کہ ستاروں کی تعداد تیس ہزار لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ اور ستارے قطعات میں منقسم ہیں۔ اِن قطعات کا نام انگریزی والوں نے (Nebulae) رکھا ہے۔ اگر ایک قطعہ کی وسعت کا اندازہ زمین کی کشش جاذبہ سے کیا جائے تو یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ اِس میں ہزار لاکھ سورج سما سکتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ ہبوبل (Hubble) کا خیال ہے کہ مونٹ ولسن (امریکہ) کے دارالمشاہدہ کی دوربین سے جس کا گھیر سو انچ سے کم نہیں یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ ستاروں کے دو لاکھ قطعات ہیں۔ اور فضا جس کو ہم آسمان کہتے ہیں۔ اس حصہ سے جو دوربین ۱۰۰۰۰۰ میں دکھائی دیتا ہے، ہزار لاکھ گنا زیادہ ہے۔ اگر ہم ۱۰۰۰۰ لاکھ کو دو سے ضرب دیں اور حاصل کو پھر ۱۰۰۰ سے ضرب دیں تو حاصل ضرب 2×10^{25} ہوتا ہے۔ اس تعداد سے کچھ اندازہ ہوسکتا ہے، کہ آسمان پر کسقدر ستارے موجود ہیں۔ اگر اِس تعداد میں ریت کے ذرے جمع کیئے جائیں اور ان کو تمام انگلستان کی زمین پر بچھا دیا جائے تو ایک دیوار کھڑی ہو جائیگی۔ جس کی اونچائی سو گز سے کم نہ ہوگی۔ اس سے قیاس ہوسکتا ہے کہ اگر ہماری دنیا اس ریت کے ذرے کے $\frac{1}{10^6}$ حصہ کے برابر ہو تو کل کائنات میں اِس کی کیا حیثیت ہوگی۔

جس طرح انسان انسان سے صورت شکل، رنگ روپ، وضع قطع وغیرہ میں جدا ہوتا ہے۔ اِسی طرح ستارہ ستارہ سے اوصاف میں جدا ہوتا ہے۔ اِن میں بعض ستارے بہت بڑے ہیں بعض چھوٹے۔ بعض زیادہ روشن ہیں، بعض کم۔ بعض سُرخ ہیں بعض میلے۔ بعض گرم ہیں بعض گرم تر اور بعض اس سے بھی زیادہ گرم۔ سب سے کم روشن ستارہ وولف (Wolf 359) اسقدر روشنی دیتا ہے جو سورج کی روشنی کے $\frac{1}{50}$ حصہ کے برابر ہے۔ مگر روشن تر ستارے ایس۔ دورادوس (S. Doradus) سورج سے ۳۰۰۰۰۰ گنا زیادہ روشنی کا باعث ہیں۔ سب سے چھوٹا ستارہ وان ماَنن (Van Maanen's star) زمین کے برابر ہے۔ اور اِس قسم کے دس لاکھ ستارے سورج کے اندر رکھے جا سکتے ہیں۔ سب سے بڑا ستارہ بیٹ الگیوز (Betelgeuse) اسقدر بڑا ہے کہ دو سو پچاس لاکھ سورج اس میں سما جائیں۔

یہ ستارے گو حجم، وسعت، اور وزن کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر سب ایک ہی قسم کے اجزا سے بنے ہوئے ہیں، حکمائے طبعیات کا قول ہے کہ مادہ کو جزئیات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اور آخری جزُ جس میں اصل مادہ کی حقیقت و اصلیت کی جملہ صفات موجود ہوں اُس کا نام بسائط (Molecule) ہے۔ یہ بسائط بجائے خود کئی جزو لایتجزّہ (atom) ہیں۔ ماہرین علم نجوم اب تجربات کے ذریعہ سے یہ ثابت کر چکے ہیں۔ کہ ستارے بھی جزئیات لایتجزّہ سے مرکب ہیں اور ہر جزو لایتجزّہ کے مرکز میں اثبات بجلی جاگزیں ہے اور اثبات بجلی کے اردگرد نفی بجلی کے ذرات اس طرح گھوم رہے ہیں، جس طرح سورج کے گرد ستارے۔ نفی بجلی کے ذرات کو الیکٹران (Electron) کہتے ہیں۔ اِن نفی بجلی کے ذرّات کی حرکت سے حدّت پیدا ہوتی ہے جو ہماری دنیا کے لئے روشنی اور گرمی کا موجب ہے۔ سورج کی ایک انچ مربع سطح سے اسقدر حدت پیدا ہوتی ہے جسقدر پچاس گھوڑوں کی طاقت والے دخانی انجن سے۔ اگر سورج کی کل سطح پر غور کیا جائے تو قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ہر روز اس قدر حدت پیدا ہوتی ہے جسقدر ۲۵۰۰ لاکھ ٹن کوئلہ جلانے سے۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو سورج ہر روز ۳۶۰۰۰۰ ٹن کے قریب وزن میں کم ہو رہا ہے۔ اور یہ خیال غلط نہیں ہوسکتا۔ کہ سورج اور ستارے آج سے صدیوں قبل اپنی موجودہ حیثیت سے بہت بڑے تھے۔

جس طرح ہماری دنیا میں موت و حیات کا سلسلہ جاری ہے اسی طرح ستارے بھی مرتے اور پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ نیا پیدا شدہ

ستارہ بہت سے اسباب کی بنا پر مختلف حالتیں بدلتا ہے۔ بعض ستارے اپنی حفاظت کے لئے نہایت تیز رفتاری اختیار کرتے ہیں اور انجن کے پہیے کی طرح چکر کاٹنے لگتے ہیں۔ بعض اوقات اس تیز رفتاری کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ستارہ ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اور ایک حصہ دوسرے حصہ کے گرد گردش کرنے لگتا ہے۔ مگر حیرت کا مقام ہے کہ دارالمشاہدہ (observatory) میں یہ کم دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ ایک ستارہ کا تصادم دوسرے ستارے کے ساتھ ہوا ہو۔ باوجود اس حقیقت کے کئی ستارے ایک دوسرے سے نہایت نزدیک ہو کر گھوم رہے ہیں۔

ان انکشافات سے ظاہر ہے کہ دنیائے سائنس کا نظریہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے اور اصل ہماری دنیا حقیقت کی تلاش میں طفل شیرخوار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ جس طرح ایک شیرخوار بچہ چند سال تک کھلونوں اور ماں کے دودھ کے سوا تمام اشیا کی حقیقت سے ناواقف ہوتا ہے، اسی طرح ہماری دنیا کے لوگ انیسویں صدی تک صرف تلاشِ زندگی پر قانع تھے مگر اب عقل کے بال و پر میں طاقتِ پرواز پیدا ہوئی ہے اور علمائے زمانہ نے اس خزانے کی تلاش میں قدم گھر سے باہر رکھا ہے جو صدیوں ہماری نظر سے پوشیدہ رہ چکا ہے یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ تقدیر نے ڈھونڈنے والوں کے لئے کیا کیا محفوظ رکھا ہے!

(ڈاکٹر) محمد عبدالحق

غزل

اللہ رے حسنِ دوست کا عالم نقاب میں
جلووں میں ہے حجاب کہ جلوے حجاب میں

ہر شے بہارِ حسن کی آئینہ دار ہے
یہ کون کھپ گیا نگہِ انتخاب میں

بیٹھے ہوئے ہیں کشتیِ ہستی میں تشنہ لب
کیا جانئے کہ بحر میں ہیں یا سراب میں

دل میں خیالِ مرگ کھٹکتا ہے رات دن
کیا لطفِ زندگی ہے جہانِ خراب میں

آہ اسیرِ دام کا انجام دیکھنا
اپنی صدا بھی آئی نہ واپس جواب میں

ساقی! ہماری توبہ صبر آزما نہ ہو
یہ درد سی ہے کیا نہ جامِ شراب میں

دربردہ عشق بھی نہ کسی سے ہوا اے خدا!
کھائی قسم محبتِ دشمن کے باب میں

ہر جا تلاشِ صبر و سکوں میں اڑائی خاک
مٹی ہوئی خراب جہانِ خراب میں

کیا ذکرِ زیست موت بھی دشوار ہو گئی
راحت پسند ہو کے پھنسے کس عذاب میں

دل بھی وہی رہیگا غمِ عشق بھی وہی
نظمِ زمانہ لاکھ رہے انقلاب میں

پیشِ نظر ہے رنگ وہی بزمِ دوست کا
شاید ابھی ہے دیدۂ بیدار خواب میں

بیدار

فریب

شمعِ تصورِ مراد ـــــــــ دل نے جلائی ہے تو کیا؟
دشمنِ التفات سے ـــــــــ آس لگائی ہے تو کیا؟

اُن کے ورودِ قدس کا! لائی تو ہے صبا پیام
اے دلِ مضطرب! ٹھہر دُور پڑی ہوئی ہے شام
جوششِ انتظار سے دیکھ! چھلک نہ جائے جام
"بھُول" تجھے دے گیا نہ ہو! قاصدِ حُسنِ خوشخرام

کیا وہ ضرور آئینگے! ـــــــــ اور تجھے منائیں گے؟
آہ! یہ صرف خواب ہے!
خواب کا انتظار کیا؟

خندۂ حُسن بیوفا ـــــــــ زخمِ دروں سے پوچھئے
اِس خلشِ عجیب کو ـــــــــ میرے سکوں سے پوچھئے

دے کے حیات داغدار نقشِ وفا مٹائیں وہ
خضرِ وفا کہیں جنہیں راہ میں چھوڑ جائیں وہ
عشق ہو جن سے شکوہ گر عشق کے گیت گائیں وہ
بن کے جمالِ منتظر! خواب میں بھی نہ آئیں وہ

[illegible] محوِ آرزو ـــــــــ اب تو نہ شک کریگا تو
"حُسن" فریبِ حسن ہے
حُسن کا اعتبار کیا؟

روشن صدیقی

تصادمِ غرور

نخلِ گُل شاداب اور ہر شاخِ گُل پھولی ہوئی بو پہ اترائی ہوئی اور رنگ پر پھولی ہوئی
شاخِ گل ہے یا حسیں فطرت کا رنگیں ہاتھ ہے یا بہشتِ حُسن کی حورا کا سیمیں ہاتھ ہے
رنگ کا طوفاں بپا ہے جھُومتی ہیں ڈالیاں مست ہیں اک دوسری کو چُومتی ہیں ڈالیاں
اِن کی جنبش سے ہے رنگ آمیز دامانِ فضا اِن کی لرزش سے ہے نغمہ ریز دامانِ فضا
ہیں غرورِ حُسن کے انداز پھولوں سے عیاں پتّی پتّی کی زباں پر ہے نزاکت کا بیاں
رنگ و بو بن کر غرورِ حُسن براں چار سُو نزہتِ گل بنکے نخوت ہے پریشاں چار سُو

اِک حسینہ، گلشنِ ہستی کا اِک شاداب پھول رنگ و بو کی ایک جنّت حُسن کا نایاب پھول
حُسن کے نشّوں میں مخمور اور مغرورِ جمال آپ ہی اپنی خودی میں مست و مسحورِ جمال
دیکھتی ہے اِن گلوں کو مسکرا کر بار بار ہاتھ رکھتی ہے حقارت سے اُٹھا کر بار بار
یہ تصادم اور تصادم بھی غرورِ حُسن کا کس قدر ہے فکر پرور۔ کتنا کیفیت فزا

اے حسینہ! اِن گلوں کو اِس حقارت سے نہ دیکھ دل کی آنکھیں کھول لے، ہاں چشمِ نخوت سے نہ دیکھ
سر چڑھایا ہے انہی پھولوں کو تو نے بارہا کر دیا بے خود انہی کے رنگ و بو نے بارہا

ان کی خواہش ہے کہ ہوں جلوؤں سے تیری بہرہ مند
تیرا ذوقِ دید کر دیتا ہے ان کو سر بلند

شاطر (غزنوی)

ضد

ا فراد ڈرامہ

اسدارف .... ایک امیر آدمی۔
کیھتر ائن .... اسدارف کی بیوی۔
اما .... ان کی لڑکی۔
الفرڈ .... اما کا شوہر۔
ہنری .... الفرڈ کا ملازم
الزبتھ .... ہنری کی ہونے والی بیوی ✓

الفرڈ کے مکان کا کمرہ۔ بیچ میں کھانے کا میز رکھا ہے۔ داہنی طرف ایک میز ہے جس پر گلاس، صراحیاں اور کھانے کے دوسرے ضروری سامان رکھے ہیں۔ بائیں طرف ایک اور میز ہے، جس پر اخبار رکھے ہیں۔ اس کے ادھر اُدھر چند آرام کرسیاں پڑی ہیں۔

سین پہلا

ہنری اور الزبتھ

ہنری ۔ [میز پر کھانا چننے میں مشغول ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ گنگناتا جاتا ہے]

الزبتھ ۔ (باہر سے) ہنری۔ ہنری، دروازہ کھولو۔

ہنری ۔ (کھول دیتا ہے)

الزبتھ ۔ (دونوں ہاتھوں میں قورے کے دو پیالے لئے داخل ہوتی ہے)

ہنری ۔ (ایک پیالہ اس کے ہاتھ سے لیکر) آؤ میں بھی تمہارا ہاتھ بٹاؤں۔

(دونوں میز چننے میں مشغول ہو جاتے ہیں)

الفرڈ ۔ (کمرہ کی دائیں جانب سے آتا ہے اور دروازہ پر رک کر ان دونوں کی گفتگو سنتا ہے)

الزبتھ ۔ آج اسدارف اور کیھترائن دونوں یہاں ناشتہ کرنے آرہے ہیں۔

ہنری ۔ وہ الفرڈ اور اما کی محبت دیکھ کر تو بہت خوش ہونگے۔

الزبتھ ۔ ہونا چاہئے۔

ہنری ۔ ہم دونوں میں بھی کچھ ان سے کم محبت نہیں ہے۔ (میز کو دیکھ کر اطمینان کی سانس لیتا ہے) ۔ شکر ہے کہ میز چُن دیا گیا۔

الزبتھ ۔ ہاں۔

ہنری ۔ کیا؟

الزبتھ ۔ کچھ نہیں۔

ہنری ۔ کچھ نہیں، کیسے تم کو بھی کہنا چاہئے۔

الزبتھ ۔ کیا؟

ہنری ۔ شکر ہے کہ میز چُن دیا گیا،

الزبتھ ۔ کیوں؟

ہنری ۔ چونکہ یہ کہا جاتا ہے

الزبتھ ۔ بیہودگی ہے۔

ہنری ۔ قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص بخیر و خوبی کسی کام کو انجام دے لیتا ہے تو وہ کہتا ہے، شکر ہے کام پورا ہو گیا،

الزبتھ ۔ یہ سب لغویت ہے۔

ہنری ۔ لغویت ہو لیکن بیہودگی نہیں ہو سکتی۔ یہ بڑے بوڑھوں کا طریقہ ہے۔

الزبتھ - ایسی فضول بک بک مجھ سے نہ کرو۔

ہنری - (ڈانٹ کر) - الزبتھ یہ فضول نہیں ہے - تمہیں اتنا آزاد خیال نہ ہونا چاہئے - (نرمی سے)۔ اچھا آؤ ہم دونوں مل کر کہیں ــــ شکر ہے میز چُن دیا گیا۔

الزبتھ - نہیں -

ہنری - میری خاطر سے ہی

الزبتھ - مَیں تو نہ ـــ

ہنری - (سخت لہجہ میں، تم نہیں کہوگی -

الزبتھ - (اسی لہجہ میں) ہرگز نہیں -

ہنری - جب میں تم سے کسی بات کے لئے کہتا ہوں تو تم یہ ہی کہتی ہو۔ میں تو نہ ـــــ

الزبتھ - (بات کاٹ کر) ہاں - ہاں - جب میرا دل نہیں چاہتا تو تم اگر دس بار بھی کہو تو کیا ہوتا ہے -

ہنری - تو میں تمہیں بیوی بنا کر کیا کرونگا - مَیں دس بار کہوں اور تم ایک بار نہ مانو -

الزبتھ - ہاں جب تم ایسی بیہودہ بات کے لئے کہو گے تو میں کیوں ماننے لگی -

ہنری - یہ بیہودہ بات ہے - خیر سوال اس کا نہیں - چونکہ میری خواہش ہے اس لئے تم کو ماننا چاہئے -

الزبتھ - میں تو نہیں مانوں گی -

ہنری - (سخت لہجہ میں) الزبتھ -

الزبتھ - (اسی لہجہ میں) ہنری -

ہنری - اب تو تم کو کہنا پڑیگا -

الزبتھ - (ہنس کر) کہنا پڑیگا -

ہنری - ہاں - ہاں ـــــ

الزبتھ - ہوش میں ہو کہ خواب دیکھ رہے ہو -

ہنری - مذاق نہ سمجھو - تم کو کہنا پڑیگا ــــ شکر ہے کہ میز چُن دیا گیا۔

الزبتھ - (چپکے سے) کیا کہدوں -

ہنری - کہو -

الزبتھ - جاؤ نہیں کہتی -

ہنری - (غصہ کو روکتے ہوئے) الزبتھ مَیں تم سے درخواست کرتا ہوں -

الزبتھ - مَیں نہیں کہونگی -

ہنری - ایک بار پھر کہتا ہوں -

الزبتھ - نہیں - نہیں - نہیں - سو بار نہیں - ہزار بار نہیں -

ہنری - اچھا مَیں سمجھ لوں گا -

الزبتھ - اچھا میں بھی سمجھ لونگی -

ہنری - (غصہ سے کانپتے ہوئے) تو تم اپنی ضد نہ چھوڑو گی -

الزبتھ - ہاں -

ہنری - نہ چھوڑو گی -

الزبتھ - ہرگز نہیں -

ہنری - تو مزہ چکھ لو - (ہاتھ زور سے مروڑتا ہے)

الزبتھ - ہنری - ہنری -

ہنری - کہو -

الزبتھ - نہیں کہتی -

ہنری - (دہراتا ہے) شکر ہے کہ میز چُن دیا گیا -

الزبتھ - نہیں - نہیں (ہاتھ چھوڑا کر ایک چانٹا ہنری کے رسید کرتی ہے - اور اپنا ہاتھ دباتی ہے) شرم نہ آئی ہاتھ مروڑتے ہوئے - کیا ہوا ؟ جب بھی تو نہ کہا -

ہنری - اچھا نکل جا - میرے سامنے سے - آج سے تمام تعلقات تجھ سے ترک !

الزبتھ - منظور ہے -

ہنری - منظور ہے، تو مجھے تو نے ایسا فضول سمجھ رکھا ہے -

الزبتھ - جب کوئی خود فضول بنے تو میں کیا کروں -

ہنری - (ذرا نرم پڑ کر) تو کیا دو حرف تمہاری زبان سے نہیں نکلتے

الزبتھ - ہاں نہیں نکلتے -

ہنری - اچھا تو دُور ہو میرے سامنے سے -

الزبتھ - جاتی ہوں - (کمرہ کی دائیں طرف چلی جاتی ہے -

ہنری - (دوڑ کر پکڑ لیتا ہے) - الزبتھ - شکر ہے کہ میز چُن دیا گیا -

الزبتھ - نہیں - (چلی جاتی ہے)

ہنری - ضد - تیرا نام عورت ہے - خوشامد - دھمکی - قوت سب تیرے آگے بیکار ہیں - مجھے یقین ہے کہ اگر اس وقت میں اُسے مار بھی ڈالتا تو نہ کہتی -

الفرڈ۔ (ہنستا ہوا داخل ہوتا ہے) ابھی اتنی سختی نہ کرو۔ سمجھا کر کہلا لینا۔

ہنری۔ (ندامت سے) آپ نے بھی سُن لیا۔

الفرڈ (ہنستے ہوئے) ہاں۔ تمہاری جنگ کا کچھ حصہ۔

ہنری۔ یوں تو وہ بُری نہیں۔ نہ جانے آج اسے کیا ہو گیا تھا۔

الفرڈ۔ کون جان سکتا ہے کہ عورت کو اکثر کیا ہو جاتا ہے۔ اچھا جاؤ شراب کی ایک بوتل لے آؤ۔ شاید میرے ——

ہنری۔ (چپکے سے) بغیر کہلائے تو نہ چھوڑونگا۔ (چلا جاتا ہے)

الفرڈ۔ تعجب ہے کہ اما اب تک کپڑے نہ بدل سکیں! ——

دوسرا سین

(الفرڈ اور اما۔ وہی کمرہ)

اما۔ (بائیں طرف سے داخل ہوتی ہے) کیا بات ہے۔ یہ لوگ اب تک کیوں نہیں آئے۔ میرا خیال تھا کہ سویرے ہی آجائینگے۔

الفرڈ۔ (آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے) کہیں رستہ تو نہیں بھول گئے؟

اما۔ (مسکراکر) ہیں۔ تو آپ دوراندیش

الفرڈ۔ (فوراً یاد آجاتا ہے اور زور سے قہقہہ لگاتا ہے) مجھے۔ تمہیں کچھ سنانا ہے۔ (قہقہہ) اتفاقاً میں نے سُن لیا۔

اما۔ کیا سُن لیا؟

الفرڈ۔ (ابھی تک ہنس رہا ہے) میں اپنے کمرہ سے جب نکلا تو اس کمرہ سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ میں آکر دروازہ پر کھڑا ہو گیا۔ ہنری اور الزبتھ دونوں میز چن رہے تھے۔ جب چُن چکے تو ہنری نے کہا شکر ہے کہ میز چن دیا گیا —— الزبتھ سے بھی اس نے اس جملہ کے اعادہ کی درخواست کی۔ الزبتھ نے انکار کیا۔ بحث و مباحثہ نے طول پکڑا۔ نتیجہ جنگ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ہنری نے ہاتھ مروڑا تو الزبتھ نے چانٹا رسید کیا۔ مگر ہے الزبتھ بھی ہٹ کی پوری۔ ہنری نے لاکھ جتن کئے۔ لیکن اس کے منہ سے نہ نکلا۔

اما۔ (الزبتھ کی طرفداری کرتے ہوئے) لیکن ابھی یہ بات تصفیہ طلب ہے کہ دونوں میں ضدی کون ہے۔ ہنری یا الزبتھ؟

الفرڈ۔ نہیں۔ نہیں۔ ہنری بیچارے نے تو بہت خوشامد سے کہا تھا۔

اما۔ لیکن اس کا اصرار تو دیکھو۔

الفرڈ۔ بالکل غیر ضرر رساں۔ اس کے مقابلہ میں الزبتھ کی ضد ہرگز حق بجانب نہ تھی۔

اما۔ (جھلاکر) ساری لغویت ہنری کی ہے۔ یہ بھی کوئی کہلانے کی بات تھی۔ الزبتھ کی اس میں کیا خطا —— اچھا کیا نہ کہا۔

الفرڈ (ہنس کر) اچھا تو آپ کیوں خفا ہوتی ہیں۔ جائیں دونوں جہنم میں، خود ہی کمبخت نمٹ لیں گے۔ ہمیں اس سے کیا مطلب۔ خدا نہ کرے کچھ ہم میں تو ایسی باتوں کا امکان نہیں۔ اگر میں کسی بات کو کہوں بھی تو تم کیوں ٹالنے لگیں؟

اما۔ (ہنستی ہے)

الفرڈ۔ (یقین کے ساتھ) —اس کا تو مجھے پورا اطمینان ہے۔

اما۔ اور اگر میں نہ مانوں۔

الفرڈ۔ (تعجب سے) "اور اگر تم نہ مانو"۔ یہ ناممکن ہے۔ میں شرط تو باندھ نہیں سکتا۔ مگر مجھے یقین ہے ——

اما۔ دیکھو، شرط نہ باندھنا۔

الفرڈ۔ (گھبراکر) تو ہم اس کا امتحان ہی کیوں نہ کرلیں۔

اما۔ (جلدی سے) نہیں نہیں، ہمیں امتحان کی ضرورت نہیں۔

الفرڈ۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ کہو "شکر ہے کہ میز چُن دیا گیا"

اما۔ ابھی بچپنا نہیں گیا۔

الفرڈ۔ خدا کے لئے کہو۔

اما۔ ہٹو، یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔

الفرڈ۔ میری، اما

اما۔ اہوں۔ میں تو نہیں کہونگی۔

الفرڈ۔ (تعجب سے) تم نہیں کہوگی؟

اما۔ نہیں۔

الفرڈ (کرسی سے اُٹھتے ہوئے) تو تم میری استدعا کو ٹھکرا دوگی۔

اما۔ یہ تو بچپنا ہے

الفرڈ۔ (سنجیدگی سے) بچپنا ہو یا بڑھاپا۔ اس کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ تم میری درخواست منظور کر سکتی ہو یا نہیں۔

اما۔ یہ بھی کوئی درخواست ہے۔ دیکھو تم غلطی پر ہو۔

الفرڈ۔ غلطی پر سہی لیکن یاد رکھو کہ تم انکار کرکے .... بڑی غلطی کررہی ہو۔

اِما - مَیں غلطی کر رہی ہوں - یہ پہلا موقع ہے کہ تمہاری زبان سے ـــــ ایسا لفظ سُن رہی ہوں -

الفرڈ - اور یہ پہلا موقع ہے کہ مَیں اپنا کہا ـــــ تمہیں ٹالتا ہوا دیکھ رہا ہوں -

اِما - اور یہ پہلا موقع ہے کہ تم نے ایسی بے معنی اور طفلانہ فرمائش مجھ سے کی ہے

الفرڈ - "بے معنی" "طفلانہ" - یا اللہ مَیں کیا سُن رہا ہوں - کیا محبّت اسی کا نام ہے ؟

اِما - کیا محبّت حماقت کی طالب ہے ؟

الفرڈ - مَیں نے اب تک صرف استدعا کی، کچھ زبردستی تو کی نہیں ـــ

اِما - یا اللہ یہ صرف استدعا تھی اور اگر زبردستی ہوتی تو کیا ہوتا ؟

الفرڈ - تو - (رُک جاتا ہے -)

اِما - ہاں - تو ـــــ

الفرڈ - تو تم انکار نہ کرتیں -

اِما - ضرور کرتی -

الفرڈ - کیا ؟

اِما - استدعا کی حد تک تو ممکن تھا کہ مَیں مان جاتی - مگر زبردستی اور مَیں مان جاؤں !

الفرڈ - تمہارا آج کا سلوک یاد رہیگا - کیوں کیا بیوی کو اپنے شوہر سے یوں ہی گفتگو کرنی چاہئے -

اِما - کیا شوہر کو اپنی بیوی سے ایسی ہی حماقت آمیز استدعا کرنی چاہئے ؟

تیسرا سین

(الزبتھ اس کے بعد ہنری اسی کمرہ میں داخل ہوتے ہیں)

اِما - (الزبتھ سے جو داخل ہوتی ہے) مَیں رومال لانا بھول گئی - ذرا لے تو لینا -

الفرڈ - اِما ابھی تک اسے مذاق ہی سمجھو - دیکھو بات کو نہ بڑھاؤ -

اِما - مَیں بڑھا رہی ہوں - کہ تم بات کا بتنگڑ بنا رہے ہو -

الفرڈ - (ہنری سے جو داخل ہوتا ہے) ایک شراب کی بوتل لاؤ -

الزبتھ - (رومال لے کر آتی ہے اور اِما کو دیکر واپس ہونا چاہتی ہے)

ہنری - (اشاروں میں پوچھتا ہے - کہنی ہے یا نہیں ؟) ـــ شکر ہے کہ مبزچُن دیا گیا -

الزبتھ - (تیور بدلکر اشاروں میں) نہیں کہتی -

ہنری - (گھُور کر دیکھتا ہے)

اِما - (الفرڈ کی طرف رُخ کر کے کسی کام میں مشغول ہو جاتی ہے)

الفرڈ - (ایک اخبار اُٹھاکر دیکھنے لگتا ہے - اور خود بھی اِما کی طرف پیٹھ پھیر کر کھڑا ہو جاتا ہے - ہنری اور الزبتھ چلے جاتے ہیں - الفرڈ بظاہر تو اخبار پڑھ رہا ہے - مگر نظر اِما پر ہے - اخبار پھینک کر - نرمی سے) - اچھا تو اپنی ضد چھوڑتی ہو یا نہیں -

اِما - (غصّہ سے کام چھوڑکر) کیا - کہا - ضد - تم جانتے ہو کہ یہ لفظ مَیں نہیں سُن سکتی -

الفرڈ - اِما - سوچو - میری صرف یہ خواہش ہے کہ تم میری بات رد نہ کرو -

اِما - اور میری یہ درخواست ہے کہ یہ "بات" یہیں ختم کر دی جائے -

الفرڈ - لیکن پہلے مَیں نے درخواست کی تھی - مجھے تو اس وقت اس کا خیال بھی نہ تھا کہ تم "نہیں" کا لفظ منہ سے نکالو گی -

اِما - اچھا تو کیا مَیں ہمیشہ - ہاں ہاں کہا کروں - آخر دوسرے مرد بھی تو ہیں - کہ ایک تمہی دُنیا سے نرالے ہو جو عورت سے مساوات نہیں برتنا چاہتے اور بجائے دوستانہ تعلقات کے اس سے غلامی کے خواہاں ہو -

الفرڈ - خدا کے لئے جھوٹ تو نہ بولو -

اِما - نہیں، نہیں - اس اَن کہی درخواست کے ساتھ تم طوقِ غلامی میرے گلے میں ڈالنا چاہتے ہو - لیکن میں اس اندھی اطاعت کے لئے تیار نہیں ہوں - مَیں پتھر بن کر زندہ رہنا نہیں چاہتی - مَیں آخر دم تک اپنے حقوق کی حفاظت کرونگی ـــــ یہ گھُڑکیاں ـــ یہ خفگیاں مجھے دبا نہیں سکتیں -

الفرڈ - نہیں ! نہیں ان سب کے لئے تو مَیں ہوں -

اِما - مگر یہ بھی تو دیکھو کہ غلطی کس کی ہے - یوں فرمانبرداری کرنا میرا کام - لیکن ایسی بیجا باتوں کا ماننا تو میرے بس کی بات نہیں -

الفرڈ - (ذرا سخت لہجہ میں) کیوں جس کی عزت دل میں ہو اس سے اسی طرح گفتگو کی جاتی ہے ؟

اِما - اُس عورت سے بھی تو ایسی بے تکی خواہش نہیں کی جاتی - جس کی قدر نگاہ میں ہو -

الفرڈ - لیکن یہاں تو مذاق ہو رہا تھا -

اِما - اچھا تو یہ مذاق تھا ـــ (رُک کر) ـــ جبھی تو تم بدمزاج شوہر

کی طرح ۔ لونڈی سمجھ کر میرے پیچھے پڑ گئے تھے ۔

الفرڈ ۔ خدا کے لئے نہ روؤ۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے ۔

اما ۔ (ہچکیاں لیتے ہوئے) میں رو رہی ہوں کہ تم رلا رہے ہو ۔

الفرڈ ۔ (طنز سے) ہاں میں تو ظالم ہوں جب ہی تو ایک بیکس عورت کو رلا رہا ہوں ۔ تمہاری بدقسمتی سے مجھے ہمدردی ہے کہ تم ایسے ظالم کے پالے پڑیں ۔

اما ۔ جب تک طعن و تشنیع نہ ہو ظلم بے نمک ہے ۔ یا تو یہ کہا جاتا تھا کہ مجھ سا نرم دل اور ہنس مکھ ملنا محال ہے یا اب یہ ہے ۔

الفرڈ ۔ (طنزاً) نہیں صاحب ۔ میں ظالم ہوں ۔ بدمزاج ہوں ۔ دل دکھانا میرا کام ہے ۔

اما ۔ (خاموش ہو کر رونے لگتی ہے)

الفرڈ ۔ (چپکے سے) یہ رونا نہیں ہے) ہزاروں گالیاں ہیں ۔ اگر کہیں ان کے والدین دیکھ لیں گے تو نہ جانے اپنے دل میں کیا کہیں گے ۔ (اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے) ۔ پیاری اما ۔ بہت رو چکیں ۔ بس اب آؤ گلے مل جائیں ۔

اما ۔ (آنکھوں سے رومال ہٹا کر خاص انداز سے دیکھتی ہے)

الفرڈ ۔ ایسے خوشگوار دن کو یوں لغویات میں برباد کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے ۔

اما ۔ اب اس کا خیال آیا؟

الفرڈ ۔ شاید ہی کوئی ایسی معمولی بات پر لڑا ہو ۔

اما ۔ (مسکرا کر) جان بوجھ کر مجھے ہلکان کیا ۔

الفرڈ ۔ جانے بھی دو ۔ ان باتوں کو ۔ (صلح ہو جاتی ہے)

اما ۔ تم بڑے شریر ہو ۔

الفرڈ ۔ اما ۔ پیاری اما اسی محبت کے صدقہ میں کہدو ۔

اما ۔ کیا؟

الفرڈ ۔ نہ کہوگی؟

اما ۔ لیکن ۔ الفرڈ ۔

الفرڈ ۔ میں نے معافی مانگی ۔ میں خود تم سے ملا ۔ اب میری خاطر تم اتنا کرو ۔

اما ۔ (بیتاب ہو کر) دیکھو ۔ پھر وہی ۔ گئی گذری بات کو خدا کے لئے زندہ نہ کرو ۔

الفرڈ ۔ (خوشامد سے) خدا کے لئے صرف دو لفظ منہ سے کہہ کر اس جھگڑے کو ختم کرو ۔

اما ۔ (غصہ سے) ہزار بار نہیں، لاکھ بار نہیں ۔

الفرڈ ۔ (غصہ کو روک کر) نہیں؟

اما ۔ (استقلال سے) ہرگز نہیں ۔

الفرڈ ۔ شاباش! ۔ محبت اسی کا نام ہے؟ ۔ یہ جانتے ہوئے کہ صرف تمہارا زبان ہلا دینا ۔ میرے لئے کسقدر باعث مسرت ہوگا ۔ تم انکار کر رہی ہو ۔ میں نے مانا کہ میری خواہش بیجا ہے ۔ لغو ہے ۔ میرا اصرار ضد کی حد تک پہنچ چکا ہے ۔ مگر اما ۔ محبت کے یہ معنی نہیں ہیں ۔ تم کو اچھائی ۔ برائی ہر حال میں میری شریک زندگی رہنا چاہئے ۔ بھلا تم خود سوچو کہ ان لغو الفاظ کے سننے سے مجھے کیا ایسا قارون کا خزانہ مل جاتا ۔ مگر صرف تمہاری محبت کا ثبوت ۔ افسوس تم نے میری خواہش کو یوں ٹھکرا دیا ۔ تم صرف ضد چھوڑ کر مجھے خوش کر سکتی تھیں ۔ مگر جب خوش کرنا منظور بھی تو ہوتا ۔ اچھا اب آپ آئندہ سے محبت کا دعویٰ نہ کیا کریں ۔ (غصہ میں ٹہلنے لگتا ہے)

چوتھا سین

(وہی کمرہ ۔ ہنری داخل ہوتا ہے)

ہنری ۔ آپ کے خسر صاحب اور خوشدامن صاحبہ آ گئے ۔

الفرڈ ۔ (پریشان ہو کر آہستہ آہستہ اما سے) آنسو پونچھ ڈالو ۔ وہ لوگ کیا خیال کریں گے ۔

اما ۔ (آنسو پونچھتی ہوئی) میں بے قصور ہوں ۔ اگر معلوم بھی ہوا تو میرا کیا ہوگا ۔

الفرڈ ۔ (ٹالتے ہوئے) میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ تمہارے گھر آئے ہیں ۔ چلو خندہ پیشانی سے انہیں خوش آمدید کہو ۔ (ان سے ملنے چلا جاتا ہے) ۔

اما ۔ (بھی آنسو پونچھ کر الفرڈ کے پیچھے پیچھے چلی جاتی ہے)

پانچواں سین

(وہی کمرہ اسدارف ۔ کیتھرائن اور بعد میں الزبتھ داخل ہوتے ہیں)

اسدارف ۔ (مصافحہ کرتے ہوئے) بڑی خوشی ہوئی آپ لوگوں

کے آنے سے ۔ (الفرڈ انکے ہاتھ سے چھڑی اور ٹوپی خود لے لیتا ہے)

اِما ۔ (ماں سے لپٹ جاتی ہے اور ایک ہاتھ سے باپ کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے) آپ دونوں کے آنے سے بڑی خوشی ہوئی ۔

کیتھرائن ۔ (گلے لگا کر) کتنے دن سے تجھے نہیں دیکھا ۔ بڑی بے مروت ہے ۔ بھول کر بھی ماں باپ کو یاد نہیں کرتی ۔

اما ۔ میری اماں ۔

کیتھرائن ۔ بیٹی میں جانتی ہوں کہ شادی ہونے کے بعد لڑکی کو اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ وہ ماں باپ کو یاد کرے ۔

اسدارف ۔ (ہنس کر) یہ تو دنیا کا طریقہ ہے، مگر اما سے اس کی توقع نہیں ۔ کیوں اما ہمیں یاد کرتی ہو ؟

اما ۔ ہمیشہ ۔

الفرڈ ۔ (اما کو دیکھتا ہے جو آنکھ نہیں ملاتی) اچھا اب آپ لوگ تشریف رکھئے ۔

اسدارف ۔ ہاں بھائی میں تو بالکل تھکا ہوا ہوں ۔ بھوک بھی اس وقت خوب لگی ہے (میز کے دائیں جانب بیٹھ جاتا ہے ۔)

الفرڈ ۔ (بیوی کو بائیں طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے ۔ اور خود اسدارف کے پاس والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

اما ۔ (جان کر اس کرسی پر بیٹھ جاتی ہے جو اسدارف اور کیتھرائن کے درمیان پڑی ہے ۔)

الزبتھ (ایک قاب میز پر رکھ کر چلی جاتی ہے)

ہنری ۔ (اس سے اشاروں میں پوچھتا ہے ۔ کہتی ہے ، یا نہیں ؟)

الزبتھ ۔ (سر جھکا کر چلی جاتی ہے)

اسدارف ۔ (شراب کا گلاس بھرتے ہوئے) اچھا ہوا تم ان دونوں کے بیچ میں بیٹھیں ۔ ورنہ یہ دونوں میزبانی ہی کرنے میں سارا وقت گذار دیتے ۔ (بیوی سے) آؤ تم دونوں بھی پیو ۔ (شراب کی صراحی الفرڈ کے آگے بڑھا دیتا ہے)

الفرڈ ۔ (شراب انڈیلتا ہے لیکن جھجھک کر رک جاتا ہے)

اما ۔ (گلاس رکھ کر ۔ جو الفرڈ نے پیش کیا تھا ، ایک آنسو ٹپکا دیتی ہے)

اسدارف ۔ ایں ! یہ کیا معاملہ ہے ۔ الفرڈ تم اسقدر پریشان کیوں ہو ۔ تمہارے منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں ۔ اما بھی رو رہی ہے ۔ (ہنس کر) اچھا میں سمجھ گیا شاید آج دونوں میں کچھ اَن بن ہوئی ہے ۔

الفرڈ ۔ (ہنری کو ہاتھ سے چلے جانے کا اشارہ کرتا ہے ۔ ہنری باہر چلا جاتا ہے)

کیتھرائن ۔ تم کو کیا پڑی ہے وہ خود اپنے خانگی معاملات کو سمجھ لینگے ۔

الفرڈ ۔ کچھ بھی نہیں ۔ مذاق تھا ۔ اما شاید بُرا مان گئیں ۔

اما ۔ (پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے) اچھا اب بھی مجھ ہی پر الزام !

الفرڈ ۔ اپنے بزرگوں کے سامنے تو ہم لوگوں کو ایسی معمولی معمولی باتوں کا ذکر نہ کرنا چاہیئے ۔

کیتھرائن ۔ جانے بھی دو ۔ اما ایسی باتیں تو ہوا کرتی ہیں ۔

اما ۔ مگر جب غلطی میری نہ تھی تو مجھے کس بات کا ڈر! (ہچکیاں لیتی ہے)

کیتھرائن ۔ (اس کی طرفداری کرتے ہوئے) میری بچی ۔

اسدارف ۔ خاموش ۔ تم کو کوئی حق نہیں کہ دونوں کے معاملات میں دخل دو ۔ خود ہی لڑیں گے خود ہی ملیں گے ۔

الفرڈ ۔ (بےچین ہو کر) اما کے کہنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں نے ان کو کوئی تکلیف پہنچائی ۔ میں سارا قصہ بیان کر دیتا ہوں ۔ آپ لوگ خود تصفیہ فرمائیے ۔

اسدارف ۔ بیٹے تم بھی بچپنے کی باتیں کرتے ہو ۔ تمہارے خانگی واقعات سُن کر ہم کیا کریں گے ۔ خود ہی دونوں سمجھ لو ۔ (کھانے میں مشغول ہو جاتا ہے)

الفرڈ ۔ جی نہیں ۔ شاید آپ کو خیال ہو ——

اسدارف ۔ ناممکن ہے ۔

کیتھرائن ۔ اچھا تو اس میں حرج ہی کیا ہے ۔ سننے کی بات ہے ۔ جب تو وہ سنا رہے ہیں (محبت سے) کہو میاں کہو ۔

الفرڈ ۔ آج صبح میں نے ہنری کو الزبتھ سے یہ کہتے ہوئے سنا ـــــ شکر ہے کہ میز چُن دیا گیا ۔ ہنری نے الزبتھ سے بھی یہی کہنے کے لئے کہا ۔ الزبتھ نے انکار کیا ۔ ہنری نے اصرار کیا ۔ نتیجہ جنگ کی صورت میں ظاہر ہوا ۔ یہ واقعہ ہنستے ہوئے میں نے ان کے سامنے بیان کیا اور مذاقاً ان سے پوچھا کہ اگر میں تم سے کسی بات کے لئے کہوں تو تم فوراً مان جاؤگی ۔ اس کے بعد یہی الفاظ ان سے کہنے کو کہا ۔ انہوں نے انکار کیا ۔ میں نے اصرار ۔ یہ اتنی سی بات پر بُرا مان گئیں ۔

اما ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ انہوں نے مجھے "ضدن" تک کہہ ڈالا ۔ اب سارا

الزام مجھ ہی پر رکھ رہے ہیں۔ آپ ہی لوگ کہئے میں کبھی بھی ضدی تھی۔

اسدارف۔ (ہنسکر) خوب۔

کیتھرائن۔ (سنجیدگی سے) نہیں الفرڈ، اما ضدی تو کبھی نہ تھی ۔۔ خیر ہمیں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

اما۔ اور یہ مجھے اب بھی مجبور کر رہے ہیں۔

کیتھرائن۔ کیوں بیٹے؟

الفرڈ۔ (بےچین ہوکر) اچھا اب اس قصہ کو جانے بھی دیجئے۔

اسدارف۔ (مذاق سے) بس میں بھی یہی چاہتا ہوں کیونکہ اب لوگوں کی باتیں میرے کھانے میں حارج ہیں۔ اما تم بھی بڑی بیوقوف ہو۔ اور الفرڈ تمہارا کبھی بچپنا نہیں گیا۔ ایسی معمولی باتوں کا کوئی اثر لیتا ہے۔ تم دونوں کو ہم سے سبق لینا چاہئے۔ جس بات کو میں کہتا ہوں یہ (کیتھرائن کی طرف اشارہ کرکے) کبھی نہیں ٹالتیں۔ دیکھو اما۔ تمہاری ماں سے میں ابھی کہلائے دیتا ہوں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ذرا کہو تو ۔۔۔ شکر ہے کہ میز چن دیا گیا۔

کیتھرائن۔ (گھبرا کر) آئیں، یہ تم کو کیا ہوا؟

اسدارف۔ کیوں؟

کیتھرائن۔ یہ بھی کوئی کہلانے کی بات ہے۔

اسدارف۔ میری خوشی ہے۔

کیتھرائن۔ تو میں تو یہ نہ کہونگی۔

اسدارف۔ (حیرت سے) کیا تم واقعی نہ کہوگی۔

کیتھرائن۔ ہاں۔

اسدارف۔ کیا تم میرا کہا ٹال دوگی۔

کیتھرائن۔ (فیصلہ کن لہجہ میں) ہاں۔

الفرڈ۔ اچھا اب یہ ذکر چھوڑیئے۔

اسدارف۔ نہیں۔ نہیں میں ہرگز یہ نہیں دیکھ سکتا۔ (خوشامد سے) کیتھرائن کہدو ۔۔۔ شکر ہے کہ میز چن دیا گیا۔

کیتھرائن۔ یا اللہ! یہ تمہیں ہوا کیا ہے؟

اسدارف۔ خدا کے لئے کہدو۔

کیتھرائن۔ نہیں۔

اسدارف۔ (کسی قدر جھلا کر) میری عادت ہے کہ میں روزانہ ہر کام کے بعد یہی کہتا ہوں۔ تم بھی ایک بار کہدو ۔۔۔ شکر ہے کہ میز چن دیا گیا۔

کیتھرائن۔ میں تو نہ کہونگی۔

اما۔ پیاری اماں۔

اسدارف۔ کیتھرائن۔

کیتھرائن۔ نہیں۔

اسدارف۔ کیتھرائن۔

کیتھرائن۔ ہرگز نہیں۔

اسدارف۔ دیکھو کیتھرائن بات مذاق کی حد سے نکل گئی۔ تم اپنی بیٹی کے سامنے ضد کی نظیر قائم کرنا چاہتی ہو۔ گویا اسے بھی سبق دے رہی ہو۔

الفرڈ۔ (کھڑے ہوتے ہوئے) اچھا اب جانے دیجئے۔

کیتھرائن۔ معلوم ہوا۔ جب بات آپڑتی ہے تو یہ مرد یوں ہی غریب عورت کے خلاف متحد ہو جاتے ہیں۔

اسدارف۔ میں کسی کی طرفداری نہیں کرتا۔ میرے نزدیک تو جیسے اما ویسے الفرڈ۔ میں صرف تم سے ان الفاظ کو کہلانا چاہتا ہوں۔

کیتھرائن۔ بیوی سے ایسی لغویت کا طالب ہونا نہ جانے تمہیں کیسے گوارہ ہے۔

اسدارف۔ لغویت اور غیر لغویت کا تو سوال ہی نہیں، میں تو صرف تمہاری فرمانبرداری کا امتحان لے رہا ہوں۔

کیتھرائن۔ ایسی فرمانبرداری اپنے بس کی بات نہیں۔

اما۔ ہم بیویاں ہیں۔ لیکن غلام نہیں ہیں۔

کیتھرائن۔ (غصہ سے) ہاں ہم غلام نہیں ہیں۔ ہم اپنے حقوق کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔

اما۔ اندھی فرمانبرداری غلامی کی نشانی ہے۔

کیتھرائن۔ ہم تو فرمانبرداری اسی وقت تک جائز سمجھتے ہیں ۔۔۔

اما۔ ایسی لغو خواہش تم ہم سے پوری نہ ہوگی۔

کیتھرائن۔ ہرگز نہیں۔

(دونوں عورتیں آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے گفتگو کرتی ہیں۔)

اسدارف۔ (چپکے سے الفرڈ سے) ہم نے اُن کو چھیڑ کر پورے اس فرقہ سے لڑائی مول لے لی ہے۔

الفرڈ ۔ (چپکے سے) اب کیا کرنا چاہیئے ۔
اسدارف ۔ (چپکے سے) جیسا تم مناسب سمجھو ۔ میرا تو ناشتہ خاک میں مل گیا ۔ جب تک میں ناشتہ پیٹ بھر کر نہیں کر لیتا ہوں دوپہر کا کھانا نہیں کھایا جاتا ۔
الفرڈ ۔ (چپکے سے) ۔ لیکن ابھی ہمیں اتنی باگ ڈھیلی نہ چھوڑنی چاہیئے ۔
اسدارف ۔ (آہستہ سے) اس لڑائی سے فائدہ ۔ بھائی میں تو ہار مان لیتا ہوں ۔ پہلے مجھے ذرا غصہ آ گیا تھا ۔ مگر بات یہ ہے کہ خطا ہماری ہی ہے ۔ دبے بغیر کام نہیں بنتا ۔
اما ۔ (چپکے سے ماں سے) اماں اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اتنی بات بڑھا دوگی تو میں مذاق مذاق میں اسی وقت کہہ دیتی —— مگر اب تو بات ہاتھ سے نکل گئی ۔
کیھترائن ۔ (آہستہ سے) چلو ۔ ہٹو ۔ یوں ہی تو یہ لوگ شیر ہو جاتے ہیں ۔ کہیں ایسا کر بھی نہ بیٹھنا ۔
اما ۔ (آہستہ سے) تو کیا اماں تم واقعی میری پشت پر ہو ۔
کیھترائن ۔ (چپکے سے) یقین مانو ۔
اسدارف ۔ (آہستہ سے) عقلمند ہمیشہ ایسے موقعوں پر ہار مان لیتا ہے ۔
الفرڈ ۔ (آہستہ سے) ہاں یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن عزت ——
اسدارف ۔ (آہستہ سے) عزت کیسی ۔ یہاں بیوی کا معاملہ ہے ۔ مذاق مذاق میں بات اڑا دو ۔
الفرڈ ۔ (آہستہ سے) مذاق میں —— اچھا میں اسے ابھی ختم کئے دیتا ہوں ۔
(کمرہ کی داہنی طرف اٹھ کر جلدی جلدی جاتا ہے)
اسدارف ۔ (چپکے سے) سنو ۔ سنو ۔ تمہارا ساتھ دینے کے لئے میری ضرورت ہے ۔ ذرا مجھے ناشتہ تو کر لینے دو ۔ ورنہ لڑائی میں میں کام نہ دے سکونگا —— 'شکر ہے کہ میز چن دیا گیا' صرف شروع کرنے کی کسر ہے (کھانے لگتا ہے)
اما ۔ اماں ہم بھی کیوں —— ؟
کیھترائن ۔ ہاں ۔ ہاں ۔ اس جھگڑے میں ہم اپنا ناشتہ کیوں خراب کریں ۔ (بیٹھ جاتی ہے)
الفرڈ ۔ (دونوں ہاتھوں میں دو دوشالے لے کر آتا ہے) اما ۔ پیاری ۔
اما ۔ مجھے معاف کرو ۔ میں مانتا ہوں ، قصور میرا تھا ۔ اس کی تلافی کے لئے دیکھو تمہارے واسطے کیا لایا ہوں ۔ ان میں سے کوئی ایک پسند کر لو ۔ (دونوں ہاتھوں پر رکھ کر اس کے سامنے بڑھاتا ہے) کون اچھا ہے بتاؤ اما ۔ (شرما کر) میں نہیں جانتی ۔
الفرڈ ۔ پسند کرو ۔
اما ۔ تو کیا اسی وقت ۔ (ایک کو انگلی کے اشارے سے بتاتی ہے ۔ اور جلدی سے ہاتھ کھینچ لیتی ہے)
الفرڈ ۔ کون سا ۔ یہ سیدھی طرف والا ۔
اما ۔ (سر ہلا دیتی ہے)
الفرڈ ۔ (دوشالہ کھول کر اس کے سر پر ڈال دیتا ہے اور دوسرا میز پر رکھ دیتا ہے) دیکھو یہ تیسرا موقع ہے کہ میں نے تمہاری خوشامد کی ۔
اما ۔ (بیچین ہو کر فوراً کہہ دیتی ہے) 'شکر ہے (جھک کر کان میں) میز چن دیا گیا' (شرما کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیتی ہے ۔
ہنری ۔ (ایک قاب لیکر آتا ہے اور اسے میز کے ایک کونے پر رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے ۔)
اسدارف ۔ شاباش بیٹی ۔ شاباش ۔
الفرڈ ۔ صلح ہو گئی ۔
اما ۔ ہمیشہ کے لئے ۔
الفرڈ ۔ اب تو کوئی بات نہ ہوگی ۔
اما ۔ نہیں ۔
اسدارف ۔ شاباش ۔ اچھا اب ناشتہ کرو ۔
الزبتھ (میووں کی ٹوکری لے کر آتی ہے ۔ اور اسے میز کے ایک کونے پر رکھ دیتی ہے ۔ ہنری اور اما ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں)
کیھترائن ۔ (میز کے پاس جا کر دوسرے دوشالہ کو دیکھتی ہے اور اسدارف کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے) ۔ اسدارف ۔
اسدارف ۔ ہاں ۔
کیھترائن ۔ ادھر دیکھو ۔
اسدارف ۔ کیا ۔
کیھترائن ۔ ایک دوشالہ اور باقی ہے ۔
اسدارف ۔ ہاں تو پھر ۔

کیتھرائن - کیا ہم صلح نہ کریں -
اسدارف - دو شالہ کے ذریعہ سے ؟
کیتھرائن - کیوں -
اسدارف - نہیں اس سے کم تاوان پر صلح کرنی چاہئے - جوان آدمی بیوی کی خفگی دیکھ نہیں سکتا - میں تو اب بوڑھا ہو گیا ہوں - دیکھنا جب الفرڈ بھی اس عمر پہ پہنچے گا تو وہ بھی شاید اس تاوان پر صلح نہیں کریگا -
کیتھرائن - یا اللہ یہ حقارت آمیز الفاظ ——
اما - نہیں اماں -
الفرڈ - (ہنری کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہے) - کیوں ہنری تم نے الزبتھ سے کچھ تصفیہ کیا -
ہنری - سرکار - یہ اب تک اپنی ضد پر اڑی ہے -
الزبتھ - (گھبرا کر) لیکن سرکار ——
اما - (ہنستے ہوئے) کہدو الزبتھ -
الزبتھ - آپ جانتی ہیں ——
اما - ہم سب کچھ جانتے ہیں -
کیتھرائن - ہاں - ہاں - کہہ کیوں نہیں دیتی - تیری ضد نے آج کا مزا کرکرا کر دیا - کہدو اس میں رکھا ہی کیا ہے —— سوچتی کیا ہو ؟ - اب تم کو کہنا پڑیگا - (خود آہستہ سے) شکر ہے کہ میز چُن دیا گیا -
(سب ہنسنے لگتے ہیں)
کیتھرائن - (تعجب سے) کیوں ؟ کیوں ؟
اسدارف - (ہنستے ہوئے) کچھ بھی ہو، تم نے تو خوب کہہ دیا -
کیتھرائن - (جھینپ کر) اللہ کہہ دیا ہو گا کمبخت جھگڑا تو ٹوٹا -
الفرڈ - ہاں الزبتھ اب صرف تم رہ گئی ہو -
الزبتھ - میں تو ——
اما - کہدو الزبتھ - دیکھو تین ہفتہ کے بعد تمہاری شادی ہونیوالی ہے -
الزبتھ - (خوش ہو کر) شادی - شکر ہے -
تمام ملکر - شاباش !
الزبتھ - (جواب تک یہ نہ سمجھی تھی کہ آدھا جملہ اُس نے کہدیا ہے) شکر ہے -
تمام - ہاں - ہاں - شاباش -
الزبتھ - کیا ؟
ہنری - (خوشامد سے) جملہ پورا کر دو -
الزبتھ - (سمجھتی ہوئی) اچھا میں سمجھی -
(سب کی طرف دیکھتی ہے)
تمام - (مجبور کرتے ہوئے) کہدو - کہدو - اب رہ ہی کیا گیا ہے -
الزبتھ - (جلدی سے) میز چُن دیا گیا !
(منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کر بھاگ جاتی ہے)
ہنری - (اس کے پیچھے چلا جاتا ہے)
سب - شاباش - شاباش -

سید اصغر حسن (حیدرآباد دکن)

علم مجلسی :- جناب عزیز الرحمٰن صاحب میر منشی قلعہ معلیٰ دہلی نے "علم مجلسی" کے پانچ حصے مرتب فرما کر ادب اردو کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے - پہلے تین حصوں میں سیکڑوں مختلف موضوعات پر مختلف شعرا کے منتخب اشعار لکھے گئے ہیں - ہر حالت اور ہر کیفیت کا شعر ایک عنوان کے تحت میں مل سکتا ہے - چوتھے حصہ میں دلچسپ قطعات و رباعیات کا مجموعہ ہے - اور پانچویں حصے میں وہ تمام غزلیں ایک جگہ جمع کر دی گئی ہیں - جن میں سے اشعار چنے گئے ہیں - ہر حصہ پہلے حصہ سے زیادہ دلچسپ ہے - البتہ بعض عنوانوں کے تحت میں بعض اشعار کا اندراج غور طلب ہے، بعض کیفیتوں کے متعلق اساتذۂ سخن کے بعض مشہور اشعار نظر انداز کر دئے گئے ہیں - عنوانات کی اور زیادہ تقسیم ہو سکتی تھی - بعض غیر ضروری عنوان قائم کر دئے گئے ہیں - بہر حال یہ مجموعہ بہت دلچسپ ہے - اور مقرروں اور مضمون نگاروں کے لئے خاص طور سے بہت مفید ہے - ہر علم دوست اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے - قیمت - چار روپے بارہ آنے - ملنے کا پتہ :- علم مجلسی کتب خانہ کلاں محلہ - پوسٹ بکس ۸۶ - دہلی

تعلیم جدید

عربی کی ایک مثل ہے "کُلّ جدیدٌ لذیذٌ" ہر نئی چیز مزیدار معلوم ہوتی ہے۔ اس مختصر سے جملے میں ایک ایسا قانونِ فطرت بیان کیا گیا ہے جس کا دائرہ عمل نہایت وسیع ہے۔ یوں تو اس کا اطلاق کائنات ارضی کی تمام ذی روح اشیاء پر ہوتا ہے۔ لیکن نوعِ انسان پر اس کا اثر سب سے زیادہ ہے۔ مہد سے لحد تک ہر شخص نت نئی چیز کا متلاشی رہتا ہے۔ بچہ ہے تو نئے کھلونوں اور نئے کپڑوں کی خواہش ہے۔ بڑا ہے تو دولت کمانے اور لطفِ زندگی اٹھانے کے نئے طریقوں کی تلاش ہے۔ اسی طرح ہر انسان نئی باتوں کا دلدادہ دکھائی دیتا ہے۔ شاعر کو نئے خیال اور نئی ترکیبوں۔ ادیب کو نئے مضمون اور نئے طرز بیان۔ مصور کو نئے مناظر اور نئے احساسات۔ عالم کو نئی کتب اور نئے مسائل۔ سائنس دان کو نئے تجربے اور نئے نظریئے۔ کیمیا دان کو نئے مرکبات اور نئے عملیات۔ ڈاکٹر کو نئے طریقِ علاج اور نئی ادویہ۔ تاجر کو نئے گاہک۔ خریدار کو نئے مال۔ سوداگر کو نئی منڈیوں۔ ہیئت دان کو نئے ستاروں۔ ماہر ریاضی کو نئے فارمولوں۔ سیاح کو نئے ملکوں۔ بادشاہ کو نو آبادیوں۔ رعایا کو نئے حقوق۔ غرض ہر شخص کسی نہ کسی نئے شے کی تلاش میں رہتا ہے۔ تمام دنیا لذتِ "جدید" سے آشنا نظر آتی ہے یہی ایک مزا ہے جس سے طبیعت کبھی سیر نہیں ہوتی۔

اگر غور سے دیکھیں تو انسانی ترقی کا راز بھی اسی جدت پسندی میں مضمر ہے۔ مشاہدہ و تجربہ۔ تعلیم و تفکر۔ ایجاد و اختراع۔ تفتیش و تجسس۔ تحقیق و تدقیق۔ تصنیف و تالیف۔ سفر و سیاحت۔ جہاں گردی و بادیہ پیمائی۔ جستجوئے حق و عرفانِ الٰہی۔ غرض ترقی و تہذیب کے تمام ذرائع انہی مقتضیاتِ فطرت کے کرشمے ہیں۔ اس کا اثر یہیں تک محدود نہیں بلکہ وہ افعال قبیحہ بھی جو کہ بہیمیت کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ بسا اوقات اسی جدت طرازی کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔

تاریخ پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جوں جوں انسان تہذیب کے زینے پر چڑھتا جاتا ہے۔ اس کی معلومات اور ضروریات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کی طرز زندگی پہلے کی طرح سادہ نہیں رہتی۔ بلکہ مقابلتاً پیچیدہ اور مشکل ہوتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے کے لوگ اپنی زندگی کو زمانہ ماضی کی نسبت مختلف کہتے آئے ہیں۔ یہ اختلاف تھوڑا ہو یا بہت، اس عصر کے لوگوں کی نظر میں نمایاں ضرور ہوتا ہے۔ انہیں اپنے عہد کی تمام خصوصیات نئی دکھائی دیتی ہیں اور ان کے لئے وہ حقیقتاً نئی ہی ہوتی ہیں۔ چونکہ تعلیم کا اصلی مقصد و مدعا یہی ہے کہ آئندہ نسل کو کشمکش حیات کے لئے تیار کیا جائے۔ اس لئے ہر ملک اور ہر زمانہ میں معلموں کی ایک خاص تعداد اس امر کی کوشاں رہی ہے کہ جوں جوں قومی تمدن اور معاشرت بدلتے جائیں طریق تعلیم میں بھی حسب ضرورت تبدیلیاں کی جائیں۔ مگر بہت سے معلم، تعلیم و تربیت کے وہی طریق اور ذرائع استعمال کرتے رہتے ہیں جو ان کے زمانۂ طالب علمی میں ان کے استادوں نے انہیں پڑھاتے اور سکھاتے وقت برتتے تھے۔ اس لئے ہمیشہ سے معلمین کے دو فرقے اور بیک وقت تعلیم کے دو طریقے پائے جاتے ...... ہیں۔ اکثر استاد لکیر کے فقیر اور مروجہ تعلیم کے حامی ہوتے ہیں۔ البتہ چند معلم نئے نظام تعلیم۔ مضامین تدریس۔ طریق تربیت وغیرہ سوچتے اور تعلیمی تجربے کرتے رہتے ہیں۔ اس فریقِ ثانی کے طریقوں کو "تعلیم جدید" بجائے خود کوئی نئی تحریک نہیں البتہ وہ ذرائع اور وسائل جنہیں کسی زمانہ میں "نئی تعلیم" کے نام سے پکارا جاتا رہا ہے۔ اس عہد کے لوگوں کے خیال میں جدت کا عنصر رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کسی اور ملک نے یا کسی اور قوم نے اس سے کہیں پہلے انہی طریقوں کو استعمال کیا ہو اور چند روز کے بعد غیر مفید سمجھ کر ترک بھی کر دیا ہو۔ یا ایک طویل مدت تک کام میں لاکر ماحول کے تبدیل ہو جانے کی وجہ سے چھوڑ دیا ہو۔ یا حوادثِ زمانہ کے باعث ان کے آثار مٹ گئے ہوں۔ لیکن بہر حال اس

اس زمانے اور اس قوم اور اس مقام اور اس ماحول کے لحاظ سے تو وہ "نئے" کہلانے کے ہر طرح سے مستحق ہیں۔ یہی بات عصرِ حاضر کی "تعلیم جدید" پر صادق آتی ہے۔

گذشتہ تیس سال میں ٹیلیگراف (Telegraph) ٹیلیفون (Telephone) ریڈیو (Radio) اور ٹیلیویژن (Television) کی ترقی۔ ٹائپ رائٹر (Typewriter) گراموفون (Gramophone) سینما (Cinema) اور ٹاکی (Talkie) کی ترویج، تعلیم عامہ، اخبارات و رسائل، مکاتب و مدارس کی توسیع۔ ریل، موٹر۔ طیارہ ہوائی جہاز وغیرہ وسایل نقل و حرکت کی کثرت، علم کیمیا اور طب طبعیات و نفسیات کے حیرت انگیز انکشافات اور عالمگیر جنگ کے اثرات وغیرہ نے اسباب معیشت اور طرز تمدن میں اسقدر تبدیلی پیدا کر دی ہے کہ احاطۂ بیان میں نہیں آسکتی۔ زندگی کے ہر شعبہ میں نہایت تیزی سے تغیر ہو رہا ہے۔ اہلِ مشرق کی قدامت پسندی گھٹ رہی ہے۔ ان اسباب کی بناپر، اقتصادی، معاشرتی، مجلسی، تاریخی، سیاسی، حتیٰ کہ جغرانی حدود بھی نہ صرف بدل رہے ہیں بلکہ مٹ رہے ہیں۔

اخبارات کی کثرت۔ سیر و سیاحت کی سہولتوں اور بین الاقوامی مجلسوں کی کوششوں کے باعث جداگانہ تمدن و معاشرت فنا ہو رہے ہیں۔ اور مغربیت کا رنگ تمام عالم پر چھا رہا ہے۔ یہ تبدیلیاں اگر اساسی نہیں جب بھی ان کا اثر بہت دور تک پہنچ چکا ہے۔ ان کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہماری آنے والی نسل کی تعلیمی ضروریات پہلے کی نسبت بہت مختلف ہوگئی ہیں۔ وہ معلومات اور ہنر جنہیں جاننا اور سیکھنا بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں بچوں کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا آجکل بالکل ناکافی ثابت ہو رہے ہیں۔ روز بروز "مروجہ تعلیم" اور بچوں کی تعلیمی ضروریات میں بُعد بڑھ رہا ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی بے روزگاری اس امر کی بین دلیل ہے۔ مولانا حالیؔ نے گذشتہ صدی کے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق کہا تھا۔ ؎

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر
یہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

ہندوستان کے موجودہ حالات میں آجکل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کی یہی حالت ہے۔ قومی جلسوں۔ تقریروں۔ اور اخباروں میں اسی کا رونا رویا جاتا ہے۔

جیسا پہلے عرض کر چکا ہوں یہ حالت اسی ملک یا اسی زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں۔ یہی ہوتا آیا ہے کہ ہر جگہ مروجہ تعلیم کچھ عرصے کے بعد نوع انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے لئے ناکافی ثابت ہونے لگتی ہے۔ فرق ہے تو صرف اسقدر کہ ملک کی حالت آجکل ایسی سرعت سے بدل رہی ہے کہ جو بات ازمنہ سالقہ میں صدیوں میں ظاہر ہوتی تھی۔ فی زمانا برسوں میں ظاہر ہو جاتی ہے۔

یہ صورت صرف ہمارے ملک تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام عالم کی یہی حالت ہے۔ چنانچہ بیسویں صدی کے ابتدا سے اب تک دیگر ممالک کے نظام تعلیم اور طرز تدریس میں مختلف دفعات میں ترمیم ہو چکی ہے۔ اور ہو رہی ہے اور اب تو متمدن ممالک میں تعلیم کی بابت نقطۂ نظر ہی بالکل بدل گیا ہے۔ ہماری قدامت پسندی کی بدولت اس ملک کی تعلیم پر تا حال بہت کم اثر ہوا ہے تاہم تعلیمی معاملات کے ساتھ دلچسپی رکھنے والے حضرات کو مروجہ تعلیم کی تشنگی اور اس میں مناسب اصلاح کی ضرورت کا احساس ہو چلا ہے۔ ان حالات میں ایسے ملکوں کی تعلیمی اصلاحات کا مطالعہ ہمارے لئے ازبس مفید ہو سکتا ہے۔ جو شاہراہ ترقی پر ہم سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ اگرچہ ہر ملک اور ہر قوم بلکہ بچے بچے کی تعلیمی ضروریات مختلف ہوتی ہیں۔ لیکن یہ اختلافات فروعی ہیں۔ اس لئے ترقی یافتہ ملکوں میں جو تجربات اور تحقیقات "تعلیم جدید" کے حامی کر رہے ہیں وہ ہمارے لئے بھی کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ کورانہ تقلید سے اجتناب کیا جائے اور اپنے ملک کے حالات اور ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر کامل غور و خوض کے بعد حسبِ حال تجربے عمل میں لائے جائیں۔

قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی نئی تجویز پیش کی جاتی ہے تو بعض لوگ محض اس لئے کہ یہ نئی ہے اسے فی الفور اختیار کر لیتے ہیں اور جب تک کوئی اور نئی چیز بروئے کار نہیں آتی نہایت جوش سے اس پر عمل کرتے ہیں۔ پھر اسے چھوڑ کر کسی اور نئی چیز کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ ان کی جدت پسندی اس درجہ بڑھی ہوتی ہے کہ وہ اس کے حسن و قبح پر بالکل نظر نہیں ڈالتے۔ اپنے ماحول کو قطعاً خیال میں نہیں لاتے۔ اور نئی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے جوش میں مقامی حالات اور ضروریات کو کاملاً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس اندھا دھند کارروائی کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ انہیں پوری کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور آخر کار وہ اکتا کر کسی اور نئی تجویز کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض اپنی ہٹ کے ایسے پکے ہوتے ہیں۔

کہ انہیں اس میں کوئی نقص نظر نہیں آتا - ایسی غلط جدت پسندی یا بیجا ضد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تجویز خواہ مخواہ بدنام ہو کر بے کار اور غیر مفید قرار دیجاتی ہے -

اس کے برعکس ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جن پر دماغی جمود طاری ہوتا ہے - جونہی تجویز کا نام سنتے ہی مخالفت پر آمادہ ہو جاتے ہیں - اور فوراً کہہ دیتے ہیں کہ ملکی حالات کے موافق نہیں اور یہاں اس کی کامیابی کی کوئی امید نہیں - اگر کبھی طوعاً و کرہاً اس پر عمل کرتے ہیں تو نیت یہی ہوتی ہے - کہ اسے ناکام ثابت کیا جائے - وہ اس پر صحیح معنوں میں غور کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے -

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو اس تجویز کے ہر پہلو پر نظر ڈالتے ہیں - ان کا مقصد نہ یہ ہوتا ہے کہ اندھا دھند تقلید کی جائے اور نہ یہ کہ بے وجہ تردید کی جائے بلکہ وہ اسے عقل کے ترازو میں تول لیتے ہیں - اس کے حسن و قبح پر غور کرتے ہیں - جس ماحول میں اس تجویز نے جنم لیا تھا، نشوونما پائی اور کامیاب ہوئی تھی ان کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنے ملک کے حالات سے مقابلہ کر کے تطبیق دیتے ہیں - جو بات کام کی پاتے ہیں وہ اختیار کر لیتے ہیں اور باقی چھوڑ دیتے - پہلے چھوٹے پیمانے پر تجربہ کرتے ہیں - اس تجویز کی کامیابی یا ناکامی کو ذاتی سوال نہیں بناتے - طبقۂ اوّل کی ناکامیوں اور فرقۂ دوم کی مخالفت سے ہمت نہیں ہارتے اور وقتاً فوقتاً اس میں مناسب تغیر و تبدل کرتے جاتے ہیں - اور آخر کار اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں یعنی تہذیب و تمدن کے ذرائع میں کچھ نہ کچھ اضافہ کر دیتے ہیں - پھر قدامت پسند حضرات بھی چار و ناچار ان کے نقش قدم پر چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں - اصلی ترقی اور حقیقی اصلاح کا ہمیشہ یہی طریقہ رہا ہے اور یہی رہیگا - اور تعلیمی اصلاح و ترقی کی شاہراہ بھی یہی ہے -

ان ہوشمند حضرات کیلئے دوسرے ملکوں کی تعلیمی ترقیوں کا مطالعہ فلاح رہنمائی کا کام دیسکتا ہے - اسلئے ہمارا ارادہ ہے کہ آئندہ اشاعتوں میں "تعلیم جدید" کے عنوان سے ترقی یافتہ ملکوں میں تعلیم کے نئے طریقۂ نظر - ان کے نظامِ تعلیم - طرزِ تدریس - طریقۂ امتحان - تعمیرِ مکاتب - توسیع علوم - تربیتِ اطفال - اصلاحِ نقائص - تحقیقاتِ تعلیمی - معلّموں کی تیاری، معائنہ اور نگرانی وغیرہ کے متعلق ایک سلسلۂ مضامین پیش کریں -

(پروفیسر) جمال الدین احمد

(ملتان کالج)

آہ! موتی لال

یہ تو ممکن نہ رہا - تجھ سے کریں آج کلام — رُوح کو بھیجتے ہیں تری محبت کا سلام
کل تو "جوہر" کیلئے نوحہ کناں تھے احباب — آج "موتی" کے لیئے اشک فشاں چشمِ انام
قوم کے پیکرِ بے جاں کا سہارا تھا تو — قومیت کا تری تدبیر سے قائم تھا نظام
آخری عمر میں دُکھ تو نے اُٹھائے کتنے — تج دیا ملک کی الفت میں سب اپنا آرام
وہ نفاست کہ دُھلا کرتا تھا پیرس میں لباس — وہ نزاکت کہ رہا کرتا تھا پھولوں میں قیام
وہ فراست کہ جہاں بانوں کو سکھلائے سبق — وہ وکالت کہ بڑھا دہر میں قانون کا نام
وہ حمیت کہ زر و مال تو کیا جان بھی دی — اپنی اولاد کو بھی کر دیا وقفِ آلام

کافرِ عشق ہے وہ - آج بھی جو کہتا ہے
"نازکاں را سفرِ عشق حرام ست و حرام"

وقار (انبالوی)

اردو رسائل

زبان کی کس طرح خدمت کر سکتے ہیں؟

اردو زبان کی بڑی دقتوں میں سے ایک یہ دقت ہے کہ اس کی لغت کتابی صورت میں پوری طرح مُدون نہیں ہے۔ اور نہ اس کے قواعد پورے طور پر محصور ہیں اور نہ مختلف علمی مضامین کے ادا کرنے کے لئے اصطلاحیں مقرر ہیں۔ مولوی فتح محمدؐ صاحب جالندھری نے قواعد کے بارے میں اچھی خدمت کی ہے اور مولانا شبلیؔ اور مولوی عبدالحق صاحب نے ان کے کام کو چلا دینے میں حصّہ لیا ہے۔ لغت کا کام مولوی نذیر احمد دہلوی نے کیا ہے اور اصطلاحات کے لئے ہم عثمانیہ یونیورسٹی کے ممنون ہیں۔ انجمن ترقی اردو انہی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بہت کچھ کر رہی ہے، لیکن کام اسقدر ہے کہ کسی ایک شخص ایک انجمن یا ایک ادارہ سے یہ ہونا ناممکن ہے۔

اردو کے بہی خواہوں نے میرے نزدیک بعض مشکلات کو جو اردو زبان سے مخصوص ہیں نظر انداز کر دیا ہے مثلاً۔

(۱) وہ سب زبانوں میں عمر میں چھوٹی ہے۔

(۲) حقیقی شاہی گود میں پلنے کا اسے کبھی موقع نہیں ملا جو زبان کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔

(۳) اصل میں تو تین لیکن کم سے کم دو مائیں اس کی ضرور ہیں اور مصیبت یہ ہے کہ دونوں سگی ہیں ہر ایک اپنی تربیت کا رنگ اس پر چڑھانا چاہتی ہے اور جب انکا آپس میں اتحاد نہیں ہو سکتا تو دونوں اپنا غصہ اس معصوم پر نکالتی ہیں۔ میں نے تو جہانتک غور کیا ہے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس وقت جھگڑا یہ نہیں کہ اہل سنسکرت اردو کو اپنا بنانے کو تیار نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ اسے صرف اپنا ہی بنائے رکھنے پر مصر ہیں اور عربی فارسی والوں کے سایہ سے اس نونہال کو دور رکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہی حال ان کا بھی ہے۔

(۴) ہمارا علمی طبقہ غیر زبانوں میں سوچنے کا عادی ہو گیا ہے اور اس وجہ سے اس کی تحقیق و تفتیش سے اردو نفع نہیں اٹھا سکتی۔

(۵) ٹائپ نہ ہونے کے سبب آنکھوں کو اس کے حروف سے وہ موانست نہیں پیدا ہوتی جو ٹائپ پر چھپنے والی زبانوں کے حروف سے ہو جاتی ہے اور اس وجہ سے لوگوں میں شوقِ تعلیم سرعت سے ترقی نہیں کر سکتا۔ اور کتابوں کی اشاعت وسیع پیمانے پر نہیں ہو سکتی۔ انسان بارہ تیرہ قسم کے ٹائپوں کا عادی تو ہو سکتا ہے لیکن ہزاروں قسم کا نہیں اور اردو زبان کے جتنے کاتب ہیں گویا اتنے ہی ٹائپ ہیں۔ جس کی وجہ سے طبیعتوں پر ایک غیر محسوس بوجھ پڑتا ہے اور تعلیم کا ذوق کم ہو جاتا ہے۔

اِن مشکلات کی وجہ سے اردو کی ترقی کے رستہ میں دوسری زبانوں کی نسبت زیادہ مشکلات حائل ہیں۔ مگر میرے نزدیک وہ ایسی نہیں کہ دور نہ کی جا سکیں، ابتک نقص یہی رہا ہے کہ مرض کی تشخیص نہیں کی گئی۔ اور اسکی وجہ سے لازماً علاج بھی صحیح نہیں ہوا۔ اگر اردو عمر میں اپنی بہنوں سے چھوٹی تھی تو اس کے لئے اسی قسم کی غذا کا بھی انتظام ہونا چاہئے تھا۔ اور اگر وہ شاہی گود سے محروم تھی تو کیوں نہ اسے جمہوریت کی گود میں ڈالدیا گیا، جس کی حفاظت شاہی حفاظت سے کسی صورت میں کم نہیں بلکہ اصل بادشاہت تو اسی کی ہے۔ اگر اس کی تربیت کے متعلق اختلاف تھا تو بجائے یہ صورت حالات پیدا کرنے کے کہ جس کا بس چلا وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔ وہی کیوں نہ کیا گیا جو حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کیا تھا، جب خانہ کعبہ کی تعمیر جدید کے موقع پر حجر اسود کو اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھنے کے سوال پر مختلف قریش خاندانوں میں جھگڑا پیدا ہو گیا تھا اور اُنھوں نے ایک چادر بچھا دی۔ اور اس پر حجر اسود اپنے ہاتھ سے رکھکر سب قوموں کے سرداروں سے کہا کہ وہ اس چادر کے کونے پکڑلیں اور اس طرح سب کے سب اس کے اٹھانے میں برابر کے شریک ہو جائیں۔ اسی طرح اگر اردو سنسکرت اور عربی کی مشترک تربیت میں دیدی جاتی تو یہ جھگڑا ختم ہو سکتا تھا۔ ٹائپ کا سوال مختلف قسم کا سوال ہے۔ لیکن اگر مذکورہ بالا باتوں کی طرف توجہ ہوتی تو

بہت سے لوگ اسے حل کرنے کی طرف بھی مائل ہوجاتے اور الحمدللہ کہ اس وقت حیدرآباد میں بہت سے ارباب بصیرت اس کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔

میری اِن معروضات کا مطلب یہ ہے کہ اردو کی ترقی کے لئے ایسے ذرائع اختیار کرنے..... چاہئیں کہ بجائے ایک محدود جماعت کی دلچسپی کا مرکز بننے کے جمہور کو اس سے دلچسپی پیدا ہو۔ خالص علمی رسائل صرف منتخب اشخاص کی توجہ منعطف کرا سکتے ہیں۔ اور زبانیں چند آدمیوں سے نہیں بنتیں، خواہ وہ بہت اونچے پایہ کے کیوں نہ ہوں۔ قاعدہ یہ ہے کہ زبان عوام الناس بناتے ہیں۔ اور اصطلاحیں علماء۔ اردو بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتی۔ پس اگر ہم اردو کی ترقی کے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو اس کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ ہمارے ادبی رسالوں میں اس کے علمی پہلوؤں پر بحثیں ہوں تاکہ صرف پیش آنے والی مشکلات کے علاج ہی کا سامان نہ ہو بلکہ عوام الناس بھی ان تحقیقات سے واقف ہوتے جائیں۔ اس وقت خدا تعالےٰ کے فضل سے کئی اردو رسائل کامیابی سے چل رہے ہیں۔ اگر ان رسائل میں چند صفحات مستقل طور پر اس بات کے لئے وقف ہوجائیں کہ ان میں اردو زبان کی لغت یا قواعد یا اصطلاحوں وغیرہ پر بحثیں ہوا کریں گی تو یقیناً تھوڑے عرصہ میں وہ کام ہوسکتا ہے۔ جو بڑی بڑی انجمنیں نہیں کرسکتیں۔ اور بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جو نئی نئی اختراعیں ہونگی یا الفاظ کے استعمال یا قواعد زبان کے متعلق جو پہلو زیادہ وزنی معلوم ہوگا عام لوگ بھی اسی کو قبول کرینگے۔ کیونکہ دلچسپ اردو رسائل میں چھپنے کی وجہ سے وہ سب مضامین ان کی نظروں سے بھی گزرتے رہیں گے۔ ہاں یہ مدنظر رہے کہ مضمون ایسے رنگ میں ہو کہ سب لوگ اسے سمجھ سکیں۔ اس قسم کے مضامین کی اشاعت کا یہ فائدہ بھی ہوگا کہ ہمارے ہندو بھائی بھی ان بحثوں میں حصہ لے سکیں گے اور اس میں کیا شک ہے کہ بغیر ان کی مدد کے ہم یہ کام نہیں کرسکتے کیونکہ اردو میں بہت سے لفظ سنسکرت اور ہندی بھاشا کے ہیں۔ اور ان کی اصلاح یا ان میں ترقی بغیر ہندوؤں کی مدد کے نہیں ہوسکتی۔ ان کی شمولیت کے بغیر یا تو وہ حصہ زبان کا نامکمل رہ جائیگا یا اسے بالکل ترک کر کے اس کی جگہ عربی الفاظ اور اصطلاحیں داخل کرنی پڑینگی۔ اور یہ دونوں باتیں سخت مضر اور اردو کی ترقی کے رستہ میں روک پیدا کرنیوالی ہونگی۔

اس تمہید کے بعد میں اڈیٹر صاحب 'ادبی دنیا' اور دوسرے ادبی رسائل سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ ان باتوں میں مجھ سے متفق ہوں تو اپنے رسائل میں ایک مستقل باب اس غرض کے لئے کھولدیں۔ لیکن انہیں اِن مشکلات کا بھی اندازہ کرلینا چاہئیے۔ جو اس کام میں پیش آئیں گی۔ مثلاً یہ کہ جو سوالات اٹھائے جائیں گے انہیں حل کون کریگا؟ بالکل ممکن ہے کہ جواب دینے والے ایسے لوگ ہوں جن کا کلام سند نہ ہو یا جن کے جواب تسلی بخش نہ ہوں۔ یا کوئی شخص جواب کی طرف توجہ ہی نہ کرے اگر صرف رسالہ کے ادارہ نے جواب دیئے تو پھر اول تو اصل مطلب فوت ہوجائیگا، دوم ممکن ہے کہ اس سے وہ اثر پیدا نہ ہو سکے جو اصل مقصود ہے۔ لہٰذا اس مشکل اور اس قسم کی دوسری مشکلات کے حل کے لئے میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ جو رسالہ اس تحریک پر عمل کرنا چاہے اس میں ایک ادبی کلب قائم کردی جائے ادارہ کی طرف سے متعدد بار تحریک کر کے رسالہ کے خریداروں کے نام جمع کئے جائیں جو اس قسم کی علمی بحثوں میں حصہ لینے کے لئے آمادگی ظاہر کریں۔ جو خریدار مستند ادیب ہیں ان سے اصرار کر کے اپنا نام پیش کرنے کے لئے کہا جائے۔ ایسے تمام خریداروں کے نام ایک رجسٹر میں جمع کرلئے جائیں اور انہیں ادبی کلب کا ممبر سمجھا جائے۔ چونکہ بالکل ممکن ہے کہ بہت سے ادیب اور علما جن کی امداد کی ضرورت سمجھی جائے رسالہ کے خریدار نہ ہوں۔ اس لئے ایسے لوگوں کی ایک فہرست تیار کی جائے اور رسالہ کے مستطیع خریداروں کی امداد سے ان کے نام رسالہ مفت ارسال کیا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ان کا نام اعزازی ممبر کے طور پر کلب کے رجسٹر میں درج کرلیا جائے۔

تمام ممبروں سے امید کی جائے کہ جب کبھی کوئی سوال (۱) اردو لغت کے متعلق، (۲) نحوی قواعد کے متعلق۔ (۳) بعض علمی خیالات کے ادا کرنے میں زبان کی دقتوں کے متعلق (۴) محاورات کے متعلق (۵) تذکیر و تانیث اور جمع کے قواعد کے متعلق۔ (۶) بظاہر مترادف نظر آنیوالے الفاظ کے متعلق (۷) پرانی اصطلاحات کی تشریح یا نئی اصطلاحات کی ضرورت کے متعلق پیدا ہو تو بجائے خود حل کرکے خود ہی اس سے لطف حاصل کرنے کے وہ اس سوال کو رسالہ کے ادبی کلب کے حصہ میں شائع کرائیں خواہ اپنا حل بھی ساتھ ہی لکھدیں یا خالی سوال ہی لکھ دیں۔

ان سے یہ بھی امید کی جائے کہ جب کوئی ایسا سوال شائع

ہو تو وہ اس کا جواب دینے کی کوشش کیا کریں۔

ملک کو اردو علم ادب کے لحاظ سے چند حلقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ مثلاً (۱) دہلی اور اس کے مضافات۔ (۲) لکھنؤ اور اس کے مضافات۔ (۳) پنجاب (۴) رامپور اور اس کے مضافات۔ (۵) بھوپال اور اس کے مضافات۔ (۶) آگرہ اور اس کے مضافات۔ (۷) اعظمگڈھ اور الہ آباد اور اس کے مضافات۔ (۸) بہار (۱۰) حیدرآباد

اسی طرح علمی لحاظ سے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

(۱) اسلامی یعنے عربی اور فارسی اثر۔

(۲) ہندو یعنے سنسکرت اور ہندی بھاشا اثر۔

جب سوالات رسالہ کے دفتر میں آئیں تو ادارہ انہیں مختلف حصوں میں تقسیم کر دے۔ مثلاً جو سوال کسی لفظ کے استعمال اس کی شکل اس کی تذکیر و تانیث کے متعلق ہوں انہیں ایکجگہ جمع کر کے شائع کرے۔ اور ان کے متعلق مذکورہ بالا حلقوں کے احباب سے درخواست کرے کہ وہ نہ صرف اپنی علمی تحقیق بتائیں بلکہ یہ بھی بتائیں کہ ان کے علاقہ میں وہ لفظ اردو میں استعمال ہوتا ہے یا نہیں، اگر ہوتا ہے تو کس شکل میں اور کن کن معنوں میں۔ اس طرح دو فائدے حاصل ہوں گے ایک تو اس امر کا اندازہ ہو جائیگا کہ اس خاص لفظ یا محاورہ کے متعلق اردو بولنے والوں کی اکثریت کس طرف جا رہی ہے اور اس سے اردو کی ترقی کی رو کا اندازہ ہو سکیگا۔ دوسرے علمی تحقیق بھی ہو جائیگی اور پڑھنے والوں کی طبائع فیصلہ کر سکینگی کہ اس بارہ میں اردو کے حق میں کونسی بات مفید ہے آیا تحقیق کی پیروی کرنی چاہئیے، یا غلط العام کی تصدیق کہ یہ دونوں باتیں اپنے اپنے موقع پر زبان کی ترقی کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اسی طرح جس لفظ کے متعلق بحث ہو اگر سنسکرت یا ہندی بھاشا اس کا ماخذ ہو، تو اس کے علماء کو اور اگر عربی فارسی ماخذ ہو تو اس کے علماء کو اس پر روشنی ڈالنے کی طرف توجہ دلائی جائے۔ اسی طرح اور بہت سی تقسیمیں کی جا سکتی ہیں جو اس کلب کو زیادہ دلچسپ بنانے کا باعث ہو سکتی ہیں۔ کلب کا کام فیصلہ کرنا نہ ہو بلکہ صرف ہر پہلو کو روشنی میں لانا ہو۔

اسی طرح جدید اصطلاحات کی ضرورتوں کو کلب کے صفحات میں شائع کیا جائے اور بحث کی طرح اس طریق پر نہ ڈالی جائے۔ کہ خالص عربی یا خالص سنسکرت اصطلاحات لے لئے جائیں۔ بلکہ تحریک یہ کی جائے۔ کہ وہ خیال جس کے ادا کرنے کی ضرورت پیدا ہوئی ہے۔ اس کے متعلق کلب کے ممبر پہلے یہ بحث کریں کہ اس خیال کا کس اردو لفظ سے تعلق ہے، پھر یہ دیکھا جائے کہ وہ لفظ کس زبان کا ہے اور آیا اسی لفظ سے جدید اصطلاح کا بنانا آسان نہ ہوگا۔ اگر عام رائے اس کی تائید میں ہو تو پھر اس زبان کے ماہروں سے درخواست کی جائے کہ وہ اس کے متعلق اپنا خیال ظاہر کریں، کیونکہ جس زبان کا لفظ ہو اسی کے ماہر اس کے صحیح مشتقات پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ اردو رسائل کے ادارے تو پہلے ہی بوجھوں تلے دبے پڑے ہیں۔ وہ اتنی پیچیدہ سکیم پر کس طرح ...... عمل کر سکتے ہیں لیکن اول تو یہ سکیم عمل میں اسقدر پیچیدہ اور توجہ طلب نہ ہوگی جسقدر کاغذ پر نظر آتی ہے، دوم اس قسم کے کلب جیسا کہ یورپ کا تجربہ ہے ہمیشہ رسائل واخبارات کی دلچسپی اور خریداری بڑھانے کا موجب ہوتے ہیں۔ اس لئے جو رسالہ اس کام کو شروع کریگا وہ میرے نزدیک مالی پہلو سے فائدہ میں رہیگا۔ تیسرے یہ بھی ضروری نہیں کہ فوراً اس ساری سکیم پر عمل کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ کلب جاری کر کے صفحات مقرر کئے بغیر اور اس طرح مضامین تقسیم کئے بغیر جس طرح میں نے بیان کیا ہے کام شروع کر دیا جائے۔ پھر جوں جوں ادارہ اور کلب کے ممبروں کو مشق ہوتی جائے کام کو اصول کے ماتحت لایا جائے۔ تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے اور بس۔

ادبی دنیا کے لئے اور اگر کوئی اور رسالہ اس تحریک پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو تو .... میں وعدہ کرتا ہوں کہ ضرورت ہو تو میں اس بحث کو واضح کرنے کے لئے اور اس تحریک سے لوگوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے بشرط فرصت اور مضامین بھی لکھ سکتا ہوں۔

مرزا محمود احمد (قادیان)

(مولوی احمد عبداللہ صاحب ارشد نے مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ادبی دنیا واقع کشمیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا)

رجسٹرڈ ..... ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد ۴ بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۱ء نمبر ۴

تصاویر:- (سہ رنگی) (۱) نغمہ نواز۔ (یک رنگی) (۲) حسن اور معصومیت۔ (۳) پامال انجام۔ (۴) سید بادشاہ حسین (۵) مولینا وقار۔ (۶) یورپ میں موٹے آدمیوں کی دوڑ۔ (۷) موسیقی کے فرشتے۔

حال و قال

اُدبی دنیا' کا یہ چوبیسواں نمبر ہے - اِس نمبر سے اِس رسالے کی زندگی کے دو سال ختم ہو جاتے ہیں -

اِن دو سال میں ادبی دنیا پر ۴۵ ہزار روپیہ صرف ہو چکا ہے - اِس رقمِ خطیر کے علاوہ میرے گھر کی خوش حالی، زندگی کا اطمینان اور بچّوں کا مستقبل - یہ بھی ایسی رقمیں ہیں جنہیں ادبی دنیا کے گراں وزن مصارف یا گراں بار نقصانات میں شمار کیا جا سکتا ہے -

اُن مصارف اور اِن اخراجات کے باوجود ادبی دنیا کی خدمات ایسی نہیں جنہیں پیش کر کے مَیں فخر و مباہات کر سکوں - کہ

"شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم"

کیونکہ سرانجامِ کار سے پہلے ہی تمہیدِ کار نے مجھے اپنی مشکلات میں اُلجھا لیا ہے - ادبی دنیا کی اشاعت کو مَیں اپنی منزلِ مقصود کا ایک راستہ بنانا چاہتا تھا - مگر حالات کی حریفانہ کشمکش نے اصل مقصد کو نظر انداز کر کے اب اِس ہفت خوانِ راہ (ادبی دنیا) کو میرے لئے منزلِ مقصود بنا دیا ہے - ادبی دنیا کو مَیں نے اِس لئے جاری کیا تھا کہ اِس کے ذریعہ ایک ایسی سازگار فضا پیدا کروں گا جس میں مجھے اردو زبان کی ایک جامع اور مکمل لغت کی ترتیب کا موقعہ نصیب ہو جائے - پھر زندگی اور وقت مُہلت دے تو اردو انسائیکلو پیڈیا کو بھی ہاتھ لگا دوں گا اور یا پھر دل کی آخری حرکت کے ساتھ یہ دُھن بھی ختم ہو جائیگی -

یہ ہے میرا ادبی پروگرام جسے بارہ سال سے اپنی زندگی کا نصب العین بنائے ہوئے ہوں - اِس نصب العین کو حاصل کرنے کی آرزو انجمنِ[1] اربابِ علم پنجاب - اردو[2] مرکز اور انڈین[3] اکیڈمی کے مختلف ناموں اور بوقلموں صورتوں میں بارہ برس سے تناسخی گردش کر رہی ہے -

ادبی دنیا کی اشاعت اِس منزلِ مقصود کی جانب ایک اور پیش قدمی تھی - آہ سوءِ تدبیر کہ یہ اِقدام بہت بُری طرح ناکام ثابت ہوا - اِس قمار میں اپنا اور اپنے خیرخواہوں کا آخری پیسہ لگا چکا ہوں - اور اب متاعِ جان کے سوا میرے پاس کچھ نہیں رہا - حالات کی اِس بیگانہ وشی سے میرے احباب گھبرائے ہوئے ہیں - اور مَیں ــــ مَیں تو خدا کے بعد مستقبل پر بھروسا کرنے کا عادی ہوں -

دیکھ رہا ہوں کہ ماضی پر ناکامی اور حال پر نزع طاری ہے، مگر مَیں نہ اُس سے ہراساں ہوں نہ اِس سے خائف، اور ایک جنوں پرست انسان کو اِس بھیانک منظر سے ہراساں ہونے کی وجہ بھی کیا ہو سکتی ہے؟ جسم و جاں میں ارتباط قائم ہے تو اپنے مستقبل سے ایک روشن حال اور ایک زریں ماضی پیدا کروں گا - مَیں سمجھ چکا ہوں ...... اچھی طرح سمجھ چکا ہوں - اِن دو سال کے مرگ آشنا تجربوں نے مجھے حق الیقین کے درجہ تک اطمینان دلا دیا ہے - کہ کوئی بڑا کام کرنے کے لئے ایک بڑے عزم، بڑی سی ہمّت اور ایک قانون شکن جنون کی ضرورت ہے - اور سرمایہ ......؟

سرمایہ تو جسقدر زیادہ ہوگا کام کرنے والے کو فشارِ کار کی لذّت سے اُسی قدر بے نصیب رکھیگا - کہ زندگی کا لطف، زندگی کی پریشانیوں میں ہے اُس کی آسودگیوں میں نہیں -

دیکھ رہا ہوں کہ حالات قطار در قطار میرا راستہ روکے کھڑے ہیں، ناکامیوں کے دُھندلکے نے منزلِ مقصود کو میری نگاہوں سے اوجھل کر رکھا ہے - گراں بارِ قرض اپنی لمبی لمبی باہیں لئے میری فضائے نظر میں منڈلا رہا ہے - اِن بانہوں کے جھُرمٹ سے کبھی عدالتِ دیوانی اور کبھی کبھی سنٹرل جیل کا دروازہ بھی اپنی جھلک دکھا دیتا ہے - مگر یہ مناظر جس تیزی سے بھیانک بن رہے ہیں - اُسی رفتار سے میرے ارادہ میں پختگی، میری ہمّت میں بلندی اور میرے جنون میں طغیان پیدا ہے - مَیں مشاہدہ کر رہا ہوں - کہ اِس تخریبی ماحول کے مقابلے میں میرا خدا میرے ساتھ ہے - مستقبل میرے ساتھ ہے - اور وہ عزم آہنیں میرے ساتھ ہے جس کی کارفرمائی سے دنیا کے بڑے بڑے کام سرانجام پا چکے ہیں -

آج مَیں اپنے اِنہیں دستگیر ساتھیوں پر بھروسا کر کے یہ اعلان کرتا ہوں کہ انشاءاللہ

ادبی دنیا اِسی آن بان اِسی طمطراق اور اِسی شان و شکوہ سے جاری رہیگا - بلکہ سچ تو یہ ہے کہ .... ع

"بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد"

یعنی میں نے اس کی معنوی ترقی کو موجودہ حالت سے بہت آگے بڑھانے کا انتظام کیا ہے۔ آئندہ نمبروں سے یہ مجوزہ ترقی محسوس طور پر نظر آئے گی۔

اہلِ نظر کی التفات:-

میں نے ابتدائے اشاعت سے ادبی دنیا کے صفحات میں خریداروں کو زحمتِ توجہ کبھی نہیں دی۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بدقسمتی سے اردو صحافت اپنی زندگی بھر خریداروں سے دریوزۂ التفات حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ البتہ میں نے کئی بار اہلِ نظر کو توجہ دلائی ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میری التماسِ توجہ کو ٹھکرایا گیا ہو۔

ہمارے ہاں رفقا "میں اہلِ نظر" کا لفظ دیکھ کر میرے ایک صحافی تجارت کے ماہر دوست نے میرا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ خریدارانِ ادبی دنیا سے اپیل کرنے کی بجائے یہ آئے دن اہلِ نظر اور اہلِ دل سے کیوں التجائیں کیا کرتے ہیں۔ آخر یہ کون لوگ ہیں جن پر آپ اس درجہ اعتماد رکھتے ہیں؟"

میں آج انہیں بتاتا ہوں کہ اہلِ نظر سے میری مراد کون حضرات ہیں۔ اور میں اُن پر کیوں اعتماد رکھتا ہوں۔ یہ تو انہیں بھی تجربہ ہے۔ کہ اخبار کے عام خریداروں کی عدالت میں آج تک کسی ایڈیٹر کا کوئی اپیل منظور نہیں ہوا۔ کیونکہ عموماً خریداروں کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اخبار کا مقررہ چندہ دے کر اپنے خیال میں اپنے تمام فرائض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ اخبار نفع پر چل رہا ہو یا نقصان پر اُنہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوا کرتی۔ پھر چونکہ عام طور پر وہ چاند اور چراغ کی روشنیوں میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتے۔ اس لئے چاندنی اور کہ چاندنی اُن کی نگاہوں میں ایک جیسی ہیں۔ وہ اہم، غیر اہم، ضروری، غیر ضروری میں فرق نہیں کر سکتے سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتے ہیں، اور سب کو اپنا زرخرید غلام خیال کرتے ہیں۔

رسالہ پہنچنے میں ذرا دیر ہوئی یا ڈاک والوں کی دستبرد سے نہ پہنچا تو بس غضب ٹوٹ گیا۔ تحقیقِ حال کئے بغیر رسالہ کے ہر کارکن کو ڈکشنری کی گالیوں کا مستحق سمجھ لیا جاتا ہے۔ اخبارات میں دفتر والوں کی بددیانتی اور دھوکہ بازی کے متعلق مضامین شائع کرنے کی دھمکیوں کا طوفان بپا کر دیا جاتا ہے۔

پھر جس جماعت کی یہ ذہنیت ہو اُس سے کسی ہمدردی، امداد، یا قدرشناسی کی توقع کرنے سے زیادہ اور کیا حماقت ہو سکتی ہے؟

رہے اہلِ نظر؟ یہ کوئی آسمان سے نازل ہونے والے فرشتے نہیں ہوتے۔ بلکہ ناظرین ہی میں سے گنتی کے چند قابلِ احترام افراد ہوتے ہیں جو کام کی پرکھ رکھنے کے ساتھ کام کرنے والوں کی مشکلات اور اُس کام کے متعلق اپنے امدادی ذمہ داریوں سے باخبر ہوتے ہیں جس کام کو کسی حیثیت سے مفید اور ضروری سمجھ لیتے ہیں۔ اُسے جاری رکھنے کی سرگرم کوششوں میں کارکنوں کی التجاؤں کا انتظار نہیں کرتے۔

سچ تو یہ ہے کہ کسی کام کرنے والے کو جب کام کی مشکلات نرغے میں لے لیتی ہیں اور وہ اس گردابِ بلا میں اپنے آپ کو یکہ و تنہا دیکھ کر جی ہارنے لگتا ہے تو یہی اہلِ نظر ہیں جو مردانِ غیب بن کر اُس کی ڈھارس بندھاتے ہیں۔

میں عام خریداروں اور اہلِ نظر کے متعلق اپنا تازہ تجربہ پیش کرتا ہوں۔ اس سے صحیح اندازہ ہو سکیگا کہ خریداروں اور اہلِ نظر کے نقطہائے نظر میں کس درجہ تفاوت ہے۔

پچھلے نمبروں سے میں اپنی مالی مشکلات کا ذکر کر رہا ہوں۔ اُس سے خریدار بھی متاثر ہوئے اور اہلِ نظر بھی۔ خریداروں کو یہ دھوکا ہوا کہ خدانخواستہ ادبی دنیا معرضِ خطر میں ہے۔ اس لئے اُنہوں نے بقیہ چندہ طلب کرنے کیلئے خطوط بھیجنے شروع کر دئے۔ دوسری جانب اہلِ نظر نے ادبی دنیا کی مشکلات کو کس نظر سے دیکھا؟ ذیل کے معروضات اس کا صحیح جواب دیں گے۔

(۱) مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر محترم نواب مسعود یار جنگ بہادر اپنے مکتوبِ گرامی میں تحریر فرماتے ہیں:-

"پچھلے نمبر میں ادبی دنیا کی مالی مشکلات کا حال پڑھ کر بیحد رنج ہوا کیونکہ میں ادبی دنیا کو بے حد پسند کرتا ہوں۔ بس اس کے لئے معقول تعداد میں خریدار فراہم کر دوں گا۔" (اقتباس)

اس کے بعد نئے خریداروں کے نام تحریر فرمائے ہیں اور توسیعِ اشاعت کے متعلق ایک پروگرام دفتر کو بھیج دیا ہے۔

(۲) پچھلے نمبر میں حضرت امام جماعت احمدیہ قادیان کی توجہ بیکراں کا حال آپ نے پڑھ لیا ہوگا۔ امام جماعتِ احمدیہ مرزا غلام احمد صاحب مسیح موعود کے خلف الرشید اور اُن کے خلیفہ ہیں۔ مرزا صاحب مرحوم کی تصانیف اردو ادب کا ایک ذخیرۂ بیکراں ہے۔ "الولد سر لابیہ"

کے مطابق اُن کے نامور فرزند کے دل میں بھی اردو زبان کے لئے ایک لگن اور اردو کے خدمت گذاروں سے ایک لگاؤ موجود ہے۔

نواب مسعود جنگ بہادر اِس صدی کے ذہین ترین، قابل ترین ہندوستانی جسٹس محمود کے فرزند اور ہندی مسلمانوں کے رہنمائے اعظم سرسید مرحوم کے پوتے ہیں۔

سرسید مرحوم کو مولانا حالی نے بجا طور پر "فادر آف اردو" کا خطاب دیا ہے۔ اردو کا کوئی زندہ ادیب آج یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری انشا پردازی سرسید کے خوانِ علم و ادب کی ریزہ چینی نہیں ہے۔ سرسید نے اردو ادب کو اپنی علمی مذہبی، ادبی، تاریخی اور اصلاحی تصانیف کی صورت میں ایک متاعِ گراں مایہ عطا کیا ہے۔ اور اِس سے بڑا احسان اُن کا یہ ہے کہ اُن کی تربیت اور ہم نشینی سے اردو زبان کو یکتائے روزگار مصنف نصیب ہوئے۔

نواب مسعود جنگ بہادر اپنی بے شمار عزیز مصروفیتوں کے باوجود وقتاً فوقتاً اپنے خاندان کی گراں وزن ادبی خدمات پر اضافہ فرماتے رہتے ہیں۔

(۳) میرے تین قابل عزت محسنوں نے میری مشکلات سے متاثر ہوکر اپنے اپنے وسیع حلقہائے تعارف و اقتدار سے خریداروں کی لمبی لمبی فہرستیں بھیجی ہیں۔ اُن کی اجازت ہے نہ میری مصلحت، اس لئے میں اُن کے نام شائع نہیں کرونگا۔ وہ جانتے تھے کہ میں نقد امداد کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اِس لئے انہوں نے جو خریدار عنایت کئے ہیں اُن کے چندہ کی مجموعی رقم حسب ذیل ہوتی ہے :-

(۱) ۲۸۵

(۲) ۱۰۰۰

(۳) ۱۳۰۵

۲۵۹۰

ادبی دنیا کے محترم ڈائرکٹر آنریبل سر عبدالقادر کو میرے اِن عنایت فرماؤں کا نام معلوم ہے۔ مجھے ایسے قدر شناس و قدر افزا اہلِ نظر کی موجودگی میں ادبی دنیا کے عام خریداروں کی حوصلہ آزما بے پروائی کا مطلق رنج نہیں ہونا چاہیئے۔

ادبی دنیا خوش قسمت ہے اور اُس کا نام نہاد مالک اُس سے بھی زیادہ خوش نصیب ہے۔ کہ اُسے ایسے اہلِ نظر اور ایسے محسن قدرت نے عطا کر رکھے ہیں۔ جن کی موجودگی میں نہ اُسے اپنے بقاء و استحکام اور اپنے فوز و کامرانی میں کسی قسم کا شک ہوسکتا ہے۔ نہ کسی محرومِ ذوق و بے نصیبِ بصیرۃ کی احتیاج۔

تعلیمی ادارت :-

میں ادبی دنیا میں عنوانِ بالا کے تحت ہندوستان کی مشہور درسگاہوں اور تعلیمی اداروں پر سیر حاصل مضامین کا ایک سلسلہ شروع کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ مختلف اداروں کے متنوع طریقہائے تدریس و مختلف نظریاتِ تعلیم اور اُن کے نتائج سے تعلیمی کارکن مکمل واقفیت حاصل کرسکیں۔ اِس پہلو میں متعلقہ حضرات کی امداد درکار ہے۔ کہ اِس کے بغیر یہ ضروری اور اہم سلسلہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ سردست حسب ذیل تعلیمی اداروں اور درسگاہوں کے متعلق مضامین چاہتا ہوں :-

عثمانیہ یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی۔ ہندو یونیورسٹی۔ شانتی نکیتن۔ جامعہ اسلامیہ دیوبند۔ ندوہ۔ جامعہ ملیہ، ودیا پیٹھ گجرات۔ گورو کل۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ۔

ہر مضمون میں اُس ادارہ کی مختصر تاریخ، ارتقا، طریقۂ تعلیم، مصارف۔ آمدنی۔ خاص خاص اساتذہ۔ علمی خدمات۔ تعلیمی کارنامے، آئندہ پروگرام طریقۂ انتظام، مخصوص کارکن، طلبہ کی معاشرۃ۔ عمارات، لائبریری۔ نتائج، اور جو بھی اہم خصوصیت قابلِ اظہار ہو۔ غرضیکہ ہر گفتنی بات کا مضمون میں ذکر کر دیا جائے۔ ممکن ہو تو اساتذہ اور خاص منتظمین کا گروپ۔ عمارات کی تصاویر بھی ہمرشتۂ مضمون کر دی جائیں۔

امید ہے کہ اِن اداروں سے وابستگی رکھنے والے حضرات اپنے اپنے ادارہ کے متعلق مکمل واقفیت بہم پہنچانے میں دریغ نہ کرینگے۔

نیرنگ خیال :-

دلکش آغاز کا دلفروز انجام

معاصر نیرنگ خیال سے پچھلے نمبر میں کچھ نوک جھونک شروع ہوئی تھی۔ شکر ہے وہ آغاز اپنا انجام ثابت ہوا۔ میں طبعی طور پر اِس قسم کی ناسزا نویسی کو ناروا سمجھتا ہوں۔ مگر بعض وقت حالات ایسے ناگزیر ہو جاتے ہیں کہ آدمی کو آدابِ آدمیت چھوڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یقیناً میں اپنے آپ کو اِس سے بلند سمجھتا ہوں۔ کہ اپنی زبان کو کسی کے متعلق ناگفتنی باتوں سے آلودہ کروں۔ مجھے افسوس ہے کہ نیرنگ خیال کی اینٹ کا میں نے پتھر سے جواب دیا۔

لاہور کے ڈاکٹر عبدالحلیم صاحب نے ادب آموزی کے دو دعویداروں

کی بدزبانی کو علم وادب کی شان کے خلاف دیکھ کر اپنے دولتکدہ پر دعوت دی - یہ دعوت بہت ہی مبارک ثابت ہوئی۔ شکوہ ہائے بیجا و بیجا درمیان میں آئے - تو یہ راز بھی آشکارا ہوا کہ کچھ ناشدنی لوگ اپنی شہرت کے لئے نیرنگ خیال کو استعمال کرنے کی غرض سے ادبی دنیا اور نیرنگ خیال کو ایک دوسرے کے خلاف اکسا کر ادبی بدتمیزیوں کا تماشا دنیا کو دکھانا چاہتے تھے - اسی طرح کچھ دوست نما مہربان ادبی دنیا کے ہمدرد بن کر اپنی غلط بیانیوں سے ادبی دنیا کے کارکنوں کو مشتعل کر رہے تھے۔ ان غرض پرستوں کی دراندازی نے سات سال تک ہمیں تعاون و موالات سے رد کے رکھا - خیر جو کچھ ہوا اُس کا نتیجہ ایک مستقل مصالحت کی صورت میں رونما ہوا - غنیمت ہے کہ "آئندہ را احتیاط" یہ ادبی دنیا اور نیرنگ خیال دونوں نے عہد و پیمان کیا ہے، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس سلسلے میں دونوں نے بہت سے مقامات مہر و وفا بھی طے کر لئے ہیں -

" جھکی ذرا چشم جنگجو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی
بڑا مزہ اُس ملاپ میں ہے کہ صلح ہو جائے جنگ ہو کر "

مذہب اور عشق :-

اِس نام کا ایک سیاسی ناول دفتر کو موصول ہوا ہے - مرحومہ والدہ سید افضل علی ایم اے اس کی مصنفہ ہیں - جن کی مشہور تصنیف "گودڑ کا لال" بہت مقبول ہو چکی ہے -

یہ ناول اس ملک کا ایک سیاسی رومان ہے جو آسان اردو، متین پیرایۂ بیان دلچسپ اور نتیجہ خیز پلاٹ پر شامل ہے - ناول میں تمام نام فرضی ہیں - اور سب واقعات اصلی - زیبائشِ داستان کیلئے واقعہ تراشی سے بہت کم کام لیا گیا ہے -

قیمت غیر مجلد بارہ آنہ - مجلد سوا روپیہ - دفتر اخبار دورِ جدید سے طلب کیا جا سکتا ہے -

نظام الاسلام مڈل اسکول دہلی :-

محترم خواجہ حسن نظامی نے دہلی میں درگاہ شاہ نظام الدینؒ اولیا کے زیر سایہ ایک جدید طرز کا اسکول جاری کر رکھا ہے - اس میں بچوں کو مڈل تک تعلیم دی جاتی ہے - یوں تعلیم تو ہر ایک اسکول میں دی جایا کرتی ہے مگر اس اسکول میں قابل قدر خصوصیت یہ ہے کہ تعلیم کے ساتھ بچے کی اخلاقی اور روحانی تربیت پر یہاں بہت زور دیا جاتا ہے، یہاں بچے کو خدا، مذہب، ماں باپ، ہمسایہ، ملک، ملت، سب کے حقوق سے واقف بنایا جاتا ہے - کامیاب زندگی اور اچھی صحت کے اصول سے اُسے باخبر رکھا جاتا ہے -

منتخب اساتذہ اور استانیان بچوں کی تعلیمی و اخلاقی نگرانی کرتی ہیں - جو حضرات اپنے جگر پاروں کو اُن کی بھلائی کی خاطر نگاہوں سے دور رکھ سکتے ہیں وہ نظام الاسلام مڈل اسکول دہلی کے ہیڈ ماسٹر صاحب سے خط و کتابت کریں -

چار چاند :-

دہلی کے مشہور افسانہ نگار یادگار میر دردؔ مولینا حکیم سید ناصر نذیر فراقؔ کے چار نہایت دلچسپ اور عبرت آموز افسانوں کا مجموعہ 'چار چاند' کے نام سے شائع ہوا ہے - مولینا موصوف قلعہ معلّیٰ کی ایک انسائیکلوپیڈیا ہیں - قلعہ معلّیٰ کی زبان، اُس کے حالات، بیگمات شاہی کی طرز معاشرت اُن کی زبان دانی، اُن کے لٹنے اور برباد ہونے کی دردناک داستان سننی ہو تو ناصر نذیر فراقؔ کی زبان سے سنو - اور دلّی دور نظر آئے تو "چار چاند" منگا کر پڑھو -

یہ کتاب حضرت مصنف سے دہلی خواجہ میر درد کی بارہ دری کے پتہ پر آٹھ آنہ میں مل سکتی ہے -

ڈاک، ڈاکیئے اور ڈکیت :-

کچھ دنوں سے ڈاک کے محکمے میں اردو ادب کا ذوق بہت ترقی کر رہا ہے، ڈاک خانوں کے کلرک چھٹی رساں - سارٹر - ادبی دنیا کو اردو پرچوں میں سب سے زیادہ پسند کرنے لگے ہیں - یہ امر جہاں اردو زبان کے لئے ایک نیک شگون اور ہمارے جذبۂ فخر و غرور کے واسطے موجب ازدیاد ہے - ادبی دنیا کے حق میں بہت حوصلہ فرسا ثابت ہو رہا ہے -

ہمارے پاس متعدد ایسی اطلاعات پہنچی ہیں کہ ڈاک کے کسی ملازم کو ادبی دنیا پڑھتے ہوئے خریدار نے جا پکڑا ہے - کئی جگہ یہ بھی ہوا ہے کہ چھٹی رساں کسی دوسرے مقامی پڑھے لکھے کو کچھ لے دے کر پرچہ دے دیتے ہیں ---- ہم پرچہ نہ پہنچنے کے متعلق تمام شکایات پوسٹ ماسٹر جنرل پنجاب کے پاس تحقیقات کے لئے بھیج رہے ہیں - ہمیں امید دلائی گئی ہے کہ جن ڈاکیوں نے یہ ڈکیتی اختیار کر رکھی ہے اُن کا جلد کوئی انتظام ہو جائے گا - ہم یہ بھی انتظام کر رہے ہیں کہ پوسٹل

آئینۂ عالم

ارون۔ گاندھی مفاہمت

گفتگوئے مصالحت آخر کامیاب ہوئی اور لارڈ ارون، مہاتما گاندھی سر تیج بہادر سپرو، مسٹر شاستری، نواب بھوپال۔ اور مسٹر جیکار کی مبارک کوششوں سے کانگریس اور حکومت میں صلح ہو گئی۔ اور حکومت نے اس حقیقت کا عملاً ثبوت دیدیا کہ اس کی ذہنیت بدل چکی ہے۔ کانگریس کی یہ بہت بڑی کامیابی ہے کہ سلطنت برطانیہ جیسی زبردست طاقت اُس کے اقتدار کا اعتراف کرلے۔ اور کسی مفاہمت یا معاہدہ میں اسے فریق معاہد تسلیم کرلے۔ اس صداقت کا بھی ہمیں اعتراف کرنا پڑیگا۔ کہ وسیع القلبی اور روشن ضمیری کے اس مظاہرہ سے سلطنت برطانیہ کی عظمت اور اقتدار کو صدمہ نہیں پہنچا۔ بلکہ اس فروتنی میں! سے حقیقی فروغ حاصل ہوا۔ ذوق نے سچ کہا ہے۔

"کہ جو ہیں روشن ضمیر اُن کا فروغ اُن کی فروتنی ہے"

اعلان صلح کے بعد اس جنگجویانہ ذہنیت کا جس کا مظاہرہ تحریک ترک موالات کے آغاز سے ہوتا رہا ہے، ایک مرتبہ سدباب ہو جاتا ہے۔ اور یہ کہنا غلط نہیں کہ ہندوستان کی جنگ عظیم، جو مسلسل دس سال تک جاری رہی۔ ۳ مارچ ۱۹۳۱ء کو خوشگوار شکل میں ختم ہو جاتی ہے۔ ہندوستان آج بجا طور سر افتخار آسمان تک اونچا کر سکتا ہے۔ کہ اس نے دنیا کے سامنے ایک جدید سیاسی تجربہ اور ایک جدید تمدنی مشق پیش کی ہے۔ جنگ کے نام نہاد ناگزیر اسباب اور اس کی ہولناکی پر آئے دن یورپ میں کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کیپٹن ہامان اور برن ہارڈی وغیرہ جیسے مصنفین کے خیالات امورِ مسلمہ کی حیثیت سے تسلیم کئے جانے لگے ہیں۔ برن ہارڈی کے اس قول نے کہ جنگ ایک معاشیاتی ضرورت ہے۔ ایک قانونِ فطرت ہے، جس سے مفر نہیں۔ انگلستان میں فریڈرک ہیرسن جیسی عافیت خواہ اور امن پسند شخصیت کو بھی آنیوالے خطرہ سے آگاہ کردیا تھا۔ انہوں نے بھی جنگ کے لئے برطانوی تیاریوں کو حق بجانب قرار دیا۔ ہندوستان آج فخر کر سکتا ہے کہ اس نے پُرامن جنگ کی تلقین کرکے دنیا پر یہ واضح کردیا کہ جنگ ایک ناگزیر چیز نہیں۔ اور اتحاد کے رشتے اختلاف کے رشتوں سے زیادہ اُستوار اور زیادہ مستحکم ہوتے ہیں، دنیا نے اتنی ترقی کر لی ہے۔ کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے چند نظریوں کے پیچھے وہ جنگ کی مصیبت میں مبتلا ہونا نہیں چاہتی۔

اب یہ مستقبل پر منحصر ہے کہ وہ مہاتما گاندھی کے اصول عدم تشدد کی کہاں تک قدر کرتا ہے۔ بہرحال ایک زمانہ تک ہندوستان اپنے مخلص خادم مہاتما گاندھی اور لارڈ ارون کی شاندار خدمات سے انکار نہیں کر سکتا۔

جدید ترکی میں تمدنی تحریک

دنیا کے متعلق جو رویہ ترک قوم رکھتی تھی۔ اور اس کی جو تفسیر کرتی تھی۔ اس کے بدلنے کے ساتھ فرد اور جماعت کے باہمی تعلقات اور جماعت کے نئے تخیل میں تبدیلی ہونا بھی ضروری تھا۔ کیونکہ ان دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس دوسرے تغیر کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جماعت کی تاریخی شکل کو مسترد کردیا جائے کہ اس میں فرد جذب ہی نہیں فنا ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ مخالفت اسلام کے تصور جماعت یا خود ملت اسلامی کے خلاف نہ تھی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اس نئی تمدنی تحریک نے نشو و نما پائی۔ تو ایسے حالات موجود تھے، جو حکومت کیلئے ہر طرح مساعد اور یہ تمدنی تحریک خود جماعتی اعتبار سے بھی اسلامی تصور کائنات کے زیر اثر تھی۔

ترکی کے سیاسی اقتدار کا سنگ بنیاد سلطان عثمان نے رکھا تھا، لیکن اقتدار ادبی کا بانی نامق کمال تھا۔ وہ وطن کا بانی تھا۔

یہ حب وطن کا موسّس، مغرب کی ذہنی تخلیقات نے اور خصوصاً گاتہ کی شاعری نے اس تصور وطنیت کو داخل کیا اور ذہنوں پر اس کا اثر ڈالا۔ جذبۂ وطنیت کے وجود اور اس کی ضرورت کو ترکوں نے اس وقت تسلیم کیا جب وہ مغرب کی تخلیقات سے آشنا ہوئے ترکی مشاہیر کی یقیناً ہمیں قدر کرنی چاہئے۔ جنہوں نے بے نظیر ایثار سے کام لیکر اپنے جسموں کو قربان کر دیا۔ لیکن ہم اس سے انکار نہیں

کر سکتے۔ کہ انھوں نے جو اپنی جان قربان کی، تو جذبۂ شجاعت کے اثر سے یا دوسری دنیا میں آسائش دوامی کی خاطر۔ جب تک بہشت وطن کی طرف سے نظریں پھیری رہیں اور کسی موعودہ شے کا طلسم اس پر غالب رہے تو ظاہر ہے کہ قربانی کا خون اسی مقام رجعت کی خاطر بہایا جائے گا نہ کہ دنیاوی وطن کے لئے۔ لیکن وطن کا مقصد کچھ اور نہیں۔ صرف یہ دنیا ہے۔ وہ تمدن کو برباد کرنا نہیں چاہتا بلکہ اس کی تعمیر کا طالب ہے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہونا چاہیئے کہ زندہ رہنا فرض ہے۔ اس لئے کہ وطن کی حیات برقرار رہے کہ یہ اس سے زیادہ عظیم الشان اور زیادہ ضروری فرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان اپنی روایات ملی سے بدگمان ترکی کی جدید تمدن کی بنیاد غیر ملکی تخلیقات ذہنی پر رکھنے پر مجبور ہوگئے اور آج ہم اس کی تہ میں جھاگ اور تلچھٹ دونوں دیکھتے ہیں۔ ترکوں میں وطن کے ساتھ ساتھ قوم کا تصور بھی پیدا ہوا۔ لیکن قوم پرستی کے آخری مراحل تک یہ تصور کچھ دھندلا اور غیر متعین سا رہا۔ اور اس میں کوئی خاص معنی پیدا نہیں ہوئے۔ یہی سبب ہے کہ ہم آج ترکوں کو اپنی انفرادیت گم کرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ خدا نہ کرے ایسا ہو!

یورپ اور مذہب

یورپ اور مذہب! دو متضاد چیزیں ہیں۔ مشرق میں زندگی کی جان مذہب ہے۔ اور اس کے ہر شعبہ میں سمایا ہوا ہے۔ یورپ میں لامذہبیت ہے۔ وہاں کسی مؤقر رسالہ یا کسی مستند اخبار کو اٹھا لیجیئے۔ مذہب اور مذہب کی روح کا فقدان ہے۔ اور وہ چیز جسے ہم مشرقی مذہب کہتے ہیں وہاں اگر ہے، تو ایک بے کیف صورت میں ہے۔ مشرق میں مذہب کی بیجا وست درازی نے چند ممالک میں ردّ عمل کی ایک لہر پیدا کردی ہے۔ یورپ میں۔　　　لامذہبیت نے طغیانی پیدا کردی ہے۔ اور اب وہاں نجات کا سہارا مذہب سمجھا جانے لگا ہے۔ یورپ میں ایک جماعت اس فردوس گم گشتہ کی جانب لوٹنا چاہتی ہے۔ اس کا مذہب سیاست و معشیت ہے۔ اس تگ و دو میں ناکامی کے بعد اب یورپ کی مذہب کے دامن میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ برنارڈ شا نے ابھی حال میں مذہب کی ضرورت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ میں مذہب کے بغیر نجات کا تخیل نہیں کرسکتا۔ مذہب سے ناآشنا اخلاقی حیثیت سے بزدل ہوتے ہیں۔ تمدن بھی اپنی آبیاری کیلئے مذہب کا محتاج ہے۔ الوہیت کو خواہ ہم کسی نام سے تعبیر کریں۔ روح حیات۔ روح عالم۔ مبداء ارتقا کسی نام سے پکاریں

* * * * * * ...زندگی کو اگر ایک بے معنی سلسلہ اتفاقات کی لغویت سے بچانا ہے تو مذہب کے بغیر چارہ نہیں۔ نجات کا تخیل صرف مذہب کے ساتھ ممکن ہے۔ (ادارہ)

پنجاب کی تعلیمی کانفرنسیں

سکھ اور مسلم تعلیمی کانفرنسوں کے اجلاس امرتسر اور منٹگمری میں ہو رہے ہیں۔

سکھ ایجوکیشنل کانفرنس جس شہر میں منعقد ہوتی ہے۔ اُس کے تمام ضلع میں تعلیمی بیداری پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی بدولت پنجاب میں سال بہ سال ایک خالصہ ہائی سکول کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ صوبہ کی تعلیمی ترقی میں یہ کانفرنس بہت مددگار ثابت ہوئی ہے۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ابتدا سے مسلمانوں کے عام جمود اور بے حسی کی فریادی رہتی چلی آئی ہے۔ اس کے اجلاسوں کا پروگرام متعرف ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی پستی کا ماتم، کچھ سوز خوانی۔ یزیدانِ تعلیم پر تھوڑی سی تبرا بازی، چند ملامتی تجاویز کے ساتھ کئی مدحیہ ریزولیوشن، کچھ دھمکیاں کچھ التجائیں اور اخیر میں صدارتِ عظمٰی کے شکریہ پر یہ ڈراما ختم ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کی حالت پر ملک کے ہر حصے میں یکساں جمود طاری ہے۔ علم و تعلیم سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں، کیونکہ اس کی کمی کا کوئی احساس ہی نہیں۔ اور اس لئے اس سے ہمدردی بھی نہیں رکھتے۔ یہ دردناک حالات دیکھ کر تعلیمی رہنماؤں کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شجاع الدین صاحب کی جواں ہمتی پر آفریں ہے کہ وہ اپنی مخلصانہ تعلیمی سرگرمیوں کو اس حوصلہ شکن فضا میں بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اِس سال مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں مسلم یونیورسٹی کے محترم وائس چانسلر جناب نواب مسعود جنگ بہادر بھی شرکت فرما رہے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ نواب صاحب موصوف اپنے قابلقدر تعلیمی تجربات سے کانفرنس کی رہنمائی فرمائیں گے۔ خان بہادر نبی بخش صاحب وزیر اعظم ریاست بہاولپور اس اجلاس کی صدارت کر رہے ہیں۔ امید ہے۔ کہ اُن کے عہد صدارت کی برکات مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی زندگی میں یادگار رہینگی۔

"تاجور"

سوال وجواب

اردو پڑھنے والے طلبہ اور اردو زبان کے استادوں کی درخواست پر اس نمبر سے "سوال وجواب" کا مستقل عنوان قائم کیا جاتا ہے۔ آئندہ اس صفحے میں اردو کورسوں کے مشکل اشعار کی تشریح، تلمیحات کی توضیح، مغلق الفاظ کے معنی، الفاظ کا صحیح تلفظ، صحیح املا، تذکیر وتانیث، الفاظ کے ماخذ، اور دوسری علمی، ادبی، تاریخی معلومات کے متعلق جو سوالات دفتر کو موصول ہوں گے، اسٹاف اُن سوالات کے ساتھ اُن کے جوابات بھی شائع کیا کریگا۔ ہر مہینے کی ۵ تاریخ تک تمام سوالات دفتر ادبی دنیا میں پہنچ جانے چاہئیں۔ طلبہ اور استادوں کے علاوہ قارئین ادبی دنیا بھی دریافت طلب سوالات بھیج سکتے ہیں۔ کورسوں کے متعلق طلبہ کے سوالات عموماً معمولی قسم کے ہوں گے۔ ممکن ہے ان سوالات پر کچھ لوگ ناک بھوں چڑھائیں، تو ایسے حضرات کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ ادبی دنیا ایک خالص تعلیمی پرچہ ہے جو طلبہ کی ادبی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ طلبہ کے مفاد کو اس میں ہمیشہ مقدم رکھا جاتا ہے۔ اور رکھا جائے گا۔

مندرجہ ذیل دو سوال دفتر کو موصول ہوئے ہیں:-

(۱) اعتراض کے معنی میں دوسرا لفظ نکتہ چینی ہے یا نقطہ چینی؟

(کوثر چغتائی)

(۲) اردو کورس میں حضرت عزیز لکھنوی کی غزل کا مندرجہ ذیل شعر سمجھ میں نہیں آتا، اس کا مطلب بیان کیجیے! (محمد حسین اردو ماسٹر)

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

جوابات

(۱) صحیح لفظ:-

نکتہ چینی

ہے۔ نقطہ چینی غلط ہے۔

(۲) اس شعر کا مطلب صاف ہے۔ شاعر محبوب کو خطاب کر کے کہتا ہے۔ کہ

اے محبوب تیری انگڑائی لینے کی ادا اسقدر دلنشیں تھی کہ اُس کی یاد دل سے فراموش نہیں ہوتی۔ انگڑائی لیتے ہوئے تو نے دونوں ہاتھ اوپر کو اُٹھائے تو ایسا معلوم ہونے لگا گویا حسن اپنے مرکز (حسن کا مرکز محبوب حقیقی یعنی خدا ہے) کی جانب اُڑنے والا ہے۔

جب کوئی پرندہ اُڑنے کو ہوتا ہے تو اُڑنے سے پہلے اپنے پر تولتا ہے، کندے جوڑتا ہے۔ دونوں بازو اوپر کو اُٹھاتا ہے اور پروں کو پھڑپھڑا کر اُڑ جاتا ہے۔

انگڑائی لینے والا بھی انگڑائی لیتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ ایک دائرے کی صورت میں اوپر اُٹھاتا اور انگڑائی کے وقت بالکل اُس پرندہ کی طرح ہوجاتا ہے۔ جو اُڑنے کے لئے پر تول رہا ہو۔

شاعر تشبیہ سے کام لیکر یہ بتانا چاہتا ہے کہ محبوب کے انگڑائی لینے کا دلربا انداز دید کے قابل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حسن (پیکرِ حسن دوست) اپنے مرکز (عالم بالا) کی جانب پرواز کرنا چاہتا ہے۔

تاجور

تصحیح

(طالبعلموں کیلئے)

اِس عنوان کے تحت میں الفاظ کے مروجہ غلط تلفظ اور املا کی تصحیح شائع کی جایا کرے گی۔ پنجاب کے طلبہ اور عام اردو خوانوں کو خاص طور پر اِس عنوان کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

(۱) اِتّحاد

پنجاب میں عام طور پر اِس کا تلفظ :-

اِ ت ح اد

رائج ہے۔ اور یہ غلط ہے۔ اِس کا صحیح تلفظ یہ ہے :-

اِت تِ حا د

اِتّحاد میں تلفظ کی غلطی اتحاد سے بنے ہوئے دوسرے الفاظ تک بھی پہنچ گئی۔ چنانچہ

(۲) مُتَحَّد و مُتَحَّدَہ

کو مُت حِ دْ اور مُت حَدْ دَہ بولا اور پڑھا جاتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں لفظوں کا اردو میں صحیح تلفظ :- مُت تَ حِ دْ۔ اور مُت تَ حِ دَہ

ہے۔ یعنی حرف۔ ت۔ پر تشدید ہے۔

مُتّحِد و مُتّحِدہ

تنقیدِ شعری

"اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا"

یہ شعر مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کا ہے۔ "گلکدہ" (حضرت عزیز کا مجموعۂ کلام) پر علامہ اقبال نے اظہار رائے فرماتے ہوئے مذکورۂ بالا شعر کی بہت داد دی ہے۔

ممکن ہے اُن کے ذہن رسا نے اس شعر میں کوئی خاص پیغام پایا ہو۔ جسے متوسط درجہ کی سمجھ بوجھ رکھنے والے نہ سمجھ سکیں۔ مگر بظاہر تو اس میں کوئی ندرت دکھائی نہیں دیتی۔

میں نے علامہ موصوف سے اس شعر پر داد دینے کی وجہ دریافت کی تو اُنہوں نے فرمایا۔

"نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی"

میں سر اقبال کی نظر کا احترام کرتے ہوئے اپنی کم بینی کے اظہار کو بھی آئین تنقید نگاری کے لئے ضروری سمجھتا ہوں۔ شعر کا مطلب و مفہوم جیسا کہ اُس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے یہی ہو کہ شاعر محبوب کے انگڑائی لینے کے انداز کی دل نشینی کو ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اے محبوب تیرے انگڑائی لینے کی کیفیت دل سے کسی طرح فراموش نہیں ہوتی۔ انگڑائی لینے کے لئے تو نے ہاتوں کو اُٹھایا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حسن اپنے مرکز (عالم بالا) کی جانب پرواز کرنے کو ہے۔ مفہوم کی زمیں گیری اور سطحیت بلند فلسفیانہ الفاظ میں بھی نہ چھپ سکی۔

میرے خیال میں اس شعر کا واضح عیب اس کے دونوں مصرعوں کی بے ہمواری ہے۔

"اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حُسن"

اس مصرعہ کا اسلوب بیان بہت پُر شکوہ ہے۔ انداز تصوف کے ساتھ رنگ تفلسف بھی اس سے ٹپکتا ہے۔ اسے سُنکر سامع منتظر ہو جاتا ہے کہ دوسرے مصرعہ میں اقبال کے بلند انداز میں کسی فلسفیانہ گتھی کو سلجھایا جائیگا یا تصوف کے کسی لاینحل مسئلے پر روشنی ڈالی جائیگی۔ مگر دوسرے مصرعہ میں "عالم تری انگڑائی کا" سنکر اچانک اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر لکھنؤ میں شاہ مینا کے مزار کو جاتے جاتے "چوک" کی طرف پلٹ پڑا ہے۔ انگڑائی کے لفظ کے ساتھ ہی لکھنوی شاعری کے تمام خط و خال کنگھی چوٹی مسّی اور آرسی ایک ایک کر کے سامع کی چشم تصور کے سامنے آجاتے ہیں۔ شاعر کو محبوب کی انگڑائی کا نقشہ کھینچنا ضروری تھا تو پہلے مصرعہ میں اس طرح گرجنے کی ضرورت نہ تھی۔ میرا مقصد یہ ہے کہ جس مفہوم کو ادا کرنا ہو اُس کے لئے الفاظ کے انتخاب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ کوئی بلند و پُر شکوہ خیال ہو تو اُسے پُر شوکت الفاظ اور شاندار اسلوب بیان میں پیش کرنا چاہیئے۔ لطیف و نازک خیال کے لئے لوچدار الفاظ اور لطیف پیرایۂ ادا کی ضرورت ہوتی ہے کلام میں ہمواری اس احتیاط کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ ملاحظہ ہو غالب کا شعر۔

شب خمار شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تامحیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

اس شعر میں خیال کی ندرت کے ساتھ الفاظ و طریقۂ بیان کی شان و شوکت یکساں طور پر موجود ہے۔ اب اگر کوئی غالب کے اس شعر کو برباد کرنا چاہے تو اُسے زیادہ کاوش نہ کرنی پڑیگی صرف اتنا کرے کہ کسی طرح "خمیازہ" کو "جمائی" سے تبدیل کر کے شعر کو موزوں کر دے۔ کسی کو یہ مغالطہ نہ ہونا چاہئے کہ میں انگڑائی کے لفظ کو متروک الاستعمال قرار دے رہا ہوں۔ نہیں۔ حضرت عزیز کے شعر میں کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ہے جسے متروک الاستعمال کہا جائے۔ ہر لفظ اپنی جگہ استعمال کے قابل ہے۔ میرا اعتراض یہ ہے کہ پہلے مصرعہ کو جس شان و شکوہ سے شروع کیا تھا دوسرے مصرعہ میں انگڑائی کے لفظ شعر کے مفہوم اور ادائے بیان نے شعر سے ہمواری کی صفت غارت کر دی۔

انگڑائی کا نقشہ مرحوم نظام رام پوری نے بھی کھینچا ہے۔ ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھکو چھوڑ دئے مُسکرا کے ہاتھ

* اپنے حدود میں اس شعر کا مفہوم شوخ اور چٹکیلا ہے۔ شاعر نے اُس کے لئے لوچدار الفاظ کے ساتھ پیرایہ اظہار بھی عام فہم دلچسپ اور سادہ اختیار کیا ہے۔ لیکن اگر شعر کو سو جھتی اور شاعر کو گردن زدنی بنانا ہو تو اسے یوں پڑھئے :۔ خمیازہ بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ ۔ دیکھا جو مجھکو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ ۔ مختصر یہ کہ خیال آفرینی کی *

نغمہ نواز

طرب کی رنگین خلوتوں میں گلِ محبت کھلا ہے دیکھو
عناصرِ زندگی کو کیسا حسین خلعت ملا ہے دیکھو

شگفتگی بہار ساری سمٹ کے چہرے پہ آگئی ہے
سوادِ فردوس کی ملاحت حسین زلفوں پہ چھا گئی ہے

شباب لہریں سی لے رہا ہی بدن پہ اک موجِ نور بن کر
فضا کو مدہوش کر رہی ہے نگاہ کیف و سرور بن کر

حسین چہرے کی تازگی میں حیا کی سرخی جھلک رہی ہے
سرور کا میکدہ ہیں آنکھیں شرابِ عشرت چھلک رہی ہے

رگوں میں دل کی لطافتِ انبساط سے ارتعاشِ نغمہ
کھلی ہوئی ہے کتابِ جادو۔ نگاہ کو ہے تلاشِ نغمہ

شریکِ خلوت مغنیہ بھی ہے اور اک اسکا ساز بھی ہے
عجیب محفل ہے جس میں نغمہ سرا بھی نغمہ نواز بھی ہے

وہ نغمۂ دلنواز چھیڑ، اے مغنیہ جو طرب فزا ہو
نشاط پرور، سرور آمیز، دلنشیں ہو، الم ربا ہو

وہ نغمۂ دلگداز جس سے ہوائیں مسحور ہوں جہاں کی
وہ نغمۂ مے فروش جس سے فضائیں مخمور ہوں جہاں کی

نوائے رنگینِ عشق سے کائنات کو نغمہ زار کر دے
نشیدگی سحر کاریوں سے دلوں کو بے اختیار کر دے

چمک کے رہ جائے ایک بجلی ترے تبسم کے بادلوں سے
اثر کی بارش ہو ہلکی ہلکی ترے ترنم کے بادلوں سے

لطیف نغمہ لبوں سے نکلے پناہِ حسن و شباب لیکر
فرشتے اتریں زمیں پہ کوثر سے پیشکش کو شراب لیکر

رباب کے تار چھیڑ بھی دے۔ فضا میں اک رنگ و کیف بھر دے
نظر کی جنت تو ہے یہ محفل۔ اب اس کو فردوسِ گوش کر دے

وقار (انبالوی)

تاریخ اور وقت

(۲)

ماہ و سال کا تعیّن

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

دن اور سال و ماہ زمین اور چاند کی گردشوں پر مبنی ہیں۔

چاند کا ایک دور ۲۹ دن ۱۲ گھنٹے اور ۴۴ منٹ میں ختم ہوتا ہے۔ اور سورج کے گرد زمین کی گردش دوری ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ ۴۶ سکنڈ اور ۴۳ ثالثہ میں ختم ہوتی ہے۔

وقت کی یہ تینوں تقسیمیں ایسی واقع ہوئی ہیں، کہ وہ ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ نہ چاند کا پورا دور ہی دنوں کی مکمل تعداد میں ختم ہوتا ہے۔ نہ سورج کے گرد زمین اپنا دور قمری مہینوں کی پوری تعداد میں ختم کرتی ہے۔

یہ اختلافات ہی وقت کے شمار میں اصلی دشواری کا باعث ہوئے۔ دن بلاشبہ وقت کی سب سے پہلی تقسیم ہے۔ اُس کا ابتدائی تصور غالباً طلوع سے غروب تک تھا۔ لیکن چونکہ یہ مقدار گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اِس وجہ سے رات دن کو ملا کر دن کی مقدار قرار پائی۔[۵]

چاند کی بدلتی رہنے والی شکلوں نے انسان کی تخیلہ پر بڑا اثر ڈالا تھا۔ اور مذہبی افسانوں، تہواروں، اور عبادتوں کا ایک پورا سلسلہ اوضاع قمری کے ساتھ وابستہ تھا۔

قدیم مذہبی توہمات و مراسم ہی مہینہ کی پیدائش کا باعث ہوئے۔

(۲)

تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی، کہ چاند کبھی ۲۹ دن میں دکھائی دیتا ہے۔ اور کبھی تیس دن میں، لیکن صحیح طور پر پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ کس دن دکھائی دیگا۔ اور قمری مہینے کا اختتام و آغاز کس کس دن ہو سکیگا۔

ایسی حالت میں وقت شماری کے لئے انسان کے سامنے دو طریقے تھے، یا تو سال کا مدار چاند کے مہینوں پر رکھا جائے، یا قمری مہینوں کو چھوڑ کر سال کو پکڑ لینا چاہئے۔ اور اُس کے لحاظ سے مہینوں کی تقسیم کر دی جائے۔

مذہبی روایات پہلے طریقے کے موافق تھیں، اور کاروباری ضروریات (مثلاً زراعت) دوسرے طریقے کی مقتضی، تاکہ سال کی مقدار سال طبعی کے تقریباً مطابق ہو سکے، اور فصلوں اور موسموں کا اندازہ معلوم رہے۔

بہت سی قوموں (مثلاً اہلِ بابل، یہودیوں، اہلِ عرب، یونانیوں، رومیوں) نے اپنی تقویم کا مدار قمری مہینوں پر رکھا، البتہ غالباً سب سے پہلے قدیم مصری تقویم شمسی کے موجد ہوئے۔ جنھوں نے سال کو تیس تیس مہینوں میں بانٹ کر اختتام سال پر ۵ دن اضافہ کرنے کا رواج ڈالا۔

تقویم قمری پر کاربند ہونے والے بھی اپنی تقویم کو سال شمسی کے مطابق رکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً مختلف طریقے اختیار کرتے رہتے تھے، جنہیں اصطلاحاً "کبیس" (لوند) کہتے ہیں۔

قدیم اہلِ ہند میں بھی تقویم قمری کا رواج تھا، اور اُن میں بھی لوند سے کام لیا جاتا تھا۔

فاضل البیرونی لکھتا ہے:۔

"کچھ اہلِ ہند سنہ قمری اور ماہ ہائے قمری کام میں لاتے ہیں، اور کچھ ماہ ہائے شمسی ان دونوں حالتوں میں کبیس کی ضرورت پیش آتی تھی"[۶]

---

۵ کرۂ ارض کی گردش محوری میں رفتہ رفتہ زیادہ تاخیر ہو رہی ہے۔ یعنی دن رات کی واقعی مقدار میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اِس لئے دن رات بھی ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔

۶ دیکھو کتاب الہند، صفحہ ۱۷۸

(۳)

سالِ طبعی کی مقدار معلوم کر کے اصطلاحی سال وضع کرنا کچھ کم دشوار کام نہ تھا۔ اور اُسے مختلف قوموں نے مختلف طور پر انجام دیا۔

لیکن تاریخ کے نقطۂ نظر سے ابھی ایک اور بڑی پیش قدمی درکار تھی۔ یعنی ایک ایسے نقطۂ وقت کی تعیین، جس کے حوالہ سے، آئندہ کے واقعات بسہولت اور خود بخود محسوب ہو سکیں۔

قدیم مصریوں اور بابلیوں میں رواج تھا کہ کسی سال کا نام کسی تہوار، یا جنگ، یا کسی غیر معمولی حادثہ، یا اہم واقعہ سے منسوب کر کے اُس کے حوالے سے بعد کے سالوں کو یکم، دوم، سوم کے ناموں سے پکارتے تھے۔ یہاں تک کہ کوئی اور نیا سال اسی طرح نامزد ہو جاتا۔

اہلِ عرب میں بھی ایسا ہی رواج تھا، اور "ایام عرب" ایسے ہی واقعات کی یادگار ہیں۔ "عام فیل" اس سنہ کا نام ہے جب حبش کے ایک پادشاہ ابرہہ نے ہاتھیوں کے ساتھ مکہ پر حملہ کیا تھا۔

اہلِ مصر اور بعد میں اہلِ بابل میں سنہ جلوس کا بھی رواج تھا، مصری جلوس کے سال کو چھوڑ کر اگلے برس سے پہلا سال جلوس شمار کرتے تھے، اور بابلی اُسی سال سے۔ سنہ جلوس کا رواج سلطنت برطانیہ میں اب تک موجود ہے۔ اور ہندوستان کے مغل سلاطین میں بھی تھا۔ جیسا کہ اُن کے فرامین واسناد اور اُن کے زمانہ کی دستاویزات و کاغذات سے ظاہر ہے۔

بعض جمہوریتوں، اور مذہبی جماعتوں، مثلاً اہل اسپارٹا اور صابیوں میں رئیس و پیشوا کے تقرر کے وقت سے سنہ کو شمار کرتے تھے۔ یہ رواج ہمارے زمانے میں کیتھالک عیسائیوں میں چلا جاتا ہے۔ جو پوپ کے تقرر کے وقت سے سنوں کو شمار کرتے ہیں۔

(۴)

کسی معین واقعہ سے سنوں کا شمار بہت بعد میں شروع ہوا۔ اُس کی سب سے پہلی مثال غالباً اسکندر اعظم کے سالار لشکر سلیوقس (مقتول ۲۸۱ ق م) کا سنہ ہے، جو ۳۱۲-۱۱ ق م سے شروع ہوتا تھا۔

بعد کے زمانوں میں آشوری پادشاہ بخت نصر اور مقدونوی پادشاہ اسکندر اعظم، اور ایرانی پادشاہ یزدجرد کے سنین بھی عرب علمائے ہیئات کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

مسلمانوں میں سنہ ہجری کا رواج ہے، جو ایک نہایت سادہ قمری تقویم پر مبنی ہے، جس میں کبس سے بھی کام نہیں لیا جاتا۔

اس سنہ کا آغاز شب جمعہ ۱۵ جولائی ۶۲۲ء سے ہوتا ہے۔

لیکن فی الواقع اس سنہ کا خیال حضرت عمر بن خطابؓ خلیفہ ثانی کے عہد میں پیدا ہوا۔ اور اسی وقت سے رائج ہے۔

علامہ البیرونی نے لکھا ہے کہ اُس کے زمانہ (یعنی گیارہویں صدی عیسوی کے شروع میں) اہلِ ہند میں مختلف سنہ مثلاً سمت شری ہرش، بکرمادیت، شک، بلب، اور گوپت، رائج تھے۔[۵]

خود ہمارے زمانے میں بھی متعدد سمتوں کا رواج ہے، جن میں سمت بکرمی خاص طور پر مشہور ہے۔

(۵)

سال شمسی کی مشہور تقویم مسیحی، جو یورپ میں، اور اُس کے اثر سے دُنیا کے اکثر ملکوں میں مستعمل ہے۔ ایک رومی اصلاح شدہ تقویم ہے اور دوسری زمانۂ مابعد کی اصلاحی تقویم پر مبنی ہے۔

اس تقویم کا ابتدائی ماخذ قدیم مصری تقویم کو سمجھنا چاہئے۔ مصریوں میں پہلے تو ۳۶۵ دن کی تقویم رائج تھی۔ پھر یونانیوں کے زمانہ میں ۳۶۵ ¼ دن کا سال قرار پانے کی وجہ سے ہر چوتھے برس ایک دن بڑھانے کا رواج ہوا۔

رومی قیصر یولیوس (Julius) نے ۴۶ سنہ ء میں مہینوں کی موجودہ ناہموار تقسیم، اور چوتھے برس ایک دن اضافہ کرنے کا قاعدہ مقرر کیا، جو مسیحی یورپ میں سولہویں صدی تک رائج رہا۔

پوپ گریگوری سیزدھم نے یہ اصلاح کی کہ چار صدی میں تقریباً تین دن گھٹا دئے جایا کریں (زیادہ صحیح یہ ہے کہ ۱۲۸ سال میں ایک دن۔) جس کی وجہ سے تقویم گریگوری کی تاریخیں تقویم یولیوس سے آگے رہتی ہیں۔

گریگوری کے زمانہ میں یولیوس کی تقویم میں فی الواقع دس دن کا فرق پڑتا تھا۔ اس لئے اُس نے ۵ اکتوبر ۱۵۸۲ء کو ۱۵ اکتوبر ۱۵۸۲ء شمار کیا۔

سنہ مسیحی کا آغاز ۳۱ دسمبر ۱ سنہ سے ہوتا ہے لیکن علمائے ہیئات اس سال اول کا صفر مانکر اپنی تقویم کا آغاز ۲ سنہء سے کرتے ہیں۔ اُن کے یہاں ۱۹۳۱ سنہ کی بجائے ۱۹۳۰ء ہے۔

چونکہ تقویم یولیوس کا طریقہ زیادہ سہل ہے۔ اس لئے بجز

عہ ۵ دیکھو کتاب الہند ص ۱۴۹ و ص ۲۰۶

چند اخیر صدیوں کے گذشتہ زمانے کی تمام تاریخ میں تقویم یولیوس کے حساب سے کام لیا جاتا ہے۔ اِس وجہ سے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قدیم زمانے کی تاریخ میں تمام سنوں کی فصلیں موجودہ سنوں کی فصلوں سے مطابقت نہیں رکھتیں، بلکہ جیوں جیوں ہم پیچھے ہٹتے جائیں، اُسی قدر فرق پڑتا چلا جائیگا۔ یہانتک کہ کئی فصلوں کا فرق بلکہ سال یا اُس سے زیادہ کا فرق ہو جائیگا۔

انگلستان اور امریکہ میں تقویم گریگوری ۱۷۵۲ء سے رائج ہے، اور روس میں انقلاب کے بعد سے رائج ہوئی ہے۔

میسح سے قبل سنہ عیسوی کے رو سے وقت کا اندازہ کرنے کا مفید طریقہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر سے رائج ہوا ہے، اور ایک معیّن نقطۂ وقت سے گذشتہ اور آئندہ واقعات کا شمار کرنا، ایک ایسی علمی ایجاد ہے، جو اپنے فائدوں کے لحاظ سے بیحد قابلِ قدر ہے۔

تقویم شمسی میں اصلاح کی وقتاً فوقتاً کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ جب تک سال شمسی کی صحیح مقدار معیّن نہیں ہوئی اُس وقت تک سب اصلاحیں ناقص اور نامکمل رہیں، بلکہ صحیح مقدار دریافت ہو جانے کے بعد بھی ابھی تک دنیا نے کوئی بے عیب علمی تقویم اختیار نہیں کی ہے۔

یہ تمام اصلاحیں کسی کے ایسے طریقے اختیار کرنے پر مبنی ہیں۔ جو سہل اور بہترین ہوں۔

باوجود اُن دونوں اصلاحوں کے، جن پر موجودہ مسیحی تقویم مبنی ہے، یہ تقویم ہنوز ناقص و نامکمل ہے۔ اُس کے مہینوں کے ایّام ناہموار اور غیر مساوی طریق پر تقسیم ہیں (۲۸، ۲۹، ۳۰ و ۳۱) اور باوجود ہر چوتھے برس اور چار سو سے تقسیم ہونے والی صدیوں میں "کبس" کرنے کے سنہ مسیحی کا سال سنہ طبیعی کے پوری طرح مطابق نہیں ہوتا۔ چنانچہ ۳۸۸۶ برس میں پورے ایک دن کا فرق پڑتا ہے۔

غالباً اس وقت تک جتنی اصلاحیں ہوئیں اُن میں سب سے بہتر "تاریخ جلالی" ہے، جو جلال الدین ملک شاہ سلجوقی کے نام سے موسوم ہے، اور علمائے ہیئات کی اُس جماعت نے سرانجام دی تھی، جن کا سرگروہ عمر خیام تھا۔

خلافت عباسیہ میں ایران کا قدیم شمسی سال اور اُس کے مہینے اسلامی قمری سال اور اُس کے قمری مہینوں کے ساتھ رائج تھے۔ اور اُن سے سرکاری دفتروں میں کام لیا جاتا تھا۔ ابتداءً عباسی خلفا المتوکل اور اُس کے جانشین المعتضد نے اس تقویم میں کچھ اصلاح کرنی چاہی، جو نکتہ چینی سے بالاتر نہ تھی۔[1]

ملک شاہ کے علمائے ہیئات نے قدیم ایرانیوں کے دستور کے مطابق سال کو تیس تیس دن کے بارہ مہینوں میں بانٹ کر دنوں کے نام بھی فارسی برقرار رکھے۔ سال کے اخیر میں پانچ دن بڑھا دئے جاتے تھے۔ جنہیں اصطلاحاً "ایامِ مسترقہ" کہتے تھے۔ ہر چوتھے برس ایک دن کا کبس کیا جاتا تھا۔ اور جس سال میں یہ دن بڑھتا تھا اُسے سال "کبیسہ" کہتے تھے۔ ہر ساتویں یا آٹھویں سال کبیسہ کے بعد کبس بجائے چوتھے سال کے پانچویں سال ہوتا ہے۔[2]

سنہ جلالی کی ابتدا جمعہ ۱۰ رمضان ۴۷۱ھ سے ہوتی تھی، اور سلجوقیوں کی سلطنت میں اور زمانہ مابعد تک اس کا رواج رہا۔

تقویم جلالی میں کچھ ترمیم کر کے، جس کا ذکر فاضل ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں کیا ہے، اکبر اعظم نے ایک نیا سنہ، جسے تاریخ (یا سنہ) الٰہی" سے موسوم کیا گیا تھا۔ جاری کیا تھا، جو اُس کے بعد سلطنت مغلیہ ہندوستان میں رائج رہا۔ اور اُس عہد کے کاغذوں میں مستعمل ہوتا تھا۔ اکبر کی ترمیم الغ بیگ کی تحقیقات ہیئات پر مبنی تھی، لیکن میری رائے میں اُس کی اصلاح ملک شاہ کی اصلاح سے بہتر نہیں ہے۔

انقلاب فرانس کے بعد ایک نئی تقویم رائج کرنے کی کوشش کی گئی۔ جس کی ابتدا ۲۲ ستمبر یوم انقلاب سے ہوتی تھی۔ ہر مہینہ تیس تیس دن کا ہوتا تھا اور ہفتے کی بجائے دس دس دن ہوتے تھے۔ سال کے اخیر میں پانچ دن بڑھا دئے جاتے تھے، اور ہر چوتھے برس ایک دن کا اضافہ کیا جاتا تھا، جو "یوم انقلاب" کے لقب سے موسوم کیا گیا تھا۔ یہ تقویم ۱۸۰۶ء تک رائج رہی۔ اور اُس کے بعد سے آج تک فرانس میں بھی یورپ کے دوسرے ملکوں کی طرح تقویم گریگوری مروج ہے۔

(۶)

تاریخ میں سنوں کی تحقیقات بھی بعض اوقات بڑا دشوار کام ہوتا ہے۔ یہ وقت پچھلے زمانے کے واقعات کے متعلق بہت زیادہ

---

[1] دیکھو البیرونی کی کتاب آثار الباقیہ ص ۳۱ - ۳۳

[2] تقویم جلالی کے متعلق ہم نے بعض غیر مطبوعہ مآخذ سے قیمتی معلومات حاصل کی ہیں، جنہیں انشاءاللہ کسی جداگانہ مقالہ میں مفصل طور پر بیان کریں گے۔

(باقی)

بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً ہمارے قدیم ہندوستان کی تاریخ میں اس قسم کی تحقیقات اکثر حوصلہ شکن ثابت ہوتی ہے۔ جیوں جیوں صبر آزما تاریخی تحقیقات آگے بڑھتی رہیگی۔ سنوں کے عُقدے بھی زیادہ حل ہوتے جائیں گے۔

بحالت موجودہ قدیم تاریخوں کے حسابوں میں ممکن ہے کہ بعض اوقات صدیوں کا فرق ہو۔

مؤرخ تاریخی واقعات کے تعین میں وقت اور دن تک معلوم کرنے کا جویا رہتا ہے، اور کبھی کبھی بعض واقعات سماوی و ارضی مثلاً (کسوف وخسوف) سے اُسے قدیم واقعات کے متعلق ایسے یقینی نتائج حاصل کرنے کا موقع ملجاتا ہے۔ جو دوسرے تاریخی ذرائع سے ناممکن ہوتے ہیں۔

مختلف سنوں (مثلاً عیسوی، ہجری، اور بکرمی) کے رواج کی وجہ سے اُسے سنوں کی باہمی تطبیق بھی کرنی پڑتی ہے، جو خالی از دقت نہیں ہوتی۔ یہ مختلف سنین اکثر مختلف اصول پر مبنی ہیں۔

ابھی تک دُنیا میں کوئی بے عیب تقویم رائج نہیں جس سے مؤرخ کام لیتے ہوں۔

تاریخ کے لئے ایک ایسی تقویم مطلوب ہے، جس کا سنہ و مہینے اور سال اصطلاحی، سنہ طبیعی کے مطابق ہو، اور اُس کے ساتھ واقعات کے متعلق خود بخود وقت کے صحیح تصورات یعنی موسموں اور فصلوں کا اندازہ ہوتا رہے۔

اُس کی رو سے تاریخ از سرِ نو مدوّن ہونی چاہئے۔ یہ کام ہماری آنے والی نسلوں کے لئے کچھ کم دلچسپ نہ ہوگا۔

سیّد حسن برنی۔ بی اے ایل ایل بی

اے دوست

اندوہ والم گھیرتے ہیں جب دل کو
اُمید کا خوشنما و رنگیں چہرہ
طوفان میں جس طرح ہو ٹوٹی کشتی
ناکامیاں مضحکہ اُڑاتی ہیں جب
چھوٹی ہوئی منزلوں کا غم ہوتا ہے
ہوتا ہے یہ آشکار چہرہ سے مرے
اُسدم اے دوست یاد آتا ہے تو
ہر رنج والم کو بھول جاتا ہوں میں

اور اپنی طرف پھیرتے ہیں جب دل کو
بھولے سے دکھاتا نہیں اپنا جلوہ
جسوقت یہ ہو جاتی ہے حالت دل کی
محرومیاں قسمت کی رُلاتی ہیں جب
گذری ہوئی عمر کا الم ہوتا ہے
جیسے دل کے ہوئے ہیں ٹکڑے ٹکڑے
میرے اشکوں پہ مُسکراتا ہے تو
دل کو مسرور و شاد پاتا ہوں میں

اور یاد میں تیری محو ہو جاتا ہوں
گویا کہ مسرّتوں میں کھو جاتا ہوں

زیبا (ردولوی)

گول میز کانفرنس

اور

مسلمانانِ ہند

(گول میز کانفرنس کے ایک مشہور نمائندہ کے قلم سے)

اس تاریخی کانفرنس میں مسلمانانِ ہند کی نیابت مندرجہ ذیل اصحاب کے سپرد تھی:-

ہز ہائینس سر آغا خاں - سر محمد شفیع - مسٹر جناح - سر عبدالقیوم - مولانا محمد علی - نواب سر احمد سعید خاں آف چھتاری - سر سلطان احمد - ڈاکٹر شفاعت احمد خاں - چودھری ظفر اللہ خاں - سر غلام حسین ہدایت اللہ - سر شاہ نواز بھٹو - مسٹر اے - کے فضل الحق - سر اے - ایچ غزنوی - حافظ ہدایت حسین - راجہ شیر محمد خاں - بیگم شاہ نواز -

راجہ شیر محمد خاں دراصل جنگی اقوام کے نمائندہ تھے - اور بیگم شاہ نواز خواتین ہند کی نمائندہ تھیں - لیکن دونوں کو بحیثیت مسلمان ہونے کے مسلم نقطۂ نگاہ کے ساتھ ہمدردی تھی - اس لئے عملاً دونو مسلمان نمائندگان میں شامل کئے جا سکتے ہیں -

ہز ہائینس سر آغا خاں تو مقیم ہی یورپ میں ہیں - کانفرنس کے دیگر نمائندگان کی آمد جب شروع ہوئی تو آپ پیرس میں تشریف رکھتے تھے - گو آپ کی طرف سے اطلاع آچکی تھی کہ جس وقت تمام مسلم نمائندگان لندن میں پہنچ جائیں تو میں بھی پہنچ جاؤنگا -

سر محمد شفیع امپیریل کانفرنس میں شمولیت کے لئے ستمبر ہی میں لندن پہنچ گئے تھے - اور بیگم شاہ نواز بحیثیت اُن کی سیکرٹری کے اُن کے ساتھ تھیں -

مولانا محمد علی - مسٹر جناح - سر سلطان احمد - ڈاکٹر شفاعت احمد خاں سر شاہ نواز بھٹو اور حافظ ہدایت حسین ۴ راکتوبر ۱۹۳۰ء کو بمبئی سے پی اینڈ او کے جہاز وائسرائے آف انڈیا پر سوار ہوئے - اور ۱۷ راکتوبر کو مارسیلز پہنچے - مولانا محمد علی تو بوجہ علالت طبع پیرس رُک گئے - مسٹر جناح بھی پیرس ٹھہر گئے - سر شاہ نواز بھٹو جرمنی چلے گئے - سر سلطان احمد -

ڈاکٹر شفاعت احمد خاں اور حافظ ہدایت حسین ۱۸ راکتوبر کو لندن پہنچ گئے - سر عبدالقیوم - چودھری ظفر اللہ خاں - مسٹر اے کے فضل الحق اور راجہ شیر محمد خاں ۲۵ راکتوبر کو لندن پہنچ گئے -

آخر اکتوبر ہز ہائینس سر آغا خاں اور مسٹر جناح بھی لندن پہنچ گئے -

۷ رنومبر کو مولانا محمد علی بھی تشریف لے آئے -

شروع نومبر میں باقی نمائندگان بھی پہنچ گئے - سر غلام حسین ہدایت اللہ ذرا دیر سے پہنچے - کیونکہ اُن کی نامزدگی دیر سے ہوئی تھی -

برطانوی ہند کے نمائندگان کی مشاورتیں تو ۲۶ راکتوبر سے شروع ہوگئیں، گو ۲۶ راکتوبر کو محض افتتاحی مشاورت ہوئی اور بعض ابتدائی امور کے متعلق سیکرٹری کو ہدایات دی گئیں - دراصل پہلی مشاورت ۳ رنومبر کو ہوئی -

۲ رنومبر کو ہز ہائینس سر آغا خاں نے مسلم نمائندگان کو رٹز ہوٹل میں کھانے پر بلایا - اور کھانے کے بعد مسلم نمائندگان کی پہلی مشاورت ہوئی - اس کے بعد یہ طریق متواتر جاری رہا - کہ ہفتہ میں ۳-۴ دفعہ رٹز ہوٹل میں سر آغا خاں کے کمرہ میں مسلمان نمائندگان کی مشاورت ہوتی تھی - اور جوں جوں مسائل کانفرنس میں یا کمیٹیوں میں یا دیگر نمائندگان کی مشاورتوں میں پیدا ہوتے تھے اُن کے متعلق مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ طے کرنے کے لئے یا صاف کرنے کے لئے فوراً ہز ہائینس کے کمرہ میں مشاورت قائم کی جاتی تھی - ایک موقعہ پر جب ہز ہائینس لندن سے عارضی طور پر کہیں باہر گئے ہوئے تھے سر محمد شفیع کے ہاں Kensington Palace Mansions میں مسلمان نمائندگان کی مشاورت ہوئی -

ان مشاورتوں میں ہر ایک نمائندہ نہایت آزادی اور بسط کے ساتھ

اپنا نقطۂ نظر پیش کرتا اور ہر مسئلہ پر خوب وضاحت سے بحث ہوتی۔
اور ہر موقعہ پر بحث کے بعد متفقہ طور پر کوئی نہ کوئی فیصلہ ہوجاتا۔ مسلمانانِ ہند کی سیاسی تاریخ میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ تمام ہندوستان کے مسلم نمائندگان کا ہر امر کے آخری فیصلہ میں اتفاق رائے رہا اور کسی امر کے آخری فیصلہ میں اختلاف نہیں ہوا۔ گو بعض دفعہ ایسا بیشک ہوتا تھا کہ بعض نمائندگان کو کسی فیصلہ پر شرح صدر یا اطمینان نہ ہو۔ لیکن کسی موقعہ پر بھی اس احساس نے اختلاف کی صورت اختیار نہیں کی۔ اور کام نہایت عمدگی سے سرانجام پاتا رہا۔

۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو کانفرنس کا افتتاح ملک معظم نے دارالامرا کے دیوانِ شاہی میں کیا۔ اس منظر کا صحیح نقشہ کھینچنے کے لئے (رافیل) جیسے نقاش کا برش یا میکالے جیسے صاحبِ تحریر کا قلم درکار ہے۔

مرکز میں ایک سنہری تخت نما کرسی پر حضور ملک معظم۔ اُن کے دائیں وزیراعظم۔ بائیں وزیر ہند۔ اور دونوں طرف دیگر وزرائے سلطنت۔ وزرائے سلطنت سے آگے دائیں طرف ایک نیم حلقہ کی شکل میں والیانِ ریاست اُن کے وزرا اور مشیر۔ باقی حلقہ میں برطانوی ہند کے نمائندگان جن میں پشاور سے لیکر شیلانگ اور الہ آباد سے لیکر راس کماری تک کے علاقوں کے نمائندگان شامل تھے۔ برما کے نمائندگان اپنے ملک کے خصوصی لباس میں موجود تھے۔ برطانوی پارلیمنٹ کی تینوں پارٹیوں کے نمائندگان حاضر تھے۔

یہ ایک ایسا اجتماع تھا جس کی نظیر گذشتہ تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ یورپ کے شمال مغرب میں ایک چھوٹے سے جزیرے میں رہنے والی قوم کم و بیش ڈیڑھ سو سال سے ایک مشرقی برّاعظم پر حکومت کرتی چلی آئی ہے۔ یہ برّاعظم خود ایک مجموعۂ اضداد ہونے کے لحاظ سے گویا باقی تمام دنیا کا نمونہ ہے۔ اس برّاعظم میں ہر رنگ۔ ہر نسل۔ ہر قوم۔ ہر مذہب کے لوگ بستے ہیں۔ رنگا رنگ کے لباس پہنتے اور طرح طرح کی زبانیں بولتے ہیں۔ باوجود ان تمام اختلافات کے اُن کے اندر آہستہ آہستہ ایک قومی روح پیدا ہوتی ہے۔ شاید یہ روح انہی احساسات اور جذبات کا عکس ہو جو اس مغربی قوم کے اس ملک میں آنے سے بیدار ہوئے ہیں۔ شاید یہ اس تعلیم کا نتیجہ ہو جو اس مغربی قوم نے اس ملک میں رائج کی ہے۔

بقول علامہ ڈاکٹر اقبال

مشرقی بادہ چشیدست زمینائے فرنگ
عجبے نیست اگر توبۂ دیرینہ شکست
فکرِ نوزادۂ او شیوۂ تدبیر آموخت
جوش زد خوں بہ رگِ بندۂ تقدیر پرست

لیکن یہ روح پیدا ہوئی بڑھی اور اس ملک کے رگ و ریشے میں سرایت کر گئی۔ اور اس ملک کی طرف سے یہ تقاضا شروع ہوا کہ ملک کی حکومت ملک کے لوگوں کے ہاتھ میں ہونی چاہئیے۔ اور یہ مطالبہ ایک ایسی قوم سے کیا گیا جس کی تمام تاریخ آزادی اور خود اختیاری کی داستان ہے اور جسے اس دعویٰ پر فخر ہے کہ ہم دنیا میں آزادی اور خود اختیاری قائم کرنے والی قوم ہیں۔ اب اس دعویٰ کے ثبوت کا وقت آ پہنچا۔ اس قوم کے مدبرین نے شروع ہی میں یہ جانچ لیا تھا کہ اس مشرقی ملک میں مغربی طریقۂ تعلیم جاری کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس ملک کے لوگ بھی مغربی طریقِ حکومت طلب کریں گے۔ لیکن اس وجہ سے وہ گھبرائے نہیں۔ لارڈ میکالے نے آج سے ایک صدی پیشتر دارالعوام میں اس امر کی تائید میں تقریر کرتے ہوئے صاف کہہ دیا تھا کہ ہندوستان کو مغربی طریق پر تعلیم دی جانی چاہئیے۔

"یہ ممکن ہے کہ مغربی طریق پر تعلیم حاصل کر کے ہندوستان کے لوگ مغربی طریق حکومت کا مطالبہ کریں۔ میں نہیں کہہ سکتا آیا کوئی دن ایسا آئیگا جب یہ مطالبہ کیا جائیگا۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اگر ایسا دن آئے تو وہ دن انگلستان کی تاریخ میں نہایت فخر کا دن ہوگا"۔

۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کا دن وہ دن تھا جب ہندوستان کی طرف سے کامل طور پر اور متفقہ طور پر دارالامرا کے ایوانِ شاہی میں برطانیہ کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا گیا۔ اور یہ دن بیشک ہندوستان اور انگلستان بلکہ دنیا کی تاریخ میں ایک یادگار اور قابل فخر دن ہوگا۔

کیا اور کہیں یہ نظیر مل سکتی ہے کہ ایک قوم نے ۳۲ کروڑ انسانوں پر سو سال سے زیادہ حکومت کی۔ انہیں تعلیم دی۔ ان کی تربیت کی اور جب ان کی طرف سے یہ تقاضا شروع ہوا کہ اب ہم خود اپنی حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ تو بغیر کسی قسم کی جسمانی جنگ کے ان کے نمائندگان کو دعوت دی کہ "آؤ اپنے مطالبات ہمیں سمجھاؤ۔ اپنا نقطۂ نظر ہم پر واضح کرو۔ ہماری مشکلات کا اندازہ کرو۔ آزادی سے اور برابری سے ہمارے ساتھ بیٹھ کر تبادلۂ خیالات کرو۔ اور ہم سب مل کر ایک آئین تیار کریں۔ جس سے تمہارے احساسات اور جذبات کا جائز تقاضا بھی پورا ہو۔ ملک میں امن بھی قائم رہے اور ہر قوم کو اس کے جائز حقوق دئے جائیں اور ان حقوق

کی حفاظت کا سامان کیا جائے تاکہ تمہارا ملک آئندہ بلا خوف و خطر شاہراہ ترقی پر گامزن ہو سکے۔ اور ہمارے تمہارے تعلقات آئندہ بجائے حاکم اور محکوم کے محبوں اور دوستوں کے سے ہوں۔ ہم تم مل کر ایک دوسرے کی مدد اور فائدہ کی راہیں سوچ سکیں اور تم اس عظیم الشان اجتماع اقوام میں جو برطانوی اجتماع کہلاتا ہے برابر کے حصہ دار بنو۔ اور دنیا میں امن صلح اور موالات کی ایک ایسی مثال قائم ہو جو دنیا نے پہلے کبھی نہیں دیکھی"۔ یہ تصور ہی کس قدر امنگیں دلوں میں پیدا کرنے والا تھا۔ اور یہ منظر کیسا خوشنما اور دلفریب تھا۔

بعض نے کہا یہ محض مصلحت ہے اس کا نتیجہ کچھ نہیں ہوگا۔ الفاظ ہیں مراد کچھ نہیں۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ فریب ہے دھوکہ ہے۔ اگر اس کا نتیجہ کچھ بھی نہ ہوتا تو بھی محض اس اصول کا تسلیم کر لیا جانا دنیا کے آئندہ امن کے لحاظ سے ایک بہت بڑی فتح ہے۔ کہ جب کسی محکوم قوم میں آزادی اور خود اختیاری کے جذبات پیدا ہو جائیں تو حاکم قوم کا فرض ہے کہ ان پر غور کرے اور محکوم قوم کے نمائندگان کے ساتھ مشورہ کر کے آئندہ طریق حکومت تجویز کرے۔ لیکن ہندوستان کے بعض مدبروں نے برطانیہ کی دعوت کو مخلصانہ دعوت تصور کر کے اسے قبول کیا اور ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو دارالامرا کے ایوانِ شاہی میں یہ مجلس قائم ہوئی اور ملک معظم نے خود اس کا افتتاح کیا۔

ملک معظم نے اس کانفرنس کی کارروائی کا افتتاح کرتے ہوئے جو تقریر کی اُس کا ہر لفظ محبت اور اخلاص کے جذبات میں ڈوبا ہوا تھا اور ہر فقرہ اُس تڑپ کا اظہار کرتا تھا جو اُن کے دل میں اپنی ہندوستانی رعایا کی فلاح اور بہبود کے متعلق موجود ہے۔ چنانچہ جس جس نے یہ تقریر سنی اُس کا دل بھی ویسے ہی اخلاص سے لبریز ہو گیا۔ حاضرین میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کی آنکھیں پُرنم نہ ہوں۔ اور اس یقین اور اطمینان کی روح ہر دل میں سرایت نہ کر گئی ہو کہ یہ کانفرنس ناکام نہیں ہوگی۔

غزل

میں نے مستقبل کو دیکھا تیری چتون دیکھ کر
کچھ نظر آیا نہ لیکن روئے روشن دیکھ کر

دوسروں سے پوچھتا ہوں اپنے مسکن کا پتہ
آ رہا ہوں حسن بے پروا کا مامن دیکھ کر

کیا قیامت ہے جنوں انگیزیٔ فصلِ بہار
دشت کی جانب چلا ہوں صحنِ گلشن دیکھ کر

کس سے ہے یارب مری تقدیر کی وابستگی
آسماں کو دیکھتا ہوں اُن کا دامن دیکھ کر

کہہ نہ دے تم کو کوئی دیکھو "پشیمان وفا"
منہ گریباں میں نہ ڈالو میرا دامن دیکھ کر

بزمِ عالم میں عجب حالت ہے مری اے وقار
دوستوں سے بدگماں ہوں دل کو دشمن دیکھ کر

وقار (انبالوی)

حُبِّ وطن

افراد

محمود۔ }
مجید۔ } فوجی افسر
راشد }

رشیدہ۔ .... محمود کی بیوی۔
انور۔ .... محمود کا بیٹا۔
خادمہ ....

منظرِ اوّل

(جنگی ڈیرے کا ایک شکستہ حال خیمہ۔ محمود اور مجید بیٹھے ہیں)

مجید۔ اِس آڑے وقت میں جبکہ ہر نئی ساعت حکومتِ ایران کو مزید خطروں میں ڈال رہی ہے۔ کسی افسر کا رخصت پر چلا جانا اُس کے دیوانہ پن کی دلیل ہے۔

محمود۔ تب تو میری دیوانگی مجھے گھر پہنچا ہی کر رہیگی۔ اور رخصت کے اختتام پر مجھے واپس آنے کے خیال سے بھی باز رکھیگی۔

مجید۔ ایسا کرنے پر تم فوجی مجرم گردانے جاؤ گے۔ اور تمہارے کورٹ مارشل کے لئے پروانۂ گرفتاری جاری کر دیا جائے گا۔

محمود۔ مجید! حکومت اِس وقت اِسقدر متزلزل ہو رہی ہے۔ کہ مفروروں کی گرفتاری پر صرف کرنے کے لئے اپنی باقیماندہ طاقت کو استعمال نہیں کر سکتی۔ اور اگر کوئی ایسا خطرہ ہو بھی، تب بھی مجھے ایک دفعہ کرمان پہنچ لینے دو۔ پھر حکومت کے فرشتے بھی میرا کھوج لگانے سے عاجز ہونگے۔

مجید۔ اِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم کی کمزوری کا احساس دِل میں رکھتے ہوئے بھی تم ایسی نازیبا حرکت کرنا چاہتے ہو۔ کیا اِسے بُزدلی نہیں کہا جا سکتا۔

محمود۔ بزدلی؟ تمہیں بزدلی کا ایک شائبہ بھی مجھ میں نہ ملیگا۔ کیا وہ دن بھول گئے۔ جب دشمن کی گولہ باری نے ہمارے کیمپ میں آگ لگا دی تھی۔ میرے سپاہیوں میں سے صرف دو زندہ رہ گئے تھے۔ اور مجھے مشین گن کی گولیوں کے مکس اٹھا کر جلتے ہوئے خیموں میں سے گزرنا پڑا تھا۔ میری ٹانگیں جھلس گئی تھیں۔ میرے ٹخنوں میں سے چربی رِسنے لگی تھی۔ لیکن مَیں نے اُف تک نہ کی تھی۔ بارہا مَیں چالیس چالیس گھنٹے بھوکا رہ کر لڑتا رہا۔ کمبخت روسیوں نے جب ہمارے مورچوں میں پانی بھر دیا تھا۔ مَیں اپنے فرائض کی انجام دہی میں عالمِ نزع تک پہنچ گیا تھا۔ بزدلی تو میرے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی۔

مجید۔ مَیں جانتا ہوں۔ کہ تمہاری شجاعت کے قصے جنوبی مشرقی ایران کے ہر سپاہی کی زبان پر ہیں۔ حکومت خود تمہیں کجکلاہی تمغہ دیکر اِس امر کا اعتراف کر چکی ہے۔ لیکن اِس بُرے وقت میں میدانِ جنگ کو چھوڑ کر چلے جانا صریح وطن دشمنی ہے۔ محمود! ایک انسان عمر بھر نیکیاں کرتا رہے۔ پھر بھی ایک گناہ۔ ایک نمایاں گناہ۔ اِن سب کے اجر کو نیست و نابود کر سکتا ہے۔ اگر تم اِس وقت یہاں سے چلے گئے۔ تو سب لوگ تمہاری بہادری اور وطن دوستی کے کارناموں کو بھول کر تمہیں ہمیشہ بُرے ناموں سے یاد کیا کریں گے۔

محمود۔ مَیں یہ سب کچھ سمجھتا ہوں، مگر مجھے میدانِ جنگ سے ایک نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ جو کبھی میرے دل سے نہیں نکل سکتی۔ شہری زندگی میں مَیں خوشحال تھا۔ فارغ البال تھا۔ میری جائیداد اور میرے باغات میرے مصرف کے لئے سرمایۂ فراہم کرنے میں ضرورت سے زیادہ تھے۔ جنگ شروع ہوئی۔ اور حبِ وطن کے جذبہ نے میرے دل میں جوش مارا۔ مَیں نے سپاہیانہ زندگی اختیار کر لی۔ اب دو برس گذر چکے ہیں۔ مصیبتوں کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ایک کان گولی سے اُڑ چکا ہے۔ بائیں ہاتھ کی سب انگلیاں بیکار ہو گئی ہیں۔ زہر آلود گیس نے میرے حلق اور پھیپھڑوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ کیا اِسی کو زندگی کہتے ہیں۔

مجید۔ کاش! تم میں تھوڑا بہت استقلال ہوتا۔

محمود۔ (بے خود ہو کر) وہ بھی دن تھے۔ جب میرے کان مصیبت کے لفظ سے ناآشنا تھے۔ کرمان میں میں دس عظیم الشان باغوں کا مالک تھا۔ میرے پچاسوں خادم تھے........ میری بیوی — آہ میری رشیدہ مجھے کسقدر عزیز تھی۔ اب دو برس سے میری آنکھیں اُس حسین پیکر کی تلاش میں ہیں۔ لیکن انہیں سوائے خون کی ندیوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اب میری آواز وہ خوش الحانی غائب ہے۔ جس سے میں اسے سعدی اور حافظ کے اشعار سُنایا کرتا تھا۔ اب وہ انگلیاں کٹ چکی ہیں، جن پر ساز کے نغموں کو ناز ہوا کرتا تھا۔

مجید۔ لیکن اب وطن کی محبت کا نور تمہاری رگ رگ میں چمکتا ہے۔ ہر وطن پرست آنکھ کے لئے تمہارا چہرہ پہلے کی نسبت بدرجہا حسین ہے۔ تمہاری رشیدہ ان کٹی ہوئی انگلیوں پر بوسہ دیکر خوش ہوا کریگی۔ تمہارے زخموں کے نشانات میں اسے ایران کی عظمت نظر آیا کریگی۔

محمود۔ نہیں! نہیں!! میرے ہاتھوں سے اُسے انسانی خون کی بُو آئیگی۔ میری آنکھوں میں اُسے اُن روسیوں کا خون نظر آئیگا۔ جنہیں میری بندوق اور میری سنگین اس دنیا سے رخصت کر چکی ہے۔ میرے ہاتھ ایک قاتل کے ہاتھ ہیں۔ اور میرا دل ایک جلاد کا دل۔

مجید۔ سنو محمود۔ (راشد داخل ہوتا ہے۔ اُسے دیکھکر وہ گفتگو کا موضوع تبدیل کرنا چاہتے ہیں) کہو راشد مورچوں سے کوئی خبر آئی۔

محمود۔ (بات کاٹکر) آئی ہوگی خبر کہ پانچسو غازی شہید ہو گئے۔ کچھ گولیوں سے کچھ گیس سے اور کچھ سنگینوں سے۔ سوائے اس کے اور رکھا کیا ہے۔

راشد۔ وہاں سے تو ابھی تک کوئی اطلاع نہیں آئی۔ تم کہو کیا بحث تھی۔ کچھ تو میں خیمے سے کان لگا کر..........

مجید۔ ہیں!!

محمود۔ تو ہوا کیا؟ سنئے صاحب بحث یہ ہے۔ کہ میری طبیعت جنگ سے اکتا گئی ہے۔ اور میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔

راشد۔ کیسی باتیں کرتے ہو؟ مجید سچ کہتا تھا۔ کہ تم بزدل ہو؟

محمود۔ بزدلی نہیں۔ بلکہ انسانی ہمدردی کا جذبہ مجھے میدانِ جنگ... چھوڑنے پر مجبور کرتا ہے۔ میں انسانوں کو، چلتے پھرتے انسانوں کو، گوشت پوست اور خون کے بنے ہوئے انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کٹتے نہیں دیکھ سکتا۔

راشد۔ تو کیا انسانی ہمدردی اور جنگ دو مختلف چیزیں ہیں۔ محمود۔ تمہارے دلائل کسقدر بعید از قیاس ہوتے ہیں۔ بھائی جنگ محبت ہے۔ اور محبت جنگ دونو ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں۔ تم یہاں لڑتے ہو تو وطن کی محبت کے لئے۔ اگر وہ محبت تمہارے دل میں نہ ہوتی۔ تو یوں میدانِ جنگ میں پڑے ہوئے نظر نہ آتے۔ جنگ تمہاری محبت کی انتہا کا ثبوت ہے۔

محمود۔ راشد تم شہری زندگی میں شاعر تھے نا۔ جبھی ایسی وحشیانہ باتیں کرتے ہو۔ جنگ اور ایشیائی شاعری دونو زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہیں۔

راشد۔ اگر اُس زمانہ میں یہ دونوں چیزیں موجود تھیں تو اُن لوگوں کی زندگی پر ہمیں رشک کرنا چاہئے۔ شعر اگر عبادتِ حسن ہے۔ تو جنگِ وطن کی پرستش۔ آتشِ رقابت کو ایک وحشیانہ جذبہ کہنے سے پیشتر سوچو کہ اس کا ماخذ الفت ہے۔ محبت ہے۔ وہی الفت جو تمہیں اور تمہاری رشیدہ کو ایک دوسرے سے وابستہ کئے ہوئے تھے۔

محمود۔ بس صاحب بس۔ یہ رفعتِ تخیل تمہیں کو مبارک ہو۔ میں باز آیا ایسا فلسفہ سننے سے۔

دوسرا منظر

(کرمان میں محمود کے گھر کا ایک کمرہ)

(محمود داخل ہوتا ہے)

خادمہ۔ (اُچک کر) کون ہو تم........... او ہو! آقا۔ آقا۔ معاف کیجئیگا، میں نے پہچانا نہیں۔ کیا آپ کا دستہ واپس آ گیا۔

محمود۔ نہیں۔ میں چند دن کی رخصت پر آیا ہوں۔

خادمہ۔ سُنا تھا۔ افواج میں آجکل رخصت بہت مشکل سے ملتی ہے۔

محمود۔ تمہیں اس سے کیا مطلب۔ رشیدہ کہاں ہے؟ انور کدھر ہے؟

خادمہ۔ بیگم دن بھر کام پر ہوتی ہیں — عموماً بہت شام گئے آیا کرتی ہیں۔ بس اب آنے والی ہی ہونگی۔ انور میاں......

محمود۔ کام؟ کیسا کام؟ کیا باغات اُجڑ گئے؟

خادمہ۔ نہیں تو۔ باغوں نے تو اس سال اتنا پھل دیا ہے کہ شہر بھر حیران ہے۔ لیکن بیگم نے آپ کے جانے کے بعد اُن کی تمام

آمدنی سررشتہ جنگ کے حق میں وقف کر دی تھی۔ اپنے زیورات اور جمع شدہ سرمایہ بیگم نے فوجی ہسپتال کو دے دیا تھا۔ خود اب اسلحہ خانہ میں ناظم بارود سازی کی خدمت سرانجام دے رہی ہیں۔ اُن کی وطن دوستی کا چرچا کرمان کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ انور میاں بھی اسلحہ خانہ ہی میں کام کرتے ہیں۔

محمود۔ ہیں! یہ سب کچھ اُس نے مجھ سے اجازت لئے بغیر کیوں کیا؟

خادمہ۔ میاں میں تو کہتی تھی کہ میاں ناراض ہونگے۔ لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ سمجھا کہ بڑھیا بکواس کرتی ہے۔ بھلا ہماری باتوں کو کون سنتا ہے۔

(رشیدہ داخل ہوتی ہے)

محمود۔ (سب کچھ بھولکر خوشی میں) رشیدہ!

رشیدہ۔ محمود!!

(دونو بغلگیر ہوتے ہیں اور پھر پاس پاس بیٹھ جاتے ہیں)

رشیدہ۔ محمود تم یہ سنکر کسقدر خوش ہوگے کہ انور نے مشین گن میں لگانے کا ایک برقی پہیہ ایجاد کیا ہے۔ جس سے گولیوں کی رفتار ۲۰۰ فی منٹ تک کی جا سکتی ہے۔ طہران کے صناعوں نے بھی اس ایجاد کو بہت سراہا ہے۔ اور جو مشینیں اب زیر تعمیر ہیں وہ تمہارے بیٹے کی ایجاد سے مزیّن کی جارہی ہیں۔

محمود۔ اچھا تو انسانی خون بہانے کے لئے ایک اور لعنت کا اضافہ ہوا۔

رشیدہ۔ کیا مطلب؟ یہ تو بتاؤ کہ تمہیں رخصت کیونکر مل گئی۔

محمود۔ رخصت۔ میں تو میدانِ جنگ کو خیرباد کہہ آیا ہوں۔

رشیدہ۔ کیا کہا؟

محمود۔ میری زندگی دوبھر ہو رہی تھی۔ خونی نظاروں نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا۔۔۔۔ میں اب واپس نہیں جاؤنگا۔

رشیدہ۔ محمود! ۔۔۔۔۔۔۔۔ بزدل ۔۔۔۔۔۔۔

محمود۔ میں انسانی خون کو پانی کی طرح بہتے ہوئے نہ دیکھ سکتا تھا۔ ۔۔۔۔۔۔۔ مرتے ہوئے سپاہیوں کی چیخوں نے ۔۔۔۔۔۔

رشیدہ۔ غدار ۔۔۔۔۔۔۔ دغاباز ۔۔۔۔۔۔ کیا اب میں ایک غدار کی بیوی کہلاؤنگی ۔۔۔۔۔۔۔ فوراً چلے جاؤ میرے مکان سے۔

محمود۔ رشیدہ میں تمہارا خاوند ہوں، اور اس گھر کا مالک۔

رشیدہ۔ اگر تم اس گھر کو اپنے وجود سے ضرور ہی ناپاک کرنا چاہتے ہو تو یہ لو پستول لو۔ اور میرا خاتمہ کر دو۔ میری آنکھیں ایک غدار کو نہیں دیکھ سکتیں۔ جلدی کرو ورنہ میں خود ۔۔۔۔۔۔

محمود۔ (عاجزی سے) رشیدہ میں مصیبت کا مارا انسان ۔۔۔۔۔

رشیدہ۔ بس! بس! میں ایسی باتیں نہیں سننا چاہتی۔

محمود۔ رشیدہ! مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔ میں ایک آرزوؤں اور تمناؤں سے بھرا ہوا دل لے کر آیا تھا۔ میں میدانِ جنگ کی زندگی سے تنگ آکر آرام کی تلاش میں تم تک پہنچا تھا۔ کاش تم مجھ سے کوئی بہتر برتاؤ کرتیں۔

رشیدہ۔ جس شخص نے وطن سی عزیز چیز کو دھوکا دیا ہے۔ وہ مجھے بھی دھوکا دے سکتا ہے۔

(محمود کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں)

محمود۔ اچھا۔ خدا حافظ! (رشیدہ کے ہاتھ پر بوسہ دیکر باہر چلا جاتا ہے)

خادمہ۔ جب میاں آئے تھے۔ میں تو جب ہی تاڑ گئی تھی۔ کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے۔ بیگم! ہماری باتوں کو بھلا کون سنتا ہے۔

رشیدہ۔ تمہیں اس سے مطلب؟ خبردار اگر میاں کے خلاف کوئی اور لفظ منہ سے نکالا ۔۔۔۔۔

(پردہ گر کر فوراً اٹھتا ہے)

(دس روز کے بعد وہی کمرہ۔ رشیدہ اور انور بیٹھے ہیں)

رشیدہ۔ دیکھو دروازے پر کون دستک دے رہا ہے۔

(باہر سے) اخبار والا بیگم۔

رشیدہ۔ جاؤ انور اخبار لے آؤ۔

(انور جاتا ہے اور ورق گردانی کرتے ہوئے واپس آتا ہے)

رشیدہ۔ کیا کوئی خاص خبر ہے؟

انور۔ دیکھ رہا ہوں۔ (پڑھتے ہوئے) بندر عباس کے کیمپ میں آگ لگ گئی!!

رشیدہ۔ ہیں!!

انور۔ غنیم کے ایک آتشیں گولے سے بندر عباس کے کیمپ میں آگ لگ گئی۔ بڑھتے ہوئے شعلوں کا بارود خانہ تک پہنچ جانیکا احتمال تھا۔ لیکن لفٹیننٹ محمود کرمانی، جن کے

تعلیمِ جدید

(۲)

برطانیہ میں ابتدائی تعلیم کی اصلاح

گذشتہ صدی کے برطانوی اسکول گذشتہ صدی کے آخر میں مغربی ممالک میں بھی اسی قسم کے اسکول تھے ۔ جیسے آجکل ہمارے ملک میں کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں ۔ ان کی خصوصیت ہمرنگی و یکسانی تھی ۔ علاقہ کی آب و ہوا گرم ہو یا سرد، خشک ہو یا تر ۔ اسکول کا نقشہ یکساں تھا ۔ کمرے یکساں ہوتے تھے ۔ لڑکے بڑے ہوں یا چھوٹے، ڈسک سبھی یکساں ۔ ڈسک پر بچوّں کی نشست کا طریق بھی یکساں ہوتا تھا ۔ شاگرد ذہین ہو یا غبی، ہوشیار ہو یا کمزور سب کا سبق ایک ہی ہوتا ۔ سب کو سخت تاکید کی جاتی کہ چپ چاپ بیٹھیں ۔ سبقوں کو خاموشی سے سنیں مدرس کے احکام کی فوراً بے چون و چرا تعمیل کریں ۔ بولیں تو پوچھ کر ۔ ہلیں تو اجازت لیکر ۔ چلیں تو باقاعدہ قطاروں میں ۔ قدم اٹھائیں تو "لفٹ رائٹ" کے حکم پر ۔ سب اسکولوں کے نصابِ تعلیم یکساں ۔ کتابیں یکساں ۔ امتحان یکساں ۔ حتیٰ کہ استادوں کی پیشانیوں پر تیوری یکساں ۔ اور شاگردوں کی بے زبانی و زرد روئی یکساں ہوا کرتی تھی ۔ اگر کسی وجہ سے اِس یکسانی میں بال بھر بھی فرق آجاتا، تو مانیٹر، مدرس ۔ میجر اور انسپکٹر سب بیٹھ کر اِس بے ضابطگی کا رونا روتے ۔ زبان بندی اِن مدارس کا آئین تھا، اور سکون و جمود اُن کا خاصہ ۔ اُن میں تدریس کا ذریعہ معلم کی زبان تھی یا کھریا مٹی کے نشان یا ایسی کتابیں جنہیں پڑھ کر بچے کتاب کے نام تک سے بیزار ہو جاتے تھے ۔ طالب علموں کا کام یہ تھا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھیں ۔ ہمہ تن گوش بن جائیں ۔ جو پڑھیں یا سنیں اُسے اندھا دھند یاد کریں ۔ بچے بیچارے اپنی فطرت سے مجبور، اِس ہمہ گیر سکوت و سکون کی حالت کو بہت دیر تک نبھا نہیں سکتے تھے ۔ اِس لئے اُستاد اپنی تمامتر کوشش اُنہیں چُپ کرانے یا متوجہ کرنے میں صرف کرتے رہتے تھے ۔ جب تھک کر ہار جاتے، تو علم کی رغبت دلاتے اور تعلیم کا شوق دوبالا کرنے کی خاطر پہلے دھمکی گھُرکی ۔ پھر دھول دھپہ ۔ اور آخر کار بید سے کام لیتے تھے ۔ اِسی وجہ سے اسکول کا نام سُن کر معصوم بچوّں کی رُوح فنا ہوتی تھی ۔ مدرسے جاتے تو روتے دھوتے ۔ وہاں رہتے تھے تو جبراً و قہراً ۔ اور چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی ہنستے کھیلتے ۔ ناچتے کودتے ۔ اِس زندانِ بے زنجیر سے نِکل بھاگتے تھے ۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد بھول کر بھی اسکول یا کتاب کا نام نہیں لیتے تھے ۔

اِس قید و جبر رٹوانے اور زبانی یاد کرانے کا باعث تو ابتدائی مدارس میں طلبہ کی کثرت ۔ استادوں کی قلت، تعلیم کی عمومیت اور اخراجاتِ تعلیم میں کفایت کا شوق تھا ۔ لیکن اِن باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ طفلِ مکتب، لڑکا ہو یا لڑکی ۔ شہری ہو یا دیہاتی ۔ ذکی ہو یا غبی ۔ قوی ہو یا کمزور صحیح البدن ہو یا مریض سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا گیا ۔ معلم، منتظم، حتیٰ کہ والدین بھی تعلیم کا حقیقی مقصد بھول بیٹھے ۔ اور اسکول ایسی مشینیں بن گئے جن میں داخل ہو کر سب بچے ایک ہی تعلیمی سانچے میں ڈھالے جائیں اور پھر امتحان کی چکی میں پس کر سالانہ ترقی کی چھلنی میں گذار دئے جائیں ۔ جو گذر جاتے وہ عموماً آزادانہ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کو کھو بیٹھتے ۔ اور جو رہ جاتے اُن کے دل میں اپنی ناکامی اور نالائقی کا ایسا یقین ہو جاتا ۔ کہ کسی کام پر ہاتھ ڈالنے سے جھجکتے تھے ۔ اِس کے علاوہ سب کی صحت پر نہایت مضر اثر پڑتا تھا ۔

نظامِ تعلیم اور تعلیمی ضروریات میں مغائرت یوں تو قاعدے کی بات ہے کہ تہذیبِ انسانی کی پیشقدمی اور نوعِ انسانی کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے باعث نصابِ تعلیم

رفتہ رفتہ بچّوں کو آئندہ زندگی کے لئے تیار کرنے میں قاصر رہ جاتا ہے۔
لیکن مروجہ درسگاہوں کے جبری اور خارجی ضبط اور آئین زبان بندی و دستور، سکون پسندی اور شیوۂ امتحان پرستی نے انہیں بچّوں کی فطری ضروریات سے بھی بیگانہ کر دیا۔ یعنی ابتدائی مدارس کے نظامِ تعلیم اور قوم کی حقیقی تعلیمی ضروریات میں دو صورتوں میں اختلاف رونپذیر ہو گیا۔ ایک طرف قومی تہذیب اور نصاب تعلیم میں روز افزوں تفاوت نظر آنے لگا۔ اور دوسری جانب بچّوں کی فطری ضروریات اور اسکولوں کے نظام میں مغائرت ظاہر ہونے لگی۔ اِن حالات میں عجب نہ تھا کہ تعلیم جدید کے حامی مروجہ درسگاہوں کے طریقۂ تدریس اور نصاب تعلیم سے دل برداشتہ ہو کر بے اطمینانی کا اظہار کرنے لگیں۔ اور ہر طرف سے اُنہیں ملک کے تمدن اور ملکی بچّوں کی فطرت کو ایک دوسرے کے مطابق بنانے کی تجاویز پیش ہونے لگیں۔

نظامِ تعلیم میں اصلاح کا خیال

چنانچہ ایک جوشیلے انگریز معلم نے ان پُرزور الفاظ میں اصلاح مدارس کی ضرورت کو پیش کیا۔
"ایک مدت سے نظامِ تعلیم میں نشوو ارتقا مفقود ہو گیا ہے۔ اور جمود و بے حسی واقع ہو رہی ہے۔ اب تعلیم کا نظام، تعلیمی نہیں رہا۔ اس لئے جزوی تبدیلیوں سے اس کی اصلاح کی توقع رکھنا بے سود ہے۔ اب تو ایک ہیجانِ عظیم کی ضرورت ہے۔" امریکہ کے ایک ماہر تعلیم نے اسی ضرورت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔
"مروجہ درسگاہیں ہماری اولاد کی صحت کو برباد کر رہی ہیں۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ ان کی تندرستی کو برقرار رکھنے کی پوری پوری کوشش کریں۔"
"چونکہ ہمارے اسکول شاگردوں کی جسمانی، دماغی اور روحانی ترقی کو روکتے ہیں، اس لئے ہم سب کو مل کر کوشش کرنا چاہئے کہ ان کی ترقی بدرجہ کمال ہو سکے۔"
"چونکہ ہمارے اسکولوں میں اب تک ترغیب و تحریص درغبت و شوق دلانے) کا واحد ذریعہ باہمی مقابلہ ہے۔ جس سے بچّوں کے دل میں مخالفت۔ عداوت۔ حسد اور بے اعتمادی کا بیج بو یا جاتا ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ ہم شدومد کے ساتھ انہیں اشتراک عمل اور تعاون اور امداد باہمی کی خوبیاں جتائیں تاکہ ابھی سے ہر فرد کے دل میں مدد کا شوق جاگزیں ہو جائے۔
"چونکہ اسکول نے بے جا طور پر دماغی کام کا رتبہ بہت بڑھا دیا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم سے جس طرح بن آئے بچّوں کو محنت جسمانی کی عادت ڈالیں اور دستکاری سکھائیں ...."

اسی قسم کے خیالات کا اظہار جابجا ہونے لگا، لیکن ایک مدت تک استادوں کی قدامت پسندی کی وجہ سے نظامِ تعلیم یا طریقۂ تدریس میں کوئی انقلاب واقع نہ ہوا۔ امتحانوں کے سلسلے نے مروجہ تعلیم کو اصلاح کی بڑھتی ہوئی رو سے بچانے میں سدِ سکندری کا کام دیا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ سب کی توجہ بچّوں کی قدرتی ضروریات کی طرف منعطف ہو گئی۔

تعلیمی نقطۂ نظر میں تبدیلی

اور آخر کار تعلیم کا نقطۂ نظر ہی بدل گیا۔ چنانچہ بیسویں صدی عیسوی کے شروع میں یورپ اور امریکہ کے ماہرانِ تعلیم نے فلسفۂ خودی سے متاثر ہو کر سب بچّوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنے اور یکساں تعلیم دینے کے خیال کو ترک کر دیا اور اس کی بجائے تعلیم کا حقیقی مقصد بچّے کی شخصیت کی تربیت اور ہر فرد کے جوہر ذاتی کو جلا دینا خیال کرنے لگے۔ بچّے کے ذاتی شوق اور اُس کی طبیعت کے رجحان کو نظامِ تعلیم کا مرکز گردانتے ہیں۔ اور ضبط (ڈسپلن) کی بجائے آزادی کو تربیت کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔

تبدیلی پر مدرسین کے دو فرقے

اس نئے نظریے نے مدرسین کو دو فرقوں میں منقسم کر دیا ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو بچّوں کو سوسائٹی کی ضروریات کے لئے تیار کرنا تعلیم کا مقصد سمجھتے ہیں۔ دوسرا فرقہ فلسفۂ خودی کے دلدادگان کا ہے۔ اُن کے خیال میں بچّوں کی کامل نشوونما ہی تعلیم کا صحیح مدعا ہے۔
جنگِ عالمگیر کے بعد سے انسانی زندگی کے باقی شعبوں کی طرح تعلیم کے میدان میں بھی خود اور جماعت کے حقوق کا باہم مقابلہ ہے۔ اکثر استاد تو جماعت کو فوقیت دیتے ہیں اور تعلیم کو بالغوں کی ضروریات کے مطابق بنانے اور ضبطِ خارجی کے حق میں ہیں، لیکن ایک خاصی تعداد ایسے جدت پسندوں کی بھی پائی جاتی ہے۔ جو نظامِ تعلیم کا مرکز اسکول کے بچّے کو قرار دیتے ہیں اور اس کی بچپنے کی زندگی سے تعلیم کا مسالہ اور تربیت کے طریق ڈھونڈھ رہے ہیں۔ اُنہیں "مقررہ مضامین یاد کرا دینے" کے طریق سے سخت عداوت ہے۔ اور اظہارِ شخصیت (Self expression) کو تعلیم کا واحد مقصد گردانتے ہیں۔ تعلیم جدید کے ان علم برداروں کے اثر سے مدرسین کی توجہ مضامینِ درسی کی بجائے متعلمین کی طرف پھر گئی ہے۔ پہلے اسکول کا مقصد مختلف مضامین کی تدریس سمجھا جاتا تھا۔ اب بچّوں کی تربیت۔ اگر پہلے مدرسہ گہوارۂ علم تھا تو اب گہوارۂ طفل ہے۔ جہاں سب سے زیادہ اس بات کا خیال ہوتا تھا

کہ جغرافیہ ریاضی یا انگریزی کس طرح پڑھائی جائے ۔ یا کس طریق سے مقررہ کورس کو سال کے اندر ختم کیا جائے ۔ ہاں اب ان امور کی طرف زیادہ توجہ کی جانے لگی ۔ کہ زید یا عمرو یا بکر کا جسمانی نشوونما اور ذہنی ارتقا ٹھیک طرح پر ہو رہا ہے یا نہیں ۔ ہر بچے کو اپنے حسب حال ترقی اور پیش قدمی کرنے کا موقع ملتا ہے یا نہیں ؟ آیا بچوں کے عیوب ونقائص کی اصلاح ہو سکتی ہے اور ہو رہی ہے یا نہیں ؟ ان کی موجودہ زندگی بچپن کی دلچسپیوں سے لبریز ہے کہ نہیں ؟ وغیرہ وغیرہ ۔

ایک اہم سوال

ایک اور اہم سوال بھی زیر بحث ہے کہ تعلیم کا مطمح نظر کیا ہونا چاہئے ؟ فرد کی تربیت یا جمہور کی خدمت ؟ دنیا کے ہر متمدن ملک میں ماہرین تعلیم اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں کہ ان دونوں متضاد مقصدوں کو کس طریق اور کون سے تناسب سے باہم ترکیب دی جائے ۔ اور پھر کس طرح عملی جامہ پہنایا جائے ۔ امریکہ میں ایک نسخہ تجویز ہوتا ہے تو انگلستان میں دوسرا ۔ حال ہی میں برطانیہ عظمیٰ کی وزارت تعلیم کی مجلس مشاورت نے سہ سالہ تحقیقات کے بعد اس مسئلہ پر ایک مبسوط رپورٹ شائع کی ہے جو ابتدائی تعلیم کے نظام اور طرز تدریس میں ایک عظیم الشان انقلاب کا پیش خیمہ ہے ۔

ماہرین تعلیم کی تحقیقاتی کمیٹی

۱۹۲۸ء میں وزارت تعلیم برطانیہ نے ماہرین تعلیم کی تحقیقاتی کمیٹی اس غرض سے مقرر کی تھی کہ سات برس سے گیارہ برس تک کے بچوں کے لئے موزوں نصاب تعلیم تجویز کرے جس میں دیہات کے بچوں کی ضروریات کا خاص خیال رکھا جائے ۔ اس کمیٹی نے انگلینڈ سکاٹلینڈ، ویلز اور امریکہ کے مشہور ماہرین تعلیم ۔ مدبرین ۔ علم النفس (سائیکالوجی) کے جاننے والوں اور ڈاکٹروں وغیرہ سے تجویزیں ۔ رائیں اور معلومات حاصل کرکے اپنی رپورٹ اسی فروری میں شائع کی ہے ۔ شروع میں جزائر برطانیہ کی ابتدائی تعلیم کی تاریخ دیکر قومی تعلیم کا مقصد ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۔

"ہم اس امر کا دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم نے کوئی حیرت انگیز باتیں دریافت کی ہیں یا کوئی انوکھے اصول قائم کئے ہیں ۔ مسئلہ اصل میں نہایت سادہ ہے اور وہ اسی قدر ہے کہ قوم کے لئے لازم ہے کہ تمام ملک کے بچوں کے لئے وہی کچھ چاہے جو عاقل اور شفیق ماں باپ اپنے بچوں کے لئے چاہتے ہیں ۔"

اگرچہ ان الفاظ سے قدامت پسند مدبرین کو یک گونہ تسلی ہوتی ہے لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ کمیٹی کے خیال میں ابتدائی تعلیم کے مروجہ طریقے سب کے سب ایسے ہیں جنہیں "عاقل وشفیق والدین" پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں ۔ چنانچہ رپورٹ میں جابجا موجودہ پرائمری اسکولوں اور اُن کے نظام کے نقائص بیان کئے گئے ہیں ۔ مثلاً شروع میں لکھا ہے کہ "جسطرح ثانوی (سیکنڈری) تعلیم کی کامیابی اس بات پر منحصر ہے کہ گیارہ سال سے بڑی عمر کے زمانے (دور رُشد) کو بچپن کا جداگانہ حصہ قرار دیا جائے ۔ اسی طرح ابتدائی تعلیم کے حقیقی مقصد اور مفاد کے لئے ضروری ہے کہ سات اور گیارہ سال کی عمروں کے درمیان کے زمانہ کی جداگانہ اہمیت کو صحیح طور پر سمجھا جائے ۔

پرائمری اسکول ابجد خوانوں کا مکتب اور ثانوی مکتب (سیکنڈری سکول) کا درمیانی وقفہ نہیں ۔ بلکہ اس تعلیمی زنجیر کی درمیانی کڑی ہے ۔ اسی لئے اسے دونوں کے ساتھ ملا دینا چاہئے ۔ پرائمری اسکول کی خوبی کا معیار نہ تو کسی امتحان کا نصاب ہے اور نہ ثانوی مکاتب کی ضروریات اور نہ آئندہ زندگی کے مشاغل کی تیاری بلکہ وہ کسوٹی جس پر ابتدائی تعلیم کے کسی پہلو یا کسی جزو کو صحیح طور پر پرکھا جا سکتا ہے ۔ وہ اسی سکول کے اپنے بچوں کی ضروریات ہیں ۔ پرائمری اسکول کا مسئلہ یہ نہیں کہ آج جو بچے ابتدائی مکتب میں تعلیم پا رہے ہیں اُنہیں مستقبل میں بڑے ہو کر کیا بن جانا چاہئے ؟ بلکہ یہ ہے کہ فی الحال وہ کیسے ہیں ؟

ابتدائی تعلیم کا مقصد

" ابتدائی تعلیم کا اوّلین مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ایام طفولیت میں بچوں کو تندرست اور حتی الامکان خوش وخرم رہنے میں مدد دی جائے ۔ اور اُن کی نشوونما اس طریق پر ہو کہ جسم تنومند اور دماغ تروتازہ رہیں تاکہ بڑے ہو کر وہ علم وہنر جو کشمکش حیات کے لئے ضروری ہوں آسانی سے حاصل کر سکیں ۔" اس لئے "پرائمری اسکول کے نصاب کی بنیاد تو ابجد خوانوں کے مکتب میں رکھی چاہئے ۔ اور اس کے ترتیب دینے میں اول سے آخر تک یہ امر پیش نظر ہے ۔ کہ طلبہ کے لئے ایسے مشاغل مہیا کئے جائیں جو ان کے بچپن میں بہترین جسمانی ۔ دماغی اور اخلاقی نشوونما کے لئے ضروری ہوں ۔"

اس کے بعد عہد طفولیت (بچپن) کے ان چار سال کی جسمانی اور دماغی خصوصیات اور ارتقا پر نہایت شرح وبسط سے بحث کی ہے ۔ سات سے گیارہ سال کی عمر تک ایسا زمانہ ہے جس میں پہلے

سات سال کی جسمانی کمزوریوں کے اثرات کی اصلاح کرنی چاہیئے تاکہ اس کے بعد کے عہدِ بلوغ کی سریع جسمانی تبدیلیوں اور تیز نشو و نما کے قابل ہو جائیں۔ یہی وقت بچوں کی ذہانت اور دماغی قابلیت کو جانچنے کا ہے تاکہ تعلیم کے مواد۔ طریق تدریس اور رفتار کو ہر بچے کے حسب حال بنالیا جائے۔ لازم ہے کہ اس عمر میں دماغ پر زیادہ دباؤ ڈالنے کی بجائے کھیل کود گانے ناٹک کرنے تصویریں بنانے اور دستکاری کا شوق دلایا جائے۔ اور بچوں کو موقعہ دیا جائے۔ کہ اپنے دلی خیالات و احساسات کو قول اور فعل اور عمل کا جامہ پہنائیں، قوتِ تخیل کو ترقی دینے۔ احساسات کی تربیت کرنے اور مل کر کام کرنے کی عادت ڈالنے کا بھی یہی وقت ہے۔

"پرائمری اسکول میں ماحول (آس پاس) کے اثرات کے مقابلہ میں رسمی تعلیم اور باقاعدہ اسباق چنداں اہمیت نہیں رکھتے"

نصاب کی بنیاد بچوں کی زندگی۔ اُن کی بڑھتی ہوئی طاقتوں اور نئی چیزوں کے دیکھنے سمجھنے اور برتنے کی فطری خواہش اور بچپن کی دلچسپیوں پر رکھنی چاہیئے۔ نوشت و خواند و حساب "تعلیم کے اوزار" اور اُن کی مشق ضروری ہے البتہ ابتدائی تعلیم کے نصاب کو علیحدہ علیحدہ مضامین کا مجموعہ سمجھنے کی بجائے بہتر ہے۔ کہ اس کا مقصد بچوں کے شوق کو بڑھانا اور اُن کے مشاغل کو ترقی دینا ہو۔ ساتھ ہی طلبہ کے آرام اور آسائش کا پورا پورا اہتمام کیا جائے۔

طریقہ امتحان میں تبدیلی کی ضرورت

"ابتدائی مدارس کی علتِ غائی (اصلی غرض) اور اُن کے نصاب کو کسی قسم کے خارجی یا داخلی امتحان کے زیر اثر منقلب (تبدیل) نہیں ہونے دینا چاہیئے" بلکہ امتحان کے طریقوں میں ترمیم کر دینی چاہیئے۔ ہر بچے کی تعلیمی حالت کا اندازہ کرتے وقت مادری زبان اور حساب کے سوا تحریری امتحان کی ضرورت نہیں۔ اِس کے متعلق "استادوں کی رائے اور اس بچے کی رائے اور اس بچے کے ریکارڈ کو بہت زیادہ اہمیت دینا چاہیئے" بایں ہمہ کسی اسکول کی کامیابی اور خوبی کا معیار ایسے امتحانوں کو ہرگز نہیں ٹھہرانا چاہیئے جو وظائف کیلئے انتخاب کرنے کی غرض سے لیئے جائیں"

رپورٹ کی تمام سفارشوں کا مدعا یہ ہے کہ پرائمری اسکول کے مقصد کو توسیع دیکر تمدنِ حاضرہ سے مطابقت دی جائے۔ اسکول میڈیکل سروس کے ذریعہ بچوں کی جسمانی بہتری کا خیال رکھا جائے۔ اور انہیں عملی کام کرنے اور خوش کن مشغلوں میں حصہ لینے کے زیادہ موقعے دیے جائیں۔ ان کا نصاب سبقوں اور مضمونوں کا مجموعہ نہ ہو، جنہیں یاد کرنا پڑے بلکہ نئے اور دلچسپ مشغلے اور تجربے مہیا کرنے کا ذریعہ ہو۔ طلبہ سے کورانہ اطاعت اور فرمانبرداری کی کم توقع کی جائے بلکہ ہمدردی اور مل کر کام کرنے کی عادت ڈالنے اور قوتِ تخیل و تصور کو ترقی دینے کی کوشش کی جائے۔

مختصر یہ کہ "مکتب اور زندگی میں ضد اور مغائرت نہ رہے۔ بلکہ مکتب کا کام یہی ہو کہ بچپن کی زندگی کی کمیوں کو پورا کرے اور حیاتِ قوم و حیات بالغانہ کی تشریح اور تفہیم کی طرح ڈال دے۔" ع

بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا

پروفیسر جمال الدین احمد

(ملتان کالج)

اعلیٰ شعر وہ ہے کہ جب پڑھا جائے تو سامعین بے اختیار کہہ اُٹھیں۔ کہ سچ کہا۔
(زہیر ابن ابی سلمہ)

جب شعر پڑھا جائے تو اس کی سلاست اور سادگی سے ہر شخص کو یہ طمع پیدا ہو کہ ایسا میں بھی کہہ سکتا ہوں۔ لیکن جب کہنے کا قصد کرے تو ادنے اور اوسط کا تو کیا ذکر ہے معجز بیان بھی عاجز آجائیں۔ (ابن رشیق)

بہترین شعر وہ ہے جس کے معنی لفظوں سے پہلے ذہن نشین ہو جائیں۔ (اصمعی)

وہ خیال جو ایک غیر معمولی اور نرالی طور پر لفظوں کے ذریعے اس طرح ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اُس کو سُنکر خوش یا متاثر ہو شعر ہے۔
(حالی)

کیجیے، تو اس زمانہ میں جب کہ قوتِ تشکیل کا احساس پختہ ہو چکا تھا، یہ نظر آئیگا کہ طرزِ تعبیر کے ہر جزوی پہلو میں انتخاب، صحتِ ذوق اور حسنِ تناسب سے کام لیا گیا ہے۔ اور عجب طرح کا اطمینان اور بے تکلفی ٹپکتی ہے۔ اس زمانہ میں ہر جگہ تکمیل کے روشن نمونے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ٹیشین کی تصویریں، اس کے بعد ڈرسیڈن کی عمارتیں، واٹو کی تصویروں اور موزارٹ کی موسیقی میں وہ نزاکت اور باریکی نظر آتی ہے جو اکتوبر کے آخری دنوں کی دلکشی سے مشابہ ہے۔ آخر کار تمدن کے بڑھاپے میں جو شروع ہو رہا ہے، روح کی آگ بجھ جاتی ہے۔ گھٹتی ہوئی قوت پھر ایک بار جرأت کرتی ہے کہ قدیم تمدن کو زندہ کرے (اس کی مثالیں ہر تمدن میں ملتی ہیں) اور کوئی بڑا کارنامہ دکھائے لیکن اس میں اسے بہت محدود کامیابی ہوتی ہے۔ روح نہایت حسرت کے ساتھ اپنے بچپن کا زمانہ یاد کرتی ہے۔ اور آخر کار وہ تھک کر اور ہار کر لطف زلیست کھو دیتی ہے۔ اور (جس طرح قیاصرہ روم کے زمانہ میں ہوا تھا) یہ آرزو کرتی ہے کہ ہزار سال کی روشنی کے بعد پھر اسی روح اولیٰ کی باطنی پُراسرار زندگی میں آغوشِ مادر میں یعنی قبر میں واپس جائے۔ یہی احیائے مذہبیت کا عمل تھا جس نے یونانی تمدن کے آخری زمانہ میں آسیٹیس متھراس کے پرستاروں کو پیدا کیا۔ یہ وہ مذاہب تھے جن کے ذریعہ سے کسی زمانہ میں مشرق کی ایک نوخیز روح یعنی مصری تمدن نے اپنے احساس تنہائی کا خواب آسا اور پُرخوف اظہار کرایا تھا۔ اور جس نے اُن میں ایک نئی معنویت پیدا کر دی تھی۔

(اوسوالڈ اسپینگلر)

عربی

دماغ اور قلب کی تفریق بے معنی ہے۔ دونوں کا الگ الگ وجود بے حقیقت ہے۔ دونوں کا اتحاد انسان کو انسان بناتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ محبت محض دل میں ہوتی ہے۔ محبت دل اور دماغ دونوں پر چھا جاتی ہے۔ آہ محبت! یہ کیا چیز ہے۔ کیا ذہنی ردِ عمل یا دماغی تصادم کا نام محبت نہیں! تصادم اور ردِ عمل کا نتیجہ ہیجان اور اضطرار ہوتا ہے۔ پھر کیا ہم کسی ہنگامی یا اضطراری جذبہ پر قابو پانے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ کوئی ہنگامی جذبہ بر وقت فرو ہو سکتا ہے۔ اسی طرح جذبہ محبت بھی مفقود ہو سکتا ہے۔ اسے ثبات نہیں۔ پھر میں اپنی محبوبہ سے کس طرح وعدہ کروں کہ میں تجھ سے ہمیشہ محبت کروں گا۔ وعدہ تو اس بات کے لئے کیا جاتا ہے۔ جس کے کرنے پر انسان قادر ہو۔ مگر جب جذبۂ محبت کو دوام نہیں اور مجھے اس پر قابو نہیں تو میں وعدہ کس طرح کر لوں۔ یہ بے ایمانی ہو گی!

(دورِ حاضر کا مصری شاعر خلاقی)

سنسکرت

آنند! آنند! آنند

ہیہات! میں ہنوز ایک عام طالب علمانہ حالت میں ہوں۔ جسے اپنی تکمیل نفس کے لئے ابھی بہت سے مدارج طے کرنے باقی ہیں۔ اور میرا محترم اور محبوب آقا کوسِ رحلت بجا رہا ہے۔ بس بس آنند! اس اضطراب واضطرار اور شور وشیون کے کیا معنی؟ کیا میں نے تم لوگوں کو اس سے قبل بے شمار موقعوں پر اُس ناموس فطرت سے روشناس نہیں کیا ہے۔ کہ جو چیزیں ایک دوسرے سے بیحد عزیز ہوتی ہیں۔ ان کے لئے جدائی مقدر ہو چکی ہے۔ پس میرے معاملہ میں یہ اٹل قانون کیونکر معطل ہو سکتا ہے؟ میرے لئے اس کلیہ مطلقہ میں کوئی آشنا تلاش نہیں کیا جا سکتا! آنند! عرصۂ دراز تک تم میرے ساتھ اس طرح وابستۂ محبت والفت رہے جس کی کوئی حد نہیں۔ مدت مدید تک اے آنند تم نے مجھ پر اپنی مہربانیاں اور احسانات صرف کئے ہیں۔ اور میرے ساتھ ایک انتہائی قربت ومحبت کا رشتہ پیدا کر لیا ہے۔ وہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا! تمہاری زندگی قابلِ داد ہے۔ آنند! اب اپنی مخلصانہ اور صادقانہ جدوجہد کو اسی طرح

جاری رکھو۔ اور مستقبل قریب میں تم بھی میری طرح تمام مکروہات ہستی یعنی شہوتِ نفس وغیرہ اور تمام سیئات وجود یعنی انفرادیت و شخصیت اور فریب نظر جہالت وغیرہ سے نجات پا جاؤ گے۔

(مہاتما بودھ۔ کتاب وصالِ مقدس)

روسی

انسانی سپرٹ کی تاریخیاں

جنوبی امریکہ کے باشندوں میں ایک روایت مشہور ہے۔ وہ کہتے ہیں خدا نے انسانوں کو پہلے پہل ایسا بنایا کہ انہیں کام کی حاجت ہی نہ ہوتی تھی۔ نہ اُنہیں گھر کی ضرورت تھی۔ نہ کپڑے کی نہ خوراک کی۔ سو برس کی عمر تک وہ جیا کرتے تھے۔ اور بیماری تو وہ جانتے ہی نہیں تھے کیا چیز ہوتی ہے۔

تھوڑی مدت بعد خدا نے جو توجہ کی اور دیکھنا چاہا کہ لوگ کیونکر زندگی بسر کر رہے ہیں تو اُس نے دیکھا اپنی زندگی اطمینان اور مسرت میں کاٹنے کی بجائے انہوں نے ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور ہر شخص کے خوش ہونے کی وجہ سے معاملات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ بجائے زندگی سے خوش ہونے کے وہ اب اس پر لعنت بھیجتے تھے۔

پھر خدا نے سوچا یہ ان کے الگ الگ ہر ایک کے اپنے اپنے مطلب کے لئے زندہ رہنے کا نتیجہ ہے۔ اور اس صورت حالات کو بدلنے کے لئے خدا نے ایسا انتظام کر دیا۔ کہ ہر ایک کے لئے ناممکن ہو گیا کہ بغیر کام کئے زندگی بسر کرے۔ بھوک اور سردی سے بچنے کے لئے اب ان کے واسطے لازمی ہو گیا کہ گھر تعمیر کریں۔ اور زمین کھودیں اور اناج کاشت کریں اور انہیں چُنا کریں۔

خدا کا خیال تھا، کام ان میں اتفاق پیدا کرے گا۔ ایک دوسرے کی مدد کے بغیر نہ تو یہ کوئی اوزار بنا سکیں گے۔ نہ شہتیروں کو تیار کر کے کہیں لیجا سکینگے نہ گھر بنا سکیں گے۔ نہ فصل بو یا کاٹ سکیں گے، نہ اپنے کپڑا بُن یا سی سکیں گے۔ اسی طریقہ سے وہ سمجھ جائیں گے کہ جتنا خلوص دل سے کام کریں اتنا کما سکتے ہیں۔ اور اتنی ہی بہتر اُن کی زندگی بسر ہو سکتی ہے۔ اس سے ان میں اتفاق پیدا ہوگا۔

ایک زمانہ اسی حالت میں گذر گیا اور پھر خدا دیکھنے آیا کہ لوگ کس طرح رہتے ہیں۔ اور خوش ہیں یا نہیں۔

لیکن اب ان کی حالت پہلے سے بھی بُری تھی۔ کام تو وہ مل کر کرتے تھے کیونکہ سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا، لیکن سارے مل کر نہیں، بلکہ چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر، اور ہر ٹولی یہی چاہتی تھی کہ دوسری ٹولی سے کام چھین لے اور وہ ایک دوسرے کی راہ میں حائل ہوتے تھے۔ اور اپنی طاقت اور اپنا وقت لڑائی جھگڑوں میں کھو دیتے تھے۔ اور سب کی حالت بُری تھی۔

خدا نے جب یہ دیکھا کہ یہ حالت بھی ٹھیک نہیں تو اس نے ایسا انتظام کرنے کا فیصلہ کیا کہ انسان کو اپنی موت کا وقت کبھی معلوم نہ ہو۔ اور وہ اچانک ہی مر جایا کرے۔ اور اس نے یہ فیصلہ انسانوں کو سنا دیا — خدا کا خیال تھا کہ ہر شخص جب سمجھیگا کہ موت مجھے اچانک آئیگی تو یہ چند روزہ نفع نقصان کی خاطر اپنی اس زندگی کو جو اُن کے حصّہ میں آئی ہے۔ برباد نہیں کریں گے۔ لیکن ایسا کبھی نہ ہونے پایا۔ (لیو ٹالسٹائے)

(مولوی احمد عبد اللہ صاحب ارشد نے مرکنٹایل پریس ریلوے روڈ لاہور میں چھپواکر دفتر ادبی دنیا واقع کشمیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا)

رجسٹرڈ ...... ایل نمبر ۲۴۸۲

فہرست مضامین

جلد ۴ | بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۳۱ء | نمبر ۵

تصاویر :- (۱) فردوس شباب (سہ رنگی) (۲) لارڈ اروِن۔ لارڈ ولنگڈن یک رنگی (۳) مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مناظر۔ (۴) معصوم (۵) ادبی دنیا کے سفری نمائندے۔ (۶) حسن اور موسیقی۔

حال و قال

ادبی دُنیا کا سالنامہ

مدت سے "ادبی دنیا" کے خریدار سالنامہ کے متعلق دریافت کر رہے ہیں۔ گذشتہ سال عابد صاحب نے سالنامہ کی اشاعت کا اعلان بھی کر دیا تھا، مگر ناساز گار حالات کے سبب یہ تجویز قوۃ سے فعل میں نہ آسکی۔ اِس مرتبہ میرا اسٹاف بھی مصر ہو رہا ہے کہ سالنامہ ضرور شائع کیا جائے۔ میں ذاتی طور پر خاص نمبر شائع کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ کیونکہ بے شمار روپیہ اِس نمائش پر برباد ہو جاتا ہے۔ لیکن فضائی اثرات کے مقابلے میں ذاتی رائے کو کوئی وزن دینا قدرت سے مقابلہ کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ اِس لئے تن بہ تقدیر سالنامہ کی اشاعت کا ارادہ کر لیا ہے۔ خدا راست لائے۔

صرف خریداروں کیلئے

پہلے اعلان میں خریداروں کے لئے سالنامہ کی رعائتی قیمت غالباً سوا روپیہ تجویز کی گئی تھی۔ کیونکہ اُس وقت جو تخمینہ ہوا تھا اُس کے مطابق سالنامہ کے ہر پرچے پر سوا روپیہ لاگت آتی تھی۔ لیکن نئی تجویز کے مطابق پونے دو روپے ہر پرچے پر لاگت آئیگی۔ اور اِس کے ساتھ یہ بات طے پائی ہے کہ ہر خریدار کو سالنامہ مفت پیش کیا جائے۔ خریدار کے سوا اَور کسی کو سالنامہ کا کوئی پرچہ کسی قیمت پر بھی نہ مل سکیگا۔

سالنامہ کی خصوصیات

اِس سالنامے کے لئے مشہور اہلِ قلم سے جو مضامین لکھوائے جائیں گے۔ اُن کا معاوضہ پانسو روپیہ تجویز ہوا ہے۔

سالنامہ میں تین سو روپے کے تین انعامی مضامین

سو سو روپے کے حسب ذیل تین انعامی مقابلے ہونگے:-

(۱) سب سے بہتر افسانہ، سَو روپیہ انعام۔

(۲) اردو زبان کی تاریخ پر سب سے بہتر مضمون کے لئے سَو روپیہ انعام۔

(۳) سب سے بہتر ظریفانہ مضمون پر سَو روپیہ انعام۔

شرائط انعام

(۱) ہر مقابلے کے لئے کم از کم دس مضامین جمع ہونے ضروری ہیں۔

(۲) مقابلے میں وہی مضامین لئے جائیں گے۔ جو معیاری طور پر بلند ہوں۔

(۳) کوئی مضمون دس صفحے سے زیادہ نہ ہونا چاہیئے۔

انعامات کا فیصلہ کرنے والے حضرات

(۱) آنریبل جسٹس سر عبد القادر۔

(۲) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفیؔ دہلوی۔

(۳) خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب ایم-اے آئی-ای-ایس۔

خدائے تعالیٰ کی مدد شاملِ حال رہی تو ادبی دنیا کا یہ سالنامہ اپنے رنگ کا اکیلا ہوگا۔ ماہ دسمبر ۱۹۳۱ء کی آخری تاریخوں میں شائع ہوگا۔

سالنامہ

ڈیلر بکسٹالوں، ایجنسیوں کو یہ سالنامہ نہیں بھیجا جائے گا۔ نہ اُن لوگوں کو مل سکیگا جو صرف سالنامہ خریدنا چاہیں گے۔ بلکہ ادبی دنیا کے صرف اُن خریداروں کو مفت بھیجا جائیگا جو چار روپیہ بارہ آنہ ادا کر کے سال بھر کے لئے خریدار بنے ہیں۔ اور کسی کو کسی قیمت پر بھی نہیں ملیگا۔

ادبی دنیا کی جدید ترتیب

میری شروع سے یہ خواہش رہی ہے کہ زندگی کے ہر ضروری شعبے کے متعلق ادبی دنیا اپنے قارئین کو باخبر رکھے۔ مستقل طور پر ادبی دنیا کو مطالعہ میں رکھنے والے حضرات اِس امر کی شہادت دے سکتے ہیں کہ میں رسالہ کو ہمیشہ سے خوب تر بنانے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں۔ پچھلے پرچے میں میں نے عرض کیا تھا کہ میں ادبی دنیا کو زیادہ دلچسپ اور مفید بنانے کے متعلق غور و فکر کر رہا ہوں۔ چنانچہ اِس نمبر میں آپ مزید عنوانات مطالعہ کریں گے۔ سینما۔ حفظانِ صحت۔ نسوانی دنیا۔ اخبار علمیہ۔ سائنس کی دنیا۔ اِن اہم عنوانات کے تحت میں مشرقی و مغربی ادبیات سے چھان پھٹک کر کے تازہ اور مفید مضامین حاصل کرنے کا مستقل طور پر انتظام کیا گیا ہے۔

"سینما" کو میں بحیثیت ایک مشرقی استاد کے مفید نہیں سمجھتا، بلکہ مضر خیال کرتا ہوں۔ لیکن ہماری جدید معاشرت میں سینما زندگی کا ایک ضروری عنصر بن

رہا ہے۔ اور چونکہ ترقی یافتہ آزاد ممالک میں سنیما مفید تحریکات کو کامیاب بنانے میں مفید ثابت ہو رہا ہے۔ اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کو بھی زندگی اور تہذیب کے نئے سانچے میں ڈھالنے میں سنیما سے مدد ملیگی۔ اس لئے یہ سمجھے بغیر کہ یہ زہر طلبہ اور نوجوانوں کے لئے تریاق کیونکر بن جائیگا رائے عامہ کے سامنے سرخم کرتا ہوں۔

"نسوانی دنیا": ادبی دنیا کو تعلیم یافتہ مردوں کی طرح تعلیم یافتہ خواتین بھی اپنے مطالعے میں رکھنا ضروری سمجھتی ہیں، وہ اپنے تعلیمی تناسب سے زیادہ اس کی خریدار ہیں۔ بعض خواتین کو شکایت تھی کہ عالم نسواں کے متعلق ادبی دنیا میں کوئی مضمون نہیں ہوتا۔ اُن کے اس مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے "نسوانی دنیا" کے نام سے اس نمبر سے مستقل عنوان قائم کیا جاتا ہے۔

اس عنوان کے تحت میں دنیا بھر کی نسوانی ترقیات۔ نسوانی تحریکات اور نسوانی حالات کے متعلق ہر نمبر میں ایک سیر حاصل مضمون شائع کیا جایا کریگا۔ مضمون نویس خواتین سے گذارش ہے کہ وہ بھی اس عنوان کو مفید اور دلچسپ بنانے میں ادارہ کا ہاتھ بٹائیں۔

"حفظانِ صحت": گذشتہ سال میں نے قارئین ادبی دنیا سے ادبی دنیا کی ترتیبِ مضامین کے متعلق جو مشورہ لیا تھا۔ اُس کے جواب میں بہت سے خریداروں نے حفظانِ صحت کا عنوان قائم کرنے کی بھی صلاح دی تھی اِس نمبر سے یہ ضروری عنوان بھی قائم کر دیا گیا ہے۔ اِس عنوان کے تحت میں میں طبی انکشافات کی بجائے صحت اور زندگی کو باقی رکھنے والے اصول اور عملی تدابیر کے متعلق مضامین شائع کیا کرونگا۔ تاکہ روزمرہ کی زندگی میں ضروریاتِ صحت سے قارئین ادبی دنیا واقف رہیں۔

"اخبارِ علمیہ": علمی خبریں پہلے آئینہ عالم کے تحت میں درج ہوا کرتی تھیں لیکن اب میں نے اِن کے لئے اخبارِ علمیہ کی ایک الگ سُرخی تجویز کر دی ہے۔ آئندہ ایجادات، انکشافات، اور علوم و فنون کی روز افزوں ترقی کے متعلق تمام خبریں اخبارِ علمیہ کے تحت میں شائع ہوا کریں گی، اور آئینہ عالم کے تحت میں زیادہ تر سیاسیاتِ عالم پر ایک فلسفیانہ تبصرہ ہوا کرے گا۔ تاکہ قارئین کرام دنیا کی پولیٹیکل رفتار سے آگاہ رہیں۔ اور یہ باخبری انہیں عملی سیاسیات میں کامیاب بنانے کی کفیل ہو۔ گویا آئینہ عالم کے تحت میں سیاسیات کی تعلیم دی جائے گی۔

"سائنس کی دنیا": اِس وقت دنیا پر سائنس کی حکومت ہے۔ مگر ادبی دنیا اب تک اِس حکومت کے تسلط سے آزاد تھا۔ اِس نمبر سے سائنس کی دنیا کے عنوان کا افتتاح کیا جاتا ہے۔ اب ادبی دنیا کے ہر نمبر میں سائنس کی تازہ ترین ترقیوں اور سائنس دانوں کے آخری انکشافات کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا کریگا۔

جدید عنوانات

میرا ارادہ ہے کہ مذکورہ بالا سرخیوں کے علاوہ ادبی دنیا میں آئندہ آثارِ قدیمہ، مشاہیرِ عالم۔ اور جدید الفاظ کے تین عنوانات اور قائم کئے جائیں "آثارِ قدیمہ" میں زیادہ تر مشرقی اور ہندوستانی آثارِ قدیمہ کے متعلق ہر نمبر میں ایک مختصر مگر پُر معلومات مضمون شائع ہوا کرے اور "مشاہیرِ عالم" کے تحت میں دنیا کے اُن خود ساز لوگوں کے حالات شائع کئے جایا کریں، جو اپنی کوشش و جدوجہد کے ذریعہ خاک سے اُٹھ کر افلاک تک پہنچے۔ اِن لوگوں کے حالات پڑھ کر ہندوستانی نوجوانوں میں بھی جذبۂ عمل پیدا ہوگا۔

"جدید الفاظ" کی سُرخی کے تحت میں انگریزی کے مشکل الفاظ کے لئے اردو الفاظ تجویز کر کے شائع کئے جایا کریں۔ اِس سے انگریزی والوں کو اردو ترجمہ میں آسانی ہوگی۔ اور اِس عنوان سے بے شمار طلبہ، اساتذہ۔ اخبارات و دفاتر سرکاری کے مترجمین اور عام جدید تعلیم یافتہ حضرات مستفید ہوں گے۔

میں نے اپنے اہلِ قلم احباب کی ایک مجلس "مجلس علمیہ" کے نام سے اسی غرض کے لئے قائم کی ہے۔ کہ اُس میں انگریزی الفاظ پیش کر کے بحث و تمحیص کے بعد اُن کے مقابلے میں اردو الفاظ تجویز کئے جائیں اور "جدید الفاظ" کی سُرخی کے تحت میں یہ مجوزہ الفاظ شائع کئے جایا کریں۔

اِن اہم اور مفید عنوانات کے تحت میں جو مضامین شائع ہوں گے، میری کوشش یہ ہوگی کہ وہ مختصر ہوں، ہر عنوان کے لئے ایک صفحہ بہت موزوں اور دو صفحے جائز سمجھے جائیں گے۔

میں نے چند اہلِ قلم کی عزیز مصروفیتوں میں سے کچھ حصہ ادبی دنیا کے لئے حاصل کر لیا ہے۔ اسٹاف کے علاوہ یہ حضرات بھی ادبی دنیا کی جدید ترتیب کو دلچسپ بنانے میں میرا ہاتھ بٹائیں گے۔

اِس گراں قدر علمی امداد کو حاصل کرنے کے لئے زرکاری نہیں بلکہ زرپاشی کی ضرورت تھی اور اُس کا میں نے انتظام کر لیا ہے۔

اِس سلسلے میں دیگر اہلِ قلم سے بھی مؤدبانہ گذارش ہے کہ ادبی دنیا کے لئے مضمون تحریر فرماتے ہوئے اُن کے مقررہ عنوانوں کو بھی پیشِ نظر رکھ لیا کریں تو مجھے بڑی سہولت ہو جائیگی۔ نیز "سوال و جواب" "تنقیدِ شعری" "تصحیح الفاظ" "اہم تحقیق" وغیرہ عنوانات جو ہر بار

مجھے لکھنے پڑتے ہیں اور اِس سِلسلے میں کاتب کے تقاضے مجھے قرضخواہوں کے تقاضوں سے بھی زیادہ تلخ محسوس ہوتے ہیں - مَیں چاہتا ہوں کہ جو حضرات ادبی دنیا کے مقررہ عنوانوں میں سے کسی عنوان سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ مہینے میں گھنٹہ آدھ گھنٹہ اُس عنوان کی خانہ پوری کے لئے صرف کر کے میری ادارتی ذمہ داریوں کو باہم تقسیم کر لیں -

ادبی دنیا کی موجودہ حیثیت

ادبی دنیا کی موجودہ ظاہری صورت و معنوی حیثیت کو دیکھ کر اکثر اہل الرائے نے یہ رائے قائم کی ہے کہ "اس وقت ادبی دنیا اپنے رنگ کا ہندوستان بھر میں اکیلا پرچہ ہے -"

اِس کے محترم نگراں آنریبل جسٹس سر عبدالقادر ادبی دنیا کی موجودہ شان سے بہت مطمئن ہیں - ہز ایکسیلینسی گورنر پنجاب ادبی دنیا کو خاص طور سے پسند فرماتے ہیں - اُنہوں نے ایڈیٹر ادبی دنیا سے اِس کی امداد کا وعدہ فرمایا ہے -

آنریبل سر شہاب الدین پریزیڈنٹ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے الفاظ ہیں "ادبی دنیا کی رفتارِ ترقی معاصرین کے لئے باعثِ رشک ہو سکتی ہے - یہ اردو ادب کا ایک معیاری رسالہ ہے، اردو میں ایسا بلندپایہ رسالہ آج تک شائع نہیں ہوا -" (رائے سر شہاب الدین)

معزز معاصر ٹریبون اِس کی چوتھی جلد کے آغاز پر اظہار رائے کرتا ہوا لکھتا ہے :-

"ادبی دنیا کے اجرا سے ملک نے جو توقعات قائم کی تھیں ادبی دنیا نے اُنہیں پورا کر دیا ہے -"

ادبی دنیا کے متعلق ژرف نگر حضرات کی یہ قابلِ فخر رائیں دیکھ کر میرے دل میں یہ آرزو ایک طوفان کی صورت میں پیدا ہوتی ہے کہ ادبی دنیا کو ہر حیثیت سے یورپ کے میگزینوں کے نہ سہی مصر کے مجلات کا ہمسر تو بنا ہی دیا جائے - مَیں اِس کوشش کے لئے اپنا تمام وقت اور دماغ وقف کئے ہوئے ہوں - اور اِس پہلو میں حضرات "اہلِ نظر" کی قدر افزائی و ہمت افروزی کا دست نگر ہوں -

چھٹی رسالوں کی لوٹ

دوسرے رسالوں کی طرح ادبی دنیا بھی چھٹی رسانوں کے ذوقِ ادبی کا شکار ہوتا رہا ہے - ہماری مسلسل شکایات کے جواب میں پوسٹ ماسٹر جنرل نے دفتر کو اطلاع دی ہے - کہ اپریل کا پرچہ خریداروں کو باحتیاط پہنچا دیا گیا - اِس کے باوجود اب تک ستر سے زیادہ اپریل کا پرچہ نہ پہنچنے کی شکائیتیں دفتر میں موصول ہو چکی ہیں - خریدار جنہیں کوئی پرچہ نہ پہنچے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ دفتر والوں نے بھیجا ہی نہ ہوگا - یہ اُن کی بدگمانی بے جا ہے - دفتر میں اشاعتی ڈاک کے دن سارے کلرک اور خود راقم الحروف صبح سے شام تک رجسٹر خریداران سے چٹوں کے پتے ملاتے ہیں - اور احتیاط سے ڈاک خانے بھجواتے ہیں - ڈاک خانے میں سب پوسٹ ماسٹر تمام پرچوں کی پرتال کر کے دفتر کو پرچوں کی تعداد سے اطلاع دیتے ہیں اور یقینی طور پر لاہور سے تمام پرچے صحیح و سالم روانہ کر دئے جاتے ہیں - راستے میں کچھ تو "ریلوے میل سروس" والے اور زیادہ تر مقامی ڈاک خانہ والے پرچوں کو اِدھر اُدھر کر دیتے ہیں - اور خریداروں کی گالیاں ہمارے حصے میں آتی ہیں -

ہم تمام شکایات پوسٹ ماسٹر جنرل کو بھیجتے رہتے ہیں - خریداروں کو چاہیئے کہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک جب رسالہ نہ پہنچے تو اپنے ڈاکخانے والوں سے پوچھیں اور پھر دفتر کو لکھیں چھٹی رسانوں کو کان کھول کر آگاہ کر دیں کہ پرچہ اِدھر اُدھر ہوا تو تمہاری خیریت نہیں -

بعض جگہ خریداروں کی شکایتوں سے معلوم ہوا کہ چھٹی رسان شہر کے کسی دوسرے پڑھے لکھے آدمی سے دو چار پیسے لے کر پرچہ اصل خریدار کی بجائے اُسے تقسیم کر دیتے ہیں - محکمانہ تحقیقات ہو رہی ہے - اور ایسے چھٹی رسانوں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا -

حضرات خریداران، ڈاکخانوں چھٹی رسانوں کے علاوہ اپنے بے تکلف دوستوں پر بھی نگرانی رکھیں -

مجھے ذاتی طور پر دس پرچے ضائع ہونے کا اتنا رنج نہیں ہوتا جس قدر صدمہ کسی خریدار کو پرچہ نہ پہنچنے کی شکایت پڑھ کر ہوتا ہے -

دفتر ادبی دنیا کی مسلسل شکائتوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب پہلے کی بہ نسبت پرچہ نہ ملنے کی شکائتیں کم ہو گئی ہیں - مَیں نے ارادہ کر لیا ہے کہ پوسٹ آفس والوں کی دست و برد ختم نہ ہوئی تو مَیں ڈاک کے محکمے پر ایک آئینی مقدمہ دائر کرونگا -

ادبی دنیا کی ایجنسیاں

ایجنٹ حضرات کے غیر معقول رویہ کو پیش نظر رکھ کر دفتر والوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ صرف اُنہیں ایجنسیوں کو پرچہ بھیجا جائیگا جو مطلوبہ پرچوں کی قیمت پیشگی بھیج دیا - اپریل کا پرچہ اسی لئے ایجنسیوں کو نہیں بھیجا

گیا۔ آئندہ جس ایجنٹ کو جتنے پرچے منگانے ہوں اپنا کمیشن منہا کرکے باقی قیمت اُن پرچوں کی دفتر کو روانہ کردے۔ اور جن مقامات کی ایجنسیوں پر ادبی دنیا نہ ملے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اُس ایجنسی کے غیر تاجرانہ برتاؤ سے تنگ آکر دفتر والوں نے پرچہ روک لیا ہے۔

ایجنٹ حضرات یہ بھی نوٹ کریں کہ دفتر غیر فروخت شدہ پرچوں کو واپس نہیں لیگا۔

تاجور

آئندہ نمبر کے بعض اہم مضامین

اگلے نمبر سے دیوان غالب کی شرح کا ایک سلسلہ شروع کیا جائے گا۔ مولوی سید مقبول حسین صاحب بی۔ اے احمد پوری کے تنقیدی مضامین اکثر اردو رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اِن مضامین کو عام و خاص طبقوں میں یکساں دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ ہماری درخواست پر سید صاحب نے دیوان غالب کی شرح کا سلسلہ اپنے مخصوص انداز میں شروع کیا ہے۔ اس مفید سلسلے سے اسکولوں اور کالجوں کے اُن طلبہ کے علاوہ جن کا اختیاری مضمون اردو ہے۔ عام ارمغان دار اردو خوان حضرات بھی جو مرزا غالب مرحوم سے عقیدت رکھتے ہیں مستفید ہوں گے۔

اگلے نمبر میں امریکہ کے ایک بلند پایہ افسانہ نگار کا ایک نہایت دلچسپ افسانہ جو اُس کا شاہکار ہے۔ شائع کیا جائے گا۔ اس افسانہ کو اس دعوےٰ کے ثبوت میں پیش کیا جائیگا کہ عُریاں طرزِ نگارش کے بغیر بھی ایک ماہرِ فن افسانہ کو کسقدر دلچسپ اور پُر اثر بنا سکتا ہے۔ سارے افسانے میں محبت یا عشق کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا گیا لیکن اس کے باوجود افسانے میں جذبات کا ایک تلاطم برپا ہے۔

آئندہ نمبر میں جناب حسن عزیز جاوید کا بھی ایک نہایت دلچسپ افسانہ ہدیۂ ناظرین ہوگا۔ اس افسانہ میں نہایت لطیف و اثر آفریں پیرایہ میں ایک منچلے نوجوان کی گمشدگی کے عجیب و غریب حالات بیان کئے گئے ہیں جس نے بجائے اس کے کہ ملک کی سودیشی تحریک میں شامل ہونے کے بعد مادرِ وطن کو کوئی فائدہ پہنچاتا، انارکسٹوں کی جماعت میں شامل ہوکر قزاقی اور غارتگری کا نفرت انگیز مشغلہ اختیار کر رکھا تھا۔ طرزِ بیان ایسا دلنشیں ہے کہ ناظرین اس کی داد دئے بغیر نہ رہیں گے۔

جناب ظفر قریشی دہلوی کا نام ناظرین ادبی دنیا کے لئے تعارف کا محتاج نہیں۔ آئندہ نمبر میں آپ کا ایک نہایت دلچسپ افسانہ شائع کیا جائے گا۔ اس میں ایک سارق کے حیرت انگیز ہتکنڈے دکھلائے گئے ہیں۔ اور پھر اسی سلسلہ میں یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ترقی و تمدن کے موجودہ دور میں جاسوسی کا فن کس معراجِ کمال کو پہنچ چکا ہے۔ اِن کے علاوہ دیگر مضامین بھی نہایت دلچسپ اور قابلِ قدر ہیں اور یقین ہے کہ جون کا پرچہ خاص طور پر بہترین مقالہ نگاری کا نمونہ ہوگا۔ اور ناظرین کرام اس کا مطالعہ کرکے نہایت محظوظ ہوں گے۔

ادارہ

آئینۂ عالم

پنجاب میں مختلف کانفرنسوں کے اجلاس

پچھلے مہینے ایسٹر کی تعطیلات میں پنجاب سکھ ایجوکیشنل کانفرنس، پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور پنجاب ٹیچرز کانفرنس کے اجلاس علی الترتیب امرتسر، منٹگمری، اور راولپنڈی میں منعقد ہوئے۔

سکھ ایجوکیشنل کانفرنس

سکھ ایجوکیشنل کانفرنس میں دو اہم تجویزیں منظور ہوئیں۔ پہلی یہ تھی کہ خالصہ کالج امرتسر کو خالصہ یونیورسٹی کے درجہ تک ترقی دیجائے۔ دوسری یہ تھی کہ پنجابی زبان کو پنجاب میں سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ پہلی تجویز کے متعلق ابھی سے عمل سرگرمیاں شروع ہو گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں دہلی کے ایک متمول سکھ ٹھیکیدار نے اپنی سال بھر کی آمدنی جو قریباً ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ ہوتی ہے۔ قوم کی خدمت میں پیش کر دی ہے۔ ہم اپنے سکھ بھائیوں کو اس کانفرنس کی کامیابی، اُن کی اولوالعزمی اور عملی سرگرمیوں پر مبارکباد دیتے ہیں۔

پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں بہت سی پرانی تجاویز کو یاد دہانی کا رنگ دے کر منظور کیا گیا۔ ان کے علاوہ بہت سے نئے ریزولیوشن بھی پاس ہوئے۔ مگر اس ساری کانفرنس میں اردو زبان کے متعلق رسمی طور پر بھی کسی نے ایک لفظ زبان سے نہ نکالا۔ ہمیں پنجابی یا گورمکھی زبان سے خدانخواستہ کوئی عناد نہیں ہے، بلکہ ہم چاہتے ہیں، کہ ہندوستان کی تمام زبانیں ترقی کریں اور ہر ہندوستانی کے دل میں ملک کی ہر زبان سے ہمدردی اور دلچسپی ہو اور اس کو ترقی دینے کا جذبہ پیدا ہو لیکن اس کے ساتھ ہی ملک کی ہمہ گیر زبان ہونے کے لحاظ سے اردو کو ترقی دینے کا ولولہ بھی موجزن رہنا چاہیئے۔ اور اس خواہش میں ہندو، مسلمان سکھ کا کوئی امتیاز نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اردو زبان ہندوستان کی مختلف قوموں، فرقوں اور جماعتوں کے میل جول اور اتحاد کی ایک یادگار ہے لیکن حیف ہے اُن مسلمانوں پر جو ہندوؤں سے لڑنے کے لئے تو تعزیہ۔ پیپل اور اردو کے الفاظ کو اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں لیکن عملی طور پر اردو کی جانب سے ناقابل معافی تغافل برت رہے ہیں۔ پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس اب کئی سال سے اردو تذکرہ سے خالی نظر آتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس کانفرنس کے سیکرٹری ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب اردو زبان سے کسی قسم کی کوئی دلچسپی و ہمدردی نہیں رکھتے۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی میں رہ کر اردو کے ساتھ غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کئے رکھا ہے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کی تعلیمی اور ملی خدمات کا پوری طرح احترام کرتے ہوئے اُن کے اس غیر ہمدردانہ رویہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ جو آپ نے اردو کے متعلق اختیار کر رکھا ہے۔

پنجاب ٹیچرز کانفرنس

پنجاب ٹیچرز کانفرنس کا اجلاس ملک کے ماہر تعلیم جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد سی۔ آئی۔ ای کے زیر صدارت راولپنڈی میں منعقد ہوا۔ بہت سے ماہرین تعلیم اور اساتذہ اس کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوئے اور بہت سی مفید اور ضروری تجاویز منظور ہوئیں۔ ہم اس اجلاس کی کامیابی پر اس کے سرگرم کار سیکرٹری اور اس کے دوسرے اولوالعزم کارکنوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی کا حُسنِ انتظام

پنجاب یونیورسٹی کی انتظامی حالت مدت سے ابتر ہو رہی ہے۔ اس ابتری کا اظہار وقتاً فوقتاً واقعات سے ہوتا رہتا ہے۔ اس مرتبہ تو اس ابتری نے شرمناک صورت اختیار کر لی۔ پچھلے سال امتحانات کی نگرانی کے لئے گراں وزن تنخواہ پر کنٹرولر کے نام سے ایک اسامی کا تقرر ہوا تھا۔ اس کے علاوہ خود یونیورسٹی کا عملۂ نگران بھی کم نہیں ہے لیکن اس کے باوجود صورت حال یہ ہے کہ اس سال ایف اے کے (جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے) تمام اور بی۔ اے کے اکثر پرچے آؤٹ

ہو گئے، اس لئے الیف اے کا دوبارہ امتحان لیا جائے گا۔ افسوس ہے کہ یونیورسٹی کی اس انتظامی ابتری کا خمیازہ اُن غریب الدیار طلبہ کو موجودہ آتش فشاں گرمی میں بھگتنا پڑیگا۔ جن کے والدین اپنی ضروریات کو روک کر اپنے بچوں کے گرانبار تعلیمی اخراجات برداشت کرتے ہیں۔ اب عام طور پر سوال کیا جارہا ہے کہ یونیورسٹی کی تغافل شعاری کا خمیازہ بھگتنے پر غریب طلبا کیوں مجبور کئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی پرچہ کے متعلق کوئی بے احتیاطی کسی چھوٹے درجہ کے ممتحن سے ہوجاتی تو بیچارہ اُسی وقت حالات کی تنگ و تاریک کوٹھری میں ماخوذ نظر آتا۔ لیکن ان بڑے لوگوں سے جو ہائی سوسائٹی کے رکن سمجھے جاتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ تمہارے منہ میں کَے دانت ہیں؟ یہ تمام قانونی گرفتیں اُن غریب ممتحنوں کے لئے ہیں جو مشرقی زبانوں کے ادنی ایجنسیٹ کے ممتحن سمجھے جاتے ہیں۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے پروفیسر برج نرائن ایم اے کا زریں مقولہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوتا ہے۔ کہ

"پنجاب یونیورسٹی ایک کھلا ہوا جَل اور دھوکا ہے۔"

جاوید نامہ

علامہ اقبال کی ایک تازہ ترین فارسی تصنیف "جاوید نامہ" کے نام سے عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ جاوید نامہ روما کے مشہور شاعر ڈینٹے کی کتاب "ڈیوائن کامیڈی" کا جواب ہوگا۔ اس کی فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ موصوف کی یہ تصنیف اُن کا شاہکار ہے۔ ڈینٹے نے مشہور شاعر ورجل کو اپنا رہنما بنا کر ڈیوائن کامیڈی میں جنت، اعراف، اور دوزخ کی سیر کرتے ہوئے مشاہیر عالم کے متعلق اپنے خاص انداز میں اظہار رائے کیا ہے۔ علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں بہشت، دوزخ کے بجائے فلکِ قمر، فلکِ عطارد، اور دیگر سیارات کی سیر کی ہے۔ اس سیر میں اُن کے رہنما مولینا رومی ہیں۔ ہر ملک کے منتخب انتہائی مشاہیر سے مکالمہ کیا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کے واقعات سے بحث کی ہے۔ یہ معرکۃ الآرا تصنیف ابھی زیر طباعت ہے۔ قارئین "ادبی دنیا" کو اس کتاب کے مطالعہ کی سعادت سے محروم نہ رہنا چاہیئے۔

اسپین کا انقلاب

دنیا کے تازہ ترین واقعات میں اسپین کا انقلاب خاص اہمیت رکھتا ہے۔ شاہ اسپین نے آخر کار تخت سلطنت سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اور ہسپانیہ میں شخصی حکومت کے بجائے جمہوری حکومت قائم ہوگئی۔ یہ درست ہے کہ شاہ الفانسو نے انجام کار اپنی قسمت کا فیصلہ پارلیمنٹ کی مرضی پر چھوڑ دیا لیکن اس پر جو مصیبت نازل ہوئی وہ دراصل اسی کی بلائی ہوئی تھی۔ اس کے لئے قرین مصلحت یہ تھا کہ جو کام بےشمار پریشانیوں اور باہمی آویزشوں کے بعد ہوا وہ کچھ عرصہ پیشتر ہی اختیار کیا جاتا۔ کیونکہ اسپین کے افق پر انقلاب کی جو آندھیاں مدت سے چل رہی تھیں اُن سے عہدہ برآ ہونا کچھ آسان کام نہ تھا۔ شاہ الفانسو کو رائے عامہ کا احترام کرنے کے بجائے اپنی کامیابی کا راز فوجی تائید و پشت پناہی میں نظر آیا۔ اس لئے اس نے فوجی قوت سے کام لیکر صورت حالات پر قابو پانا چاہا۔ لیکن اسے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ رائے عامہ کی ناقابل تسخیر قوت کسی مادی طاقت کے سامنے سرنگوں نہیں ہوسکتی۔

ہاتھا پائی اور غلاظت نگاری

نیویارک میں ایک ضیافت کے موقع پر امریکہ کے مشہور مصنف تھیوڈور ڈرائیزر اور ایک اور مصنف مسٹر سنکلیر لوئس میں جھگڑا ہوگیا۔ مؤخر الذکر نوبل پرائز بھی حاصل کرچکا ہے۔ جھگڑے کی ابتداء طعن و تعریض سے۔۔۔۔ ہوئی۔ اس کے بعد گالی گلوچ کی نوبت آئی۔ تھیوڈور ڈرائیزر نے اپنے حریف کے منہ پر زور سے دو تھپڑ رسید کردئے۔ مسٹر سنکلیر نے کہا "میں جناب مسیح علیہ السلام کی تعلیم کے بموجب اپنا دوسرا رخسار بھی تمہارے سامنے کرتا ہوں" مسٹر ڈرائیزر نے جواب دیا کہ "تم اپنے جسم کا جو حصہ بھی میرے سامنے کروگے اُسی کی مرمت کر ڈالوں گا" ہندوستان اور خصوصاً پنجاب کی صحافت میں بھی لڑائیاں ہوتی ہیں۔ اور ایڈیٹر اپنے اپنے دفتروں میں بیٹھے ہوئے کاغذ کے صفحات پر شرمناک گالیوں کی غلاظت بکھیرتے رہتے ہیں لیکن امریکن حریفوں کی طرح ان میں کبھی ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آئی۔ دنیا کے دو مشہور امریکن ادیبوں میں جو مقابلہ ہوا اسے وحشت اور بربریت کا نام دیا جائے گا۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی شرمناک حرکت شرف انسانیت کے دامن پر ایک نہایت بدنما دھبہ ہے۔ لیکن پھر بھی ہم ہندوستانی غلاظت نگاری کے مقابلہ میں اظہار اختلاف کے اس بربریت نما اور وحشیانہ نمونہ کو ترجیح دیتے ہیں۔

ادارہ

سوال وجواب

(۱) میں نے کسی رسالے میں فلسفۂ یونان پر ایک بہت دلچسپ مضمون پڑھا ہے۔ اُس میں صاحبِ مضمون جگہ جگہ "پیریکلیز" کا ذکر کرتے ہیں۔ میں چونکہ انگریزی پڑھا ہوا نہیں اس لئے نہیں سمجھ سکتا کہ اس فلاسفر کا مشرقی نام کیا ہے۔ کہیں یہ افلاطون تو نہیں ہے؟ (نور احمد خان منشی فاضل اعوان منزل موچی دروازہ لاہور)

(۲) ا۔ زیادہ کا استعمال 'انسب' کے ساتھ درست ہے یا نہیں؛ مثلاً "زیادہ انسب" کہنا صحیح ہے یا غلط؟

ب۔ دوست کا اطلاق اردو میں مذکر و مؤنث دونوں پر ہوتا ہے یا جیسا کہ انگریزی (Friend) دونوں کے لئے آتا ہے۔ یا صرف مرد ہی کو دوست کہہ سکتے ہیں۔ عورت کو نہیں؟ (عبدالاحد شرف الدین پوری صدر منزل بھندرو پٹنہ)

(۳) ا۔ "طرح" اور "نقص" کے صحیح تلفظ سے واقفیت بخشئے۔ آیا طَرح ہے یا طَرْح۔ نَقص ہے یا نُقص؟

ب۔ مضمون بولنا درست ہے یا پڑھنا؟ (خادم حسین عسکری)

جوابات

(۱) پیریکلیز اور افلاطون ایک شخص کے دو نام نہیں ہیں۔ پیریکلیز نے جس سال وفات پائی ہے، اُسی سال افلاطون پیدا ہوا ہے۔

پیریکلیز۔ یونان کی سب سے مشہور شہری مملکت ایتھنز کا سب سے لائق اور نامور صدرِ جمہوریہ گزرا ہے۔ نہایت متین۔ عالی دماغ اور علم و فضل کا ایک مجسمہ تھا۔ انکساغورث کا ہمعصر تھا۔ فصاحت و بلاغت میں لاثانی۔ سخی، فیاض، اور ہمہ صفت موصوف تھا۔

۴۶۱ قبل مسیح سے لیکر تا دمِ مرگ یعنی ۴۲۹ قبل مسیح تک صدرِ جمہوریہ (مجلس وطنی کا پریزیڈنٹ) اور سپہ سالارِ افواج کے فرائض انجام دیتا رہا۔

اس کی بدولت ایتھنز کو تمام مملکتوں پر تفوق حاصل ہوا۔ مرتے وقت جب ارکانِ جمہوریت اُس کے کارناموں کو یاد کرنے لگے تو اُس نے آنکھ کھولی اور کہا:-

"میرا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ عمر بھر میں نے کسی کو اپنی ذات سے نقصان یا رنج پہنچنے کا موقعہ نہیں آنے دیا۔" (ادارہ)

(۲) ا۔ زیادہ کا استعمال انسب کے ساتھ صحیح نہیں، کیونکہ انسب اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی ہیں، زیادہ مناسب۔ گویا زیادہ کا مفہوم خود انسب کے معنی میں موجود ہے۔

ب۔ اُن روشن خیال خاندانوں میں جن کی خواتین پردہ ترک کر چکی ہیں۔ انگریزی معاشرت کی پیروی میں دوست کا لفظ عورت مرد دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ کہیں کہیں مترجمہ اردو افسانوں میں بھی یہ لفظ کسی خاتون کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اگرچہ ابھی اردو اس نئے استعمال سے مانوس نہیں ہوئی لیکن رفتہ رفتہ مانوس ہو جائے گی۔ اس لئے میں تو دوست کا لفظ عورت کے لئے استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا۔ یہ میری ذاتی رائے ہے۔

آخر جدید تہذیب کے دلدادوں کو جن کی شمار حدِ شمار سے باہر ہوتی جاتی ہے۔ آپ ہندوستان میں رہنے کی اجازت دے رہے ہیں تو اُن کی معاشرت کے زیر اثر نئے الفاظ اور الفاظ کے نئے استعمال پیدا ہونے ضروری ہیں۔ زبان اس بدعت کو ضرور قبول کرے گی۔

(۳) ا۔ عربی میں "طَرْح" بفتحہ طاء وسکون راء (طَ کے زبر اور رْ کے جزم سے) ہے۔ اردو میں طَرَح۔ بفتحہ طا و را (طَ اور رَ کے زبر سے) آتا ہے۔ طَرِح۔ بفتحۂ طا و کسرۂ را (طَ کے زبر اور رِ کے زیر سے) بھی غلط نہیں ہے۔

"نَقص" نون کے زبر سے صحیح ہے اور میری رائے میں اردو میں نُقص بضمۂ نون (نون کو پیش دے کر) بولنا بھی جائز ہے۔ کیونکہ عام تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان پر رائج ہے۔ اس لئے "غلط العام فصیح" کے تحت میں آ جاتا ہے۔

ب۔ مضمون بولنا اُس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب کوئی خود بول بول کر دوسرے سے لکھوائے۔ ورنہ مضمون لکھنا صحیح ہوگا۔ مضمون بولنا غلط ہوگا۔

تاجور

تصحیح

چیخ پکار کو اکثر لوگ چیخ وپکار لکھتے ہیں - یہ صحیح نہیں۔ اصل لفظ :-

(۱) چیخ پکار

ہے - چیخ اور پکار کے درمیان میں واؤ عاطفہ کا استعمال غلط ہے ۔

قاعدہ :- واؤ عطف صرف اُن دو لفظوں کے درمیان میں آتا ہے جو دونوں عربی ہوں یا دونوں فارسی یا ایک عربی اور دوسرا فارسی - ان تین صورتوں کے علاوہ واؤ عطف کی بجائے **اور** کا لفظ آئے گا ۔ جیسے :-

جاڑا اور گرمی

کتاب اور کاپی — خاندان اور کنبہ وغیرہ -

(۲) روح ورواں

اکثر تعلیم یافتہ حتیٰ کہ اخبار نویس اور ادیب بھی اس لفظ کو مرکب توصیفی بنا کر لکھتے بولتے ہیں - حالانکہ یہ مرکب عطفی ہے - عام اردو خوان اور طلبہ یوں سمجھ لیں - کہ اس لفظ کا صحیح املا روح ورُواں اور صحیح تلفظ :-

روحورُواں

ہے - روحے رَواں نہیں ہے یعنی - ح - کے نیچے زیر نہیں ہے اور دونوں ر مضموم (پیش والی) ہیں - اس کے علاوہ روح اور رُواں کے درمیان **و** ہے -

روح ورُواں

تاجور

تنقیدِ شعری

(۱)
ساری دُنیا کے ہیں وہ میرے سوا
مَیں نے دُنیا چھوڑ دی جن کیلئے
(امیر مینائی)

یہ شعر عبرتِ عشق کی تصویر اور محبّت کا ایک دردناک مرقع لنظر کے سامنے پیش کردیتا ہے۔ اسلوبِ بیان کی اثر خیز سادگی، درد ریز اصلیت زبان کی سلاست، الفاظ کی فصاحت اور وہ خوبیاں جو کسی شعر کو سحر بنا دیتی ہیں۔ اِس شعر میں موجود ہیں۔ اصل مفہوم تو صرف اسی قدر ہے کہ ہم نے جن کی خاطر دوسروں کو چھوڑ دیا وہ ہمیں چھوڑ کر اُنہیں سے جا ملے۔

لیکن اِس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اسلوبِ بیان کے سوا الفاظ کے بہترین انتخاب میں شاعر قابلِ رشک حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اگر وہ ساری دنیا کے الفاظ کی بجائے یہ کہتا کہ محبوب اُن اغیار سے جا ملا جن سے ہم نے اُسی کی خاطر لگاڑی تھی۔ تو شعریت اِس پست سطح پر گر کر چکنا چور ہو جاتی۔ حالانکہ یہ "ساری دنیا" محدود اب بھی اغیار ہی تک ہے۔ لیکن شاعر اغیار کا ذکر نہیں کرتا بلکہ اُنہیں "ساری دنیا" سے تعبیر کرکے دوست کے ہرجائی ہونے پر بھی تعریض کرتا ہے۔ اور اپنی بیکسی اور مظلومی کو "ساری دنیا" کے الفاظ سے زیادہ دردناک بناتا ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہتا ہے کہ دوست نے دنیا کے ہر کس وناکس کو اپنا بنا لیا ہے۔ مگر وائے محرومی کہ ایک میں ہی اُس کے لطفِ نگاہ سے محروم ہوں۔ حالانکہ اپنے پرائے، یگانے بیگانے، عزیز و اقارب مختصر یہ کہ مَیں نے اپنی دنیا اُس سے ملنے کی خاطر قربان کردی۔

"دنیا چھوڑ دی" شاعر کی یہ دنیا بھی اُس کے حلقۂ تعارف ہی تک محدود ہے۔ لیکن اگر وہ "دنیا چھوڑ دی" کی بجائے عزیز و اقارب کے چھوڑنے کا ذکر کرتا تو پھر بھی یہ شعر سطحی اور بے اثر ہو جاتا۔

"میرے سوا" اِس اِستثنا نے محبّت کے انجام کو آئینہ دارِ عبرت بنا دیا ہے۔ گویا محبّت کے سرمایہ میں محرومی و مظلومی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

"جن کیلئے"، ایک تارک دنیا یوں بھی سب کی نگاہوں میں عزیز ہوتا ہے۔ کہ دنیا سے جو بیگانہ ہو جائے اہلِ دُنیا اُسے اپنانے کے آرزو مند رہا کرتے ہیں۔ لیکن جب صورت یہ ہو کہ دنیا کسی خاص شخص کے لئے چھوڑ دی جائے۔ اور ساری دنیا سے منہ موڑ کر صرف اُس کو اپنی دنیا بنا لیا جائے، ایسی صورت میں اگر وہ شخص اپنے اِس فداکار کو نظر انداز کردے تو اِس سے زیادہ سنگدلی بے حمیتی اور کیا ہو سکتی ہے۔ پھر یہ سنگدلی حدِ برداشت سے تجاوز کر جاتی ہے اگر وہ شخص اُسے چھوڑ کر باقی ہر کس وناکس سے ملنا جلنا شروع کردے۔ شعرِ مذکور میں "جنکے لئے"، کا لفظ محبوب کی بے حمیتی اور عاشق کی بے نصیبی کے نقطۂ عروج کو واضح کر رہا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ شعر زبان و بیان کی خوبیوں کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ اور کوئی مبالغہ نہ ہوگا اگر اسے سہلِ الممتنع قرار دیا جائے

(۲)
بزم میں ہر شے سے پیدا ہیں ترے جلووں کا رنگ
جلوہ زارِ شمع ہے خاکسترِ پروانہ آج
(اودے سنگھ شائق)

محبوب بزمِ عشرت میں جلوہ فرما ہے۔ شاعر۔ جو در حقیقت اہلِ عشق کا ترجمان یا خود عشق کی زبان ہے، محبوب کی رنگینیوں کی جھلک محفل کی ہر چیز میں دیکھ رہا ہے۔ اُسے نظر آرہا ہے کہ محبوب کے حسنِ بزم افروز سے اِس بزم کی شش جہات لبریز ہے اُس کے جلوہ ہائے رنگا رنگ کی نیرنگیوں سے مسحور ہو کر پکار اُٹھتا ہے کہ:۔
بزم میں ہر شے سے پیدا ہے ترے جلووں کا رنگ ؛ جلوہ زارِ شمع ہے خاکسترِ پروانہ آج

شاعر نے کتنی بلند نظر پائی ہے اور کیسے سحر آمیز انداز میں اپنے "نیرنگِ نظر" کے جمالِ ہمہ گیر کا اعتراف کر رہا ہے۔ الفاظ کی جستجو میں اُڑا ہے۔ تو آسمان نے اُسے اپنے جگمگاتے ستارے پیش کر دئے ہیں۔ اِس شعر میں تخیل کی بلندی، نفاست اور پاکیزگی دیکھئے۔ ادائے بیان کی ندرت پر نظر ڈالئے۔ اور الفاظ ——؟ الفاظ تو یہ ہے کہ فانوس کی طرح روشن دکھائی دے رہے ہیں۔ "خاکسترِ پروانہ کو جلوہ زارِ ...

ستانا جائز نہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ لوگ بعض اوقات ایسا کر بیٹھتے ہیں تاہم، دونوں کا یہ خیال تھا کہ انسانوں یعنی فطرت انسانی میں، خدا کے ہمہ جا حاضر و ناظر ہونے کا دھندلا سا تخیل ضرور موجود ہے اور اسی کی بدولت، انسانی فطرت، دراصل صحیح معنوں میں "انسانی فطرت" کہلا سکتی ہے۔ دونوں کے نزدیک، مملکت معبد بھی ہے۔ مملکت بھی ہے اور نظام سیاسی بھی۔ مملکت کا عدل سے وہی رشتہ ہے جو جسم کا روح سے ہے۔ جس طرح جسم بغیر روح کے بیکار ہے۔ اُسی طرح "مملکت" بغیر انصاف و معدلت کے جسم بیجان سے کم نہیں۔ اسی معدلت گستری (انصاف) کی بدولت، انسانوں کے باہمی تعلقات مرتبۂ کمال کو پہنچ سکتے ہیں۔ افلاطون اور ارسطو دونوں کے نزدیک، "معدلت گستری" نیکی، خیر و خوبی اور پابندیٔ قوانین، خوبیٔ محکوم اور خوبیٔ حاکم، ان سب باتوں کی مترادف ہے، اور دونوں نے اصول و قوانین عقلی کی بنا پر، معدلت مجردہ اور قوانین جائز و معقول کا موازنہ قوانین مروجہ اور رسوم معمولہ سے کیا ہے جو اُن کے زمانہ میں جاری و ساری تھیں۔

افلاطون اور ارسطو کا یہ خیال ہے کہ "اسٹیٹ" یا مملکت، بہر طور اپنی ذات و صفات میں مکمل ہوتی ہے وہ کسی پہلو سے دوسری اسٹیٹ کی محتاج یا دست نگر نہیں ہوتی لیکن اس کے افراد، بذات خود، ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں ہو سکتے (ہاں ایک اسٹیٹ، اپنے بقا و قیام کے لئے دوسری مملکتوں کی محتاج نہیں ہوتی) اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی افراد، بذات خویش، ایک دوسرے کے دست نگر ہیں، کوئی شخص دوسروں سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اُس کو دوسروں کی امداد کی، اور دوسروں کو اُس کی امداد کی ضرورت ہر وقت اور ہر معاملہ میں لاحق حال ہوتی ہے۔

ایتھنز کے باشندوں کی نظر میں، تعلقات باہمی اور رفاقت قلبی کے معنی اُس مساوات کے ہوتے تھے جو ایک متمدن اور خوشحال اور فارغ البال مملکت شہری (عتمتہ ی ہکتن) سے پیدا ہو سکتی ہے۔ جس میں سب لوگوں کی ضروریات اور باہمدگر رسم و راہ کی نوعیت یکساں ہوتی ہے۔ چنانچہ اُن کے معابد سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوئے تھے، جن میں تمام لوگ بلا امتیاز، ایک ہی دیوتا کی عبادت کرتے تھے اور ان کی جلسہ گاہیں بھی مشترکہ طور پر سب لوگوں کے استعمال میں آتی تھیں۔ وہ لوگ ایک ہی جگہ اٹھتے بیٹھتے تھے، ایک ہی قسم کی تفریحوں اور دلچسپیوں میں حصہ لیتے تھے۔ نیز افلاطون اور ارسطو دونوں کا یہ خیال تھا کہ حقوق اور فرائض لازم و ملزوم باتیں ہیں یعنی جس طرح ہر شہری کو مملکت پر کچھ حقوق حاصل ہیں اسی طرح ہر مملکت کی طرف سے شہریوں پر کچھ فرائض بھی عاید ہوتے ہیں۔ اور جسقدر تندہی اور خلوص کے ساتھ کوئی شخص اپنے فرائض منصبی ادا کرتا ہے۔ اُسی قدر، مملکت پر اُسے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ پس ہر شخص کو ادائیگی فرائض میں تندہی کے تناسب سے حقوق ملنا چاہئیں۔ مثلاً زید اور بکر دو شہری ہیں۔ زید کی خوبیاں بکر کی خوبیوں سے زیادہ ہیں۔ یعنی زید اپنے فرض کی ادائیگی میں بکر سے زیادہ چست ہے تو لازم آیا کہ زید کے حقوق بھی بکر کے حقوق سے زیادہ ہوں۔ اگر ان دونوں کو یکساں حقوق حاصل ہو جائیں تو یہ صریح ناانصافی ہوگی۔ اُن شہریوں کو، جو بلحاظ صفات ذاتی، باہمدگر متفاوت ہوں، یکساں حقوق دینا، ہر ابر ظلم اور منافیٔ معدلت ہے۔

اسی وجہ سے ہر شہری (ایتھنز کا باشندہ) ایک دوسرے سے ادائیگی فرائض میں سبقت لیجانے کی کوشش کرتا تھا، تاکہ عامۃ الناس اور حکام وقت دونوں کی نگاہوں میں اُسے عزت حاصل ہو اور وہ مزید حقوق حاصل کر سکے۔ اسی وجہ سے ہر شہری، ایتھنز کی عزت اور فارغ البالی کو اپنی حرمت اور خوشحالی سمجھتا تھا اور اگر اپنے محبوب شہر کی خاطر، انہیں جان دینے کا موقعہ ملتا تو وہ اسے اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے۔ چنانچہ پیریکلز نے مقتولین جنگ کی نعشوں پر، جن کو اُن کے ہمراہی بعزت تمام دفن کرنے کے لئے ایتھنز لیکر آئے تھے، کھڑے ہو کر اپنی ایک غیر فانی تقریر میں، جو دنیا کی بہترین تقاریر میں شمار کیجاتی ہے، یہ الفاظ کہے تھے جو تاریخ عالم میں سونے کے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہیں:۔

"ہماری شہری زندگی اور خانگی تعلقات کے مابین کوئی پردۂ مغایرت یا حجاب منافرت حائل نہیں ہے۔ یعنی جس طرح اور جس طور سے ہم اپنے گھروں میں رہتے سہتے ہیں اُسی طرح باہر دوسروں سے ملتے جلتے ہیں۔ نہ ہم ایک دوسرے پر شک و شبہ کرتے ہیں اور نہ اپنے ہمسایوں کے افعال اور اعمال پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ جس طرح ہم یہ بات پسند نہیں کرتے کہ کوئی شخص ہمارے معاملات میں مداخلت کرے، اُسی طرح ہم بھی دوسروں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے۔ اور خواہ کسی شخص سے ہمیں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ لیکن ہم اُسے دیکھ کر ناک بھوں نہیں چڑھاتے۔ ہم نے اپنی تفریح کے بہت سے ذرائع مہیا کر لئے تاکہ جب ہم لوگ اپنے اپنے مشغلوں سے فرصت پائیں تو اپنا دل بہلا سکیں۔ ہم نے سال بھر کے لئے سیر و تفریح، کھیلوں اور مردانہ ورزشوں کا پروگرام مرتب کر لیا ہے۔ اور ہر شخص پابندی کے ساتھ اس پر عمل کیا کرتا تھا

ہے - ہماری خانگی زندگی نہایت خوشگوار ہے، ہماری طرز رہائش نہایت شائستہ اور مرغوب طبع ہے اور انہی باتوں کی بدولت ہمارے ملوں میں غم والم راہ نہیں پا سکتے - ہمارے شہر کی عظمت و مرکزیت کی وجہ سے تمام دنیا کی نعمتیں اور پھل، گھر بیٹھے ہمیں میسر آجاتے ہیں۔

ہمارا فوجی نظام کئی پہلوؤں سے، ہمارے دشمنوں کے نظام پر فوقیت رکھتا ہے - ہماری وسعتِ قلبی اور فراخ حوصلگی کا یہ عالم ہے - کہ ہمارے شہر کے دروازے، دوست دشمن دونوں کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوئے ہیں، کسی شخص پر کوئی بندش نہیں، کسی طرح کی پابندی عاید نہیں جس کا جی چاہے، ہمارے شہر میں آکر سکونت پذیر ہوجائے، اور جو علوم و فنون ہم سیکھتے ہیں، وہ بھی سیکھے - اور جن چشموں سے ہم سیراب ہوتے ہیں وہ بھی اُن سے اپنی پیاس بجھائے اور جو خوبیاں ہمارے اندر پائی جاتی ہیں وہ بھی اُن میں شریک ہوجائے - ہم عیاری، مکاری اور فریب کاری سے سخت نفرت کرتے ہیں کسی کو دھوکا دینا یا کسی کے ساتھ دغا کرنا یہ دونوں باتیں ہمارے سیاسی عقاید میں حرام اور ناجائز ہیں - ہم تو محض اپنی قوتِ بازو اور کاوشِ دماغی پر بھروسا کرتے ہیں - چونکہ ہمارے دل پاک ہیں - اس لئے ہمیں نہ کسی کا ڈر ہے نہ خوف - دیگر اقوام، اپنے افراد میں شجاعت و جسارت پیدا کرنے کے لئے صد ہا صعوبتیں برداشت کرتی ہیں - لیکن ہم ہیں کہ عیش کرتے ہیں اور پھر بھی ہم میں سے ہر متنفس، اپنے شہر کی خاطر کٹ مرنے کے لئے، ہر وقت آمادہ نظر آتا ہے -

یعنی جس بات کو، دیگر حکومتیں، اپنی رعایا میں، قانون کے زور سے پیدا کرتی ہیں، وہ بات ہمارے اندر عادةً پیدا ہوجاتی ہے - وہ لوگ تو مجبوراً، اپنے ملک کی "سیوا" کرتے ہیں - اور ہم اپنے دل سے - اُن کو دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے قواعد، پریڈ، تربیت اور قانون کی ضرورت ہے لیکن ہم ماں کے پیٹ ہی سے خُدّام و جاں نثارانِ وطن پیدا ہوتے ہیں - پس دونوں میں کون بالاتر ہے؟ بحالتِ امن تو ہمارا شہر رشکِ جناں ہوتا ہی ہے - اور بحالتِ جنگ بھی ہم لوگ شاداں اور صابر و شاکر نظر آتے ہیں، کیونکہ حبِ وطن کا جذبہ ہمارے دلوں میں ایسا راسخ ہوچکا ہے کہ اُس کی خاطر ہم ہنستے کھیلتے اپنی جان قربان کردیتے ہیں - گویا سر کٹانا ہمارے نزدیک کوئی بات ہی نہیں ہے - ہم جمالیات اور فنونِ لطیفہ یعنی شاعری - مصوری - موسیقی کے دلدادہ ہیں - ہر جمیل شے کو محبوب رکھتے ہیں اور انسانی دماغ جن جمیل و حسین اشیا کا تصور کرسکتا ہے وہ سب ہمارے شہر میں موجود ہیں - بایں ہمہ ہماری عادات نہایت سادہ، ہمارے خیالات نہایت پاکیزہ اور ہمارے جذبات نہایت ارفع ہیں اور اگرچہ ہم لوگ دماغی قوتوں کو پیراستہ کرنے میں دن رات مشغول رہتے ہیں - تاہم جوہرِ مردانگی ہمارے اندر سے مفقود نہیں ہوتا (عام قاعدہ ہے کہ جو لوگ دماغی مشاغل مثلاً منطق فلسفہ وغیرہ میں منہمک رہتے ہیں - اُن کے اندر سے شجاعت اور جنگی اسپرٹ بالکل، یا بڑی حد تک ضرور نکل جاتی ہے) ہم دولت کا بیجا استعمال نہیں کرتے یعنی اس کو نمود، شان اور ریاکاری کے لئے خرچ نہیں کرتے بلکہ اُس سے بہترین فوائد حاصل کرتے ہیں - اگر ہم میں سے کوئی شخص غریب یا نادار ہوتا ہے تو وہ اپنی سچی حالت کے اظہار میں شرم محسوس نہیں کرتا - کیونکہ ناداری عیب نہیں بلکہ چوری اور جعلسازی عیب ہے - دروغ گوئی اور فریب کاری عیب ہے، بلکہ آرام طلبی اور کاہلی عیب ہے اور میری رائے میں سب عیوب سے بڑھکر ہے -

ایتھنز کا کوئی باشندہ، خواہ اس کے فرائضِ خانگی، کتنے ہی دشوار اور صبر آزما کیوں نہ ہوں - اُن فرائض کی ادائیگی سے تغافل روا نہیں رکھتا جو اس پر بحیثیت شہری ہونے کے، عاید ہوتے ہیں - اور جو لوگ رات دن تجارت اور تجارتی معاملات میں غرق رہتے ہیں وہ بھی سیاسیاتِ ملکی میں کافی دلچسپی لیتے ہیں - کیونکہ ہم لوگ، اس شخص کو، جو سیاسیات سے دلچسپی نہیں رکھتا محض بیکار سمجھتے ہیں جس کا عدم اور وجود دونوں برابر ہیں - اگر وہ شخص آج مرجائے تو کوئی شہری بھول کر بھی اس کا تذکرہ نہ کریگا - گویا اس کا اور کسی جانور کا مرنا، دونوں برابر ہیں - ہماری رائے میں بحث و مباحثہ سے قوتِ عمل مفقود نہیں ہوتی - بلکہ اُس علم کے فقدان سے جو بحث و مباحثہ کے لئے ضروری ہے - یا بحث و مباحثہ کے بعد جو نتیجہ نکلے اس پر عمل نہ کرنے سے - ہم لوگوں کا خاصہ یہ ہے کہ ہماری قوتِ متخیلہ اور متفکرہ دونوں کافی نشوونما یافتہ ہیں - اور ہم ہر اقدامِ عمل سے پہلے اُس کا انجام سوچ لیتے ہیں - اور ہمارے شہر کا ہر باشندہ، اپنی زندگی کو حسب اقتضائے حالات، تبدیل کرسکتا ہے - اور مجھے اس بات کا یقین ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں جو کارہائے نمایاں ایتھنز کے باشندوں نے انجام دئے ہیں - وہ تاقیامت آفتاب کی صورت چمکتے رہیں گے - اور آئندہ نسلیں حیرت کے ساتھ اُن پر نظر کیا کریںگی - اپنے کارناموں کو اجاگر کرنے کے لئے، ہمیں نہ کسی شاعر کی ضرورت ہے - نہ کسی قصیدہ خواں کی۔

کیونکہ بَرّ و بحر دونوں ہماری شجاعت پر گواہ ہیں اور ہم نے اپنی شہرت کا جھنڈا ہر ملک میں گاڑ دیا ہے -

فی الجملہ اِن لوگوں نے (مقتولین کی طرف اشارہ ہے) ایسی خوبیوں والے شہر کی عزت برقرار رکھنے کے لئے اپنی جانیں قربان کی ہیں - کیونکہ یہ جانباز اِس بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے - کہ کوئی شخص ان کے محبوب شہر کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے، یا اس پر قبضۂ مخالفانہ جما لے، اور جو لوگ قتل ہونے سے بچ رہیں وہ اپنی زندگی اُس کی غلامی میں بسر کرنے پر مجبور ہو جائیں -

اے باشندگانِ ایتھنز! میں تو یہی راگ (ایتھنز کی عظمت اور اس کے برقرار رکھنے کی ضرورت) شب و روز، تمہارے سامنے گائے جاؤنگا. حتیٰ کہ تمہارے قلوب میں، اِس مقدس شہر کی عظمت کا سکّہ اس طرح جم جائے - کہ تم اِس کی عظمت کے مقابلے میں اپنی جان اور اپنے مال کو بہ کاہ (گھاس کا تنکا) سے زیادہ وقعت نہ دو - اور یہ اچھی طرح محسوس کرنے لگو کہ یہ عظمت اور شہرت، جو آج تمہارے شہر کو حاصل ہے. خود بخود حاصل نہیں ہو گئی ہے، بلکہ، یہ اُن لوگوں کی جانفشانیوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے - جنہوں نے اپنے فرائضِ منصبی کے مقابلے میں، دنیا کی کسی چیز کی پروا نہ کی - اور جن میں اُن کی ادائیگی کی قرار واقعی جرأت موجود تھی. اور جنہوں نے اپنی جانِ شیریں، بخوف و خطر اپنے محبوب وطن کی عظمت برقرار رکھنے کے لئے قربان کر دی -

واضح ہو کہ انہوں نے اپنی جانیں رائیگاں قربان نہیں کیں - اگر آج وہ نہیں ہیں تو اُن کی اولاد چین کر رہی ہے - اور یوں بھی ہر شخص اِن کی تعریف میں رطب اللسان ہے - آج کون ہے جو اِن کی بہادری کا اعتراف نہیں کرتا؟ اور جبتک دنیا میں خلوص اور ایثار کی قدر باقی رہیگی اس وقت تک یہ لوگ زندہ رہیں گے -

پس اِن لوگوں کو اپنا نمونہ بناؤ، اِن کی خوبیوں کا صحیح اندازہ کرو - اور اِن کے نقشِ قدم پر چلو - تاکہ تمہارا نام بھی تا قیامت زندہ رہے -

یوسف سلیم بی۔اے

اسرارِ خودی

عقل اور ہوش مرے عالمِ ادراک سے دور
کیف اور کم سے ہے آزاد مرا فہم و شعور

میرا احساسِ خودی حدِ تصوّر سے بلند
میرے جذبات پرِ مرغِ تخیل سے بھی دُور

ابدی حُسن کے نغموں کا میَں ہوں سرچشمہ
میری اِک تان سے ہے عالمِ امکاں مسحُور

ہمہ جائی و ہمہ بینی کی تفسیریں بھی ہَا
میری ہی رُوح کے پردوں میں ہیں گویا مستوُر

مجھ کو ہر سُو نظر آتا ہے مرا ہی جلوہ
میری ہی ضَو سے ہے دنیا کی ہر اِک شے پُر نور

شارقؔ دہلوی

دلّی کی اردو زبان

(گذشتہ سے پیوستہ)

میرزا نوشہ۔ سوزاں صاحب! آپ سے سن و سال میں زیادہ ہوں شعرگوئی بھی آپ سے میری زیادہ ہے، معلومات بھی آپ سے کم نہ ہونگے۔ پھر آپ نے یہ نہ خیال فرمایا کہ غالبؔ سے ایسی بھونڈی غلطی کیونکر ہوئی؟ حضرت بات یہ ہے کہ مَیں اِس فن کے دیدہ ور لوگوں کے قدم بقدم چلتا ہوں پہلے سند حاصل کرلیتا ہوں پھر محاورہ کو سپردِ قلم کرتا ہوں، ایران میں یزد کے قریب ایک گاؤں ہے جسے شکرَدہ کہتے ہیں، اس گاؤں میں ایک شریف زادی اپنے دروازہ پر کھڑی تھی جو ایک سائل ہات میں کجکول لے آیا۔ اور اُس شریف زادی سے آنکھیں چار ہوئیں، سایل نے دیکھا کہ ایک لڑکی جس کی عمر ۱۴ - ۱۵ سال کی ہے چوکھٹ کا بازو پکڑے کھڑی ہے جو گلرو اور عنبرین مُو ہے۔ سایل کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہگئیں، حسن کی جوت نے اُسے کا ثورا بنا دیا۔ فقیر بیچارہ غش کھا کر گرا، کجکول کہیں اور جھولی کہیں اور گلے میں لڑیاں تھیں وہ کہیں، کیونکہ کنٹھے کا ڈورا ٹوٹ گیا تھا، لڑکی نے چِلّا کر کہا ابّا جان جلد آئیے فقیر بیچارہ کا کام تمام ہوا جاتا ہے۔ لڑکی کا باپ گھر سے نکلکر دوڑا آیا فقیر کو سنبھالا اُسے پانی پلایا اور کہا بابا تمہارا آٹا بھی گر گیا اور کنٹھے کا دانہ دانہ بکھر گیا فقیر نے کہا بابا آٹا اور کنٹھا کیسا میرا تو اِس گلی میں گھُس کر کھیل ہی بکھرا ہوگیا۔

لڑکی کا باپ۔ بابا کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟

فقیر۔ آئی کیوں نہیں گہری چوٹ ہے دکھائی نہیں دیتی ہے۔ یہ کہہ کر اُٹھا لڑیاں چنیں، آٹا اٹھایا جو اُٹھ سکا کجکول ہات میں لے چلدیا۔ دوسرے دن صبح ہی فقیر پھر آیا اور اُس لڑکی کے دروازہ پر صدا کہنے لگا اور اسی طرح روز آکر دُھنی دینے لگا اور اب لڑکی کے ماں باپ کو فقیر کا آنا اور دن رات گلی میں پڑا رہنا ناپسند ہوا اور سمجھے کہ دال میں کالا ہے محلہ والوں سے فقیر نے کہہ بھی دیا کہ اِس لڑکی پر دل آگیا ہے اسی کوچہ میں جان دونگا۔ اور مر کر یہاں سے ہلونگا، مثل مشہور ہے نکلی ہونٹوں اور چڑھی کوٹھوں، سارے گاؤں میں شہرہ ہوا۔ کہ یہ بات یوں ہے اور فقیر فلاں کی لڑکی پر مفتوں ہے۔ ماں باپ اور لڑکی بالکل بیگناہ تھی مگر مخلوق کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ جب بہت تھڑی تھڑی ہوئی تو عزیزوں کی یہ صلاح ہوئی کہ لڑکی کو تھوڑے دن کے لئے اصفہان اُس کی نہیال بھیجدیا جائے اور اُس لڑکی اور لڑکی کی ماں کو رات کے دو بجے اصفہان کی طرف روانہ کردیا۔

شکرَدہ سے چار میل پر ندی تھی دونوں کو ندی سے پار اوتار دیا۔ اور لڑکی کا باپ گھر آکر پاؤں پھیلا کر سو رہا۔ عاشق فقیر کو ایک مہینہ کے بعد یہ بھید کھُلا کہ لڑکی گاؤں میں نہیں ہے۔ اُس نے بہت ٹٹول کی تو یہ کھوج لگا کہ لڑکی رود خانہ تک گئی ہے بس اُس دیوانہ فقیر نے ندی کے کنارے دھونی رمائی اور دریا کی لہریں گننے لگا۔ شکردہ میں ایک شاعر رہتا تھا جس کا حاجی تخلص تھا، اس نے اس قصہ کو مثنوی کے پیرایہ میں لکھا ہے۔ اس مثنوی میں حاجی کہتا ہے ؎

مدّتے آن گدائے خونین دل
بود تنہا نۂ لبِ ساحل

اِس کے علاوہ اور اساتذہ نے بھی لبِ ساحل باندھا ہے آپ سوچئے ساحل اور لبِ ساحل میں بڑا فرق ہے۔

سوزاں صاحب میرزا صاحب کی گفتگو سُن کر چُپ ہو گئے اور دم بخود رہے۔ میرزا صاحب نے دیکھا کہ سوزاں گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھے ہیں اور رعب کے مارے بول نہیں سکتے ہیں تو ان کے بہلانے کے لئے فرمایا سوزاں صاحب کچھ اپنا کلام سنائیے۔ مَیں مدّت سے مشتاق ہوں میرزا صاحب کا دربار اب گرم ہوگیا تھا۔ رضوانؔ اور سالکؔ اور مجروحؔ حاضر تھے اور بہت سے حضرات آچکے تھے۔ میرزا صاحب کا فرمانا کہ سوزاں صاحب اپنا کلام سنائیے مَیں مدّت سے مشتاق ہوں۔ ایسا ولیسانہ تھا پھر میرزا صاحب کے شاگردوں کا ایک منہ ہو کر انہیں اُبھارنا اگر سوزاں صاحب کچھ نہ پڑھتے تو گویا میدان چھوڑ کر بھاگنا تھا انہوں نے اپنے تئیں سنبھالا اور اپنی فارسی غزل سنانی شروع کی وہ پڑھتے جاتے تھے اور میرزا صاحب زبانی ہی اصلاح دیتے جاتے تھے۔ اور اصلاح کا ہر لفظ انگوٹھی پر نگینہ ہوتا تھا یہاں تک کہ غزل تمام ہوئی اور سوزاں صاحب نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر اور ہات جوڑ کر میرزا صاحب کی خدمت میں عرض کی کہ اس مدت تک جو کچھ گستاخیاں مَیں نے حضرت کی شان میں کی ہیں یہ میری لاعلمی اور نادانی تھی۔ سچ یہ ہے کہ آپ ہندوستان میں فارسی زبان دانی

کے پیغمبر ہیں ۔ اور میں آپ کے کمال پر ایمان لاتا ہوں ۔ اتنا کہنے پر میرزا صاحب نے اُٹھ کر سوزاں صاحب کو اپنے گلے سے لگا لیا اور اپنے پاس بٹھا لیا سوزاں صاحب نے پانچ روپیہ جیب سے نکال کر ناظر اکرام علیخاں صاحب کو دئے کہ بھائی اس کی مٹھائی منگوا لو ۔ ناظر صاحب نے روپیہ کلیان کو دئے ۔ کلیان بازار گئے اور پانچ روپیہ کا بہت تحفہ تلاقند لائے اور سوزاں صاحب باقاعدہ میرزا صاحب کے شاگرد ہو گئے اور میرزا صاحب کے نام آور شاگردوں میں گنے گئے ۔ اور ہاں نوشہ صاحب کو تو زین العابدین خاں کی جوانا مرگی نے زندہ درگور کر دیا تھا ۔ ورنہ وہ ایک ہنس مکھ انسان تھے ۔ مردانہ کا تو کیا ذکر ہے جب زنانہ میں آتے تھے تو بھی بات بات میں اُن کے منہ سے پھول جھڑتے تھے ۔ حلال خوری کو بھی چھیڑ دیا وہ صلواتیں سُنا رہی ہے اور آپ ہنس رہے ہیں کسی عزیز قریب کے ہاں سے کوئی مہری کوئی ملا ماحصہ لیکر آئی ہے ۔ اس سے وہ لگاوٹ کی باتیں کر رہے ہیں کہ وہ بیچاری مارے حیا کے پانی پانی ہوئی جاتی ہے ۔ اُسے پیچھا چھڑانا دشوار ہے ۔ صدر دالان میں پہنچے تو بیوی نے کہا اے صاحب تم نے تو حیا بھون کھائی ۔ یہ مہری گھر جا کر تمہارے جنم میں کیا تھوکیگی ۔ بوڑھے منہ مہاسے اور لوگ آئے تماشے ۔ موئی کا نڑای نخو حلال خوری سے دو بدو کر کے ہلکے بنے نہ ...... میں ڈھیلا ڈالو نہ چھینٹیں اڑیں ۔ اُس نے بھی کیسی کھری کھری کہیں ہیں ۔

میرزا صاحب ۔ بیگم بات یہ ہے کہ جیسی رُوح ویسے فرشتے ، سب تم سے تو ہونے سے رہے ۔ تم تو ہر وقت جا نماز پر بیٹھی وظیفہ بڑبڑایا کرتی ہو اللہ میاں کو بہلایا کرتی ہو ۔ اس میں ایک کم عمر بیگم نے اُن بوڑھی بیگم سے جنہوں نے سلسلۂ کلام چھیڑ رکھا تھا ، ہاتھ باندھ کر کہا ۔ پھوپی جان میں نہ بھی زین العابدین خاں میرزا نوشہ کے کون تھے ۔

بوڑھی عورت ۔ اُن کے منہ بولے بیٹے ۔ سنو ۔ دادا نواب الٰہی بخش خاں کی دو بیٹیاں ایک امراؤ بیگم میرزا نوشہ کی بیوی ، اُن کی کوکھ سے میرزا صاحب کے گھر میں سات بچے ہوئے ۔ مگر ایسا پینچ لگا تھا کہ ایک نہ بچا ، تو چل بیں آیا ، برس برس دو دو برس کے آگے پیچھے سے ساتوں کے ساتوں قبروں میں جا سوئے ۔ جب اولاد کے جینے اور ہونے سے مایوسی ہوئی تو امراؤ بیگم اور اُن کے میاں نے بنیادی بیگم کے بیٹے زین العابدین خاں کو گود میں لے لیا ۔ بنیادی بیگم سگی بہن تھیں امراؤ بیگم کی ، میرزا نوشہ کی سالی اِن خالہ خالو نے زین العابدین خاں کو بڑے لاڈ سے پالا ، ہاتھوں چھاؤں کی ۔ جوان ہوئے تو عارف تخلص ہو گیا ، عارف بچوں والے ہوئے تو اجل آ گئی ۔ خالہ خالو کی کمر توڑ گئے ۔ میرزا صاحب نے اُن کے سوگ میں ایک مرثیہ لکھا جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم لڑکیوں نے وہ قصہ سُنا ہے کہ نواب محمد یوسف علیخاں صاحب رئیس رام پور نے جو ناظم تخلص کرتے تھے اور میرزا صاحب کے شاگرد تھے ، میرزا صاحب کو رام پور بلایا تو میرزا صاحب سے نواب صاحب ممدوح کی پہلی ملاقات کیونکر ہوئی اور کیا بات چیت ہوئی ۔ سب بیگموں نے کہا بھلا حضرت یہ باتیں ہم کہاں سے سُن سکتے تھے ؟ ہم کیا ہمارے فرشتوں نے بھی نہیں سنیں ۔ اب آپ فرمائیں گی تو ہمیں سننے کی سعادت حاصل ہو گی ۔ بڑی بیگم صاحبہ سنو کہنے پائیں تھیں جو برابر کے کمرہ میں سے دودھ پیتے بچّے کے رونے کی آواز آئی بڑی بیگم نے کہا یہ کس کا بچّہ روتا ہے ؟ جو پاس بیٹھیں تھیں ، حضرت یہ آپ ہی کا پوتا ہے ۔

بڑی بیگم ۔ خدا رکھے کتنے دن کا ہے ؟

چھوٹی بیگم ۔ چھ مہینہ کچھ دن کا ۔

بڑی بیگم ۔ دودھ کس کا پیتا ہے ؟

چھوٹی بیگم ۔ انا کا ۔

بڑی بیگم ۔ بچّوں کا رونا دھونا اکثر پیٹ کی کسر سے ہوتا ہے ۔ اور کسر ہوتی ہے دودھ پلانے والی کی بد پرہیزی سے ۔ لُکا چھُپا کے کوئی ثقیل چیز کھا لیتی ہیں ۔ اور تکلیف بھگتتے ہیں ننھے سے معصوم ۔ انا کو اس کے گھر جانے نہ دیا جائے ۔ گھر جاتے ہی الا بلا کھاتی ہے اور سُرخ رو جونڈا بنی رہتی ہے

چھوٹی بیگم ۔ آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے ۔ انا نمک حراموں کا یہی حال ہے یہ انا داور ی جگن پور کی طرف کی رہنے والی ہے ۔ بیس روپیہ نقد مہینہ کے اور کھانا کپڑا میرے ذمہ ہے ۔ زینن نام ہے آدھ پاؤ گھی کا قلیہ اس وقت اور آدھ پاؤ گھی کا قلیہ اُس وقت اپنے سامنے کھلاتی ہوں ۔ پھلکے روہ کے ہوتے ہیں مگر گنواری دونوں وقت ناک مار کر کہتی ہے ہم سے تو روج روج قلیہ نہیں کھایا جاتا ۔ سُروا پیتے پیتے میں نگوڑی مر مٹی ، میرا جی کرے ہے مُولی کی بھجیا کو ، مکا کے پرلوں کو "۔

ایک بیوی ۔ تمہاری زینن بڑی گنواری ہے ۔ کمبخت کے منہ سے قاف غین نہیں نکلتا ہے ۔ دلّی کی تو حلال خوریاں بھی "مکر سروا" نہیں بولتی ہیں ۔ قادورہ ، شب برات ، عارتی الیسا صاف کہتی ہیں کہ سُن کر

محبت کی شام

(از قلم حضرت روش صدیقی)

جبرِ دنیائے تمنا پر کئے بیٹھا ہوں میں حسرتوں کے داغ دامن میں لئے بیٹھا ہوں میں
اشکِ خوں بربادیٔ دل پر، پیے بیٹھا ہوں میں ہائے کیا جانے؟ وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے!

وہ فریبِ غمزہ ہائے حسنِ بے پروا، کہاں؟ وہ طلسمِ انتظارِ وعدۂ فردا کہاں؟
میری دنیا۔وہ نیازِ عشق کی دنیا کہاں؟ ہائے کیا جانے؟ وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے!

التفاتِ حسنِ ہرجائی کو مدت ہو چکی، حسرتوں کی محفل آرائی کو مدت ہو چکی
داغِ الفت! تیری رسوائی کو مدت ہو چکی، ہائے کیا جانے؟ وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے!

آہ! وہ آغازِ الفت کا زمانہ اب کہاں؟ اُف وہ انجامِ محبت کا فسانہ اب کہاں؟
وہ محبت، وہ محبت کا بہانہ اب کہاں؟ ہائے کیا جانے؟ وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے!

شعلہ ہائے شمعِ ہستی میں تپش باقی نہیں! کائناتِ دل کو ارمانِ خلش باقی نہیں!
"درد" میں میرے لئے کوئی کشش باقی نہیں! ہائے کیا جانے؟ وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے!

روح افسردہ ہے، ارمانِ محبت کی طرح! دل ہے ٹکڑے ٹکڑے پیمانِ محبت کی طرح!
جی رہا ہوں، اک پشیمانِ محبت کی طرح! ہائے کیا جانے؟ وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے!

گول میز کانفرنس

اور مسلمانانِ ہند

ایفائے عہد کا مطالبہ

اپنی تقریر کے بعد ملک معظم تشریف لے گئے۔ اور کانفرنس کی کارروائی وزیراعظم کی صدارت میں شروع ہوئی۔ وزیراعظم نے تقریر کی، ریاستوں اور برطانوی ہند کے نمائندوں نے تقریریں کیں۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ آج ہم برطانیہ سے اُن وعدوں کا ایفا چاہتے ہیں جو برطانوی عملداری کے آغاز سے متواتر برطانیہ کے تاجدار، پارلیمنٹ، وزرا اور وائسرائے برطانیہ کی طرف سے ہندوستان سے کرتے آئے ہیں۔ آج ہم برطانیہ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہندوستان کی حکومت کے متعلق اس اصول کو عملی جامہ پہنایا جائے جس کے قیام کی خاطر برطانیہ نے جنگِ عظیم میں حصہ لیا تھا۔ آج ہم انسانیت کے بنیادی حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ہر ملک کی حکومت اس ملک کے باشندوں کی مرضی کے مطابق چلائی جائے۔ اور اس ملک کے باشندوں کے روبرو جوابدہ ہو۔

وقت کی حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ مطالبہ نہایت اختصار کے ساتھ لیکن نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا گیا۔ اور آناً فاناً عام دنیا میں شائع ہوگیا۔ اب دنیا اس بات کی منتظر ہوئی کہ دیکھیں برطانیہ اس مطالبہ کو کس رنگ میں قبول کرتا ہے۔ اور اپنے وعدوں کا کس حد تک ایفا کرتا ہے۔

ورکنگ کمیٹی مقرر کی گئی اور ایجنڈا کی تیاری کا کام اس کمیٹی کے سپرد ہوا۔ ۱۷ نومبر کو کانفرنس کے کامل اجلاس وزیراعظم کی صدارت میں محل سینٹ جیمس میں شروع ہوئے۔ ۱۷-۱۸-۱۹-۲۰ کو چاروں دن ۱۰½ بجے صبح سے ایک بجے دوپہر تک اجلاس ہوئے۔ اور ۲۰ کو سہ پہر کو بھی اجلاس ہوا۔ وزیراعظم نے اعلان کیا کہ ان اجلاس میں مقررین آئندہ نظام حکومتِ ہند کے جس پہلو پر چاہیں عام تقریریں کریں، کسی قسم کی روک یا بندش نہیں ہوگی۔ چنانچہ ہندوستان کے نمائندوں نے وہ مطالبات جو اختصاراً ۱۲ نومبر کے دن پیش کئے گئے تھے۔ پوری وضاحت کے ساتھ اس مرحلہ پر پیش کئے۔ کارروائی سر تیج بہادر سپرو کی تقریر سے شروع ہوئی۔ بعد ازاں انہوں نے ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر میں ہندوستان کے حقوق کی وکالت کا حق ایسے طور پر ادا کیا کہ ہر گوشہ سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ ان کے بعد چار دن کانفرنس کے ہر حصہ سے مختلف نمائندوں نے ہندوستان کے مطالبات کی وضاحت کی۔

والیانِ ریاست کی رائے

والیانِ ریاست اور اُن کے وزرا اور مشیروں نے بھی برطانوی ہند کے نمائندوں کے پہلو بہ پہلو ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کے قیام کے مطالبہ کی تائید کی اور اس پر اصرار کیا۔ ریاستوں کی طرف سے اس امر پر رضامندی ظاہر کی گئی کہ وہ اندرونی معاملات میں اپنے اختیارات کی آزادی کو محفوظ رکھتے ہوئے مشترکہ امور میں ابھی سے برطانوی ہند کے ساتھ شامل ہو کر فیڈرل طرز حکومت قائم کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس اعلان نے کانفرنس کا رنگ بالکل بدل دیا۔ اور برطانوی نمائندگی کی آرا میں ایک عظیم تغیر پیدا کر دیا۔ ساتھ ہی ریاستوں کی طرف سے اس امر کی بھی وضاحت کر دی گئی کہ جہاں وہ مشترکہ امور کے متعلق برطانوی ہند کے ساتھ شامل ہونے کو تیار ہیں وہاں وہ اس امر پر مصر ہیں کہ برطانوی ہند کی حکومت جس کے ساتھ ان کا اشتراک ہو ذمہ دارانہ حکومت ہو اور موجودہ حکومت کی طرح مطلق العنان حکومت نہ ہو۔

جوں جوں والیانِ ریاست کی طرف سے اس پوزیشن کی وضاحت کی گئی، کانفرنس میں ایک زندگی کی سی روح پیدا ہونی شروع ہوگئی اور برطانوی ہند کے نمائندوں نے محسوس کیا کہ اب برطانیہ کو اس امر کے سوا چارہ نہیں کہ وہ اس متفقہ مطالبہ کو منظور کرلے۔

اقلیتوں کا مطالبہ

اقلیتوں کی طرف سے یک زبانی کے ساتھ اس مطالبہ کی تائید کی گئی، گو قدرتی طور پر اقلیتوں کے نمائندوں نے اس امر پر اصرار کیا کہ آئندہ نظام حکومت میں ان کے حقوق کی پوری نگہداشت کی جائے۔ اور ان کے تحفظ کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے تاکہ وہ اپنے حقوق اور اپنے مستقبل کے متعلق مطمئن ہو کر اکثریت کے دوش بدوش ملک کی خدمت کر سکیں اور اس کی آئندہ ترقی میں ممد ہو سکیں۔ اور اس اصول سے کسی کو اختلاف نہ تھا۔ سر تیج بہادر سپرو و دیگر قومی نمائندگان نے اس امر کو وضاحت کے ساتھ تسلیم کیا تھا۔

کہ کوئی ایسا آئین یا نظام جس سے اقلیتوں کو اطمینان نہ ہو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

برطانوی قدامت پسندوں کا خیال

لارڈ پیل کی تقریر جو انہوں نے قدامت پسند لوگوں کے نمائندہ کی حیثیت سے کی، کوئی دل خوش کن نہ تھی۔ لیکن اس مرحلہ پر اس تقریر سے کسی کو مایوسی نہیں ہوئی۔ کیونکہ ہندوستان کے دعاوی اور مطالبات پیش ہو رہے تھے۔ کچھ دلائل بیان ہو چکے تھے اکثر باقی تھے۔ کسی کو یہ توقع نہ تھی کہ تین چار تقریریں سننے کے بعد انگلستان کے قدامت پسند گروہ کی طرف سے اعلان کر دیا جائیگا کہ آئندہ حکومت ہند ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دی جاتی ہے۔

سر آغا خاں کی صاف بیانی

آخر میں تمام کانفرنس کی طرف سے اصرار کیا گیا کہ ہز ہائینس سر آغا خاں بحیثیت سرکردہ نمائندگان برطانوی ہند تقریر کریں۔ ہز ہائینس نے ایک مختصر سی تقریر میں بیان کیا کہ آپ نے ہندوستان کی متعدد آواز کو سن لیا۔ کانفرنس کے ہر گوشہ سے یہ صدا آ رہی ہے کہ ہندوستان کی حکومت ایک ذمہ دار حکومت ہونی چاہیئے۔ اور ملک کے سامنے جوابدہ ہونی چاہیئے۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس مطالبہ کو تسلیم کیا جائے اور آئندہ نظام حکومت اسی اصول پر ترتیب دیا جائے۔ باقی رہا اقلیتوں کے حقوق کا سوال، سو ہم ایسا نظام حکومت تجویز کرنا چاہتے ہیں۔ جس سے اقلیتوں کا پورا اطمینان ہو۔ ہم کوشش کریں گے کہ ایسا نظام حکومت تیار کریں، اور اگر تیار ہونے پر اس سے اقلیتوں کا اطمینان نہ ہو تو ہم ایک اور نظام تیار کریں گے جس پر وہ رضامند ہو سکیں اور اگر اس سے بھی ان کا اطمینان نہ ہو تو ہم پھر کوشش کریں گے اور کوشش کرتے چلے جائیں گے، جب تک ہم اقلیتوں کا اطمینان کر سکیں اور ان کی آزادانہ رضامندی حاصل کر سکیں۔"

ہندوستانی مطالبات کی عام اشاعت اور تائید

ان چار دن کی کارروائی کا سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ نہ صرف حکومت برطانیہ۔ پارلیمنٹ۔ اور برطانیہ کی پبلک کے سامنے بلکہ تمام دنیا کے سامنے ہندوستان کے دعاوی اور مطالبات اس وضاحت اور عمدگی کے ساتھ پیش کر دئے گئے جو کسی اور طریق سے کرنے ممکن نہ تھے۔ اور دنیا بھر میں ہندوستان کے حقوق اور مطالبات کی اس قدر اشاعت ہوئی کہ پہلے نہ ہوئی تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ اور اگر اس کانفرنس کی صورت میں وہ حقوق اور مطالبات پیش نہ کئے جاتے تو اس قدر اشاعت آج بھی ناممکن تھی۔ انگلستان میں تو کرکس و ناکس کے سامنے ان دنوں میں ہندوستان ہی ہندوستان تھا۔ اور کانفرنس کی کارروائی کا ہر طبقہ میں نہایت غور سے مطالبہ کیا جاتا تھا۔ ان چار دن کی کارروائی کا اثر جو انگلستان کی رائے عامہ پر ہوا اس کا اندازہ اس چھوٹے سے واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک دن دو نمائندے جب کرایہ کی موٹر کار سے اترے اور کار ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا تو اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے نہایت ادب سے کہا۔" صاحبان آپ اپنے ملک کی آزادی کے لئے کوشاں ہیں اور میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ آپ کی کامیابی کے ہر وقت خواہاں ہیں۔" گویا انگلستان کی طرف سے ہندوستان کو یہ ایک غیر سرکاری پیغام تھا۔

دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ والیان ریاست نے نہ صرف یہ تسلیم کیا کہ ان کے فوائد برطانوی ہند کے ساتھ مشترک ہیں بلکہ اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ وہ ابھی سے ایک متحدہ نظام حکومت میں شامل ہونے کے لئے تیار ہیں۔ اور اس سے تمام مسئلہ کی شکل ہی بدل گئی اور برطانوی نمائندوں کے لئے حکومت ہند میں ذمہ داری کے اصول کو تسلیم کرنا آسان ہو گیا۔

تیسرا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کانفرنس کے ہر طبقہ نے ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کے قائم کئے جانے کی تائید کی اور اس طرح اس مسئلہ پر برطانوی ہند کے ہر طبقہ اور ریاستوں کے اتفاق اور اتحاد کا کامل مظاہرہ ہو گیا۔

ان کامل اجلاسوں کے اختتام تک ہر نمائندہ کو یہ اطمینان ہو چکا تھا کہ اب کانفرنس ناکام نہیں رہیگی۔

اور اب یہ مرحلہ آگیا تھا کہ نظام حکومت کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے بعض اصول طے کر دئے جائیں تاکہ آئندہ نظام حکومت کی ہیئت کذائی کا ایک خاکہ تیار ہو جائے۔ اور اس کام کے لئے ضروری تھا کہ کانفرنس کو مختلف کمیٹیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

سب کمیٹیوں کا تقرر اور ان کے کارنامے

چنانچہ سب سے پہلے اور سب سے اہم کمیٹی فیڈرل کمیٹی قائم کی گئی، اور اس کمیٹی کے سپرد فیڈرل اور مرکزی حکومت کا خاکہ تیار کرنا ہوا۔ اس کمیٹی کے صدر لارڈ سینکی اور لارڈ چانسلر تھے۔

دوسری کمیٹی صوبجات کے نظام حکومت پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی کے صدر مسٹر ہینڈرسن وزیر امور خارجہ تھے۔

تیسری کمیٹی برما کے ہندوستان سے علیحدہ کرنے کے طریق پر غور

کرنے کے لئے مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی کے صدر لارڈ پیل نائب وزیر ہند تھے۔

چوتھی کمیٹی حقوق رائے دہندگی کی شرائط پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی کے صدر سر ولیم جاوٹ اٹارنی جنرل تھے۔

پانچویں کمیٹی ملازمتوں کے مستقبل پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی کے صدر بھی سر ولیم جاوٹ اٹارنی جنرل تھے۔

چھٹی کمیٹی صوبۂ سرحد کے نظام حکومت پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی کے صدر مسٹر ہینڈرسن وزیر خارجہ تھے۔

ساتویں کمیٹی اقلیتوں کے حقوق پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی کے صدر خود وزیر اعظم تھے۔

آٹھویں کمیٹی تحفظ ہند کے متعلق مسائل پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی۔ اس کے صدر مسٹر طامس وزیر نوآبادیات تھے۔

نویں کمیٹی سندھ کی صوبہ بمبئی سے علیحدگی کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی۔ اس کے صدر لارڈ رسل نائب وزیر ہند تھے۔

یہ کمیٹیاں مختلف مراحل پر مقرر کی گئیں۔ اور مقرر ہوتے ہی ہر ایک کمیٹی نے اپنا اپنا کام شروع کر دیا۔

جب فیڈرل اور صوبجاتی کمیٹیاں بہت حد تک اپنا کام مکمل کر چکیں تو ایک مشترکہ سب کمیٹی ان دونوں کمیٹیوں کی مقرر کی گئی جس کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ موجودہ مرکزی محکمہ جات کی فہرستوں پر غور کر کے سفارش کرے کہ ان میں سے کون کون سے محکمے آئندہ جزوی یا کلی طور پر صوبوں کے سپرد کئے جا سکتے ہیں۔ اس سب کمیٹی کے صدر لارڈ رینانڈ تھے۔

ایک مرحلہ پر وزیر اعظم نے اقلیتوں کی کمیٹی کے بعض ممبروں کو علیحدہ جمع کر کے ہندو مسلم مسئلہ کے تصفیہ کی کوشش کی اور گو یہ اجلاس اصطلاحاً کسی کمیٹی کا اجلاس نہیں تھا لیکن دراصل یہ اقلیتوں کی کمیٹی کی ایک سب کمیٹی تھی۔

سب کمیٹیوں کا ایک بڑا کام

کانفرنس کا اصل کام ان کمیٹیوں میں ہوا ہندوستان اور برطانیہ کے نمائندوں نے برابر بیٹھ کر جب نظام حکومت کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی غور کرنا شروع کیا تو جانبین کو ایک دوسرے کی مشکلات کا حقیقی احساس ہونے لگا اور ایک طرف تو ہندوستانی نمائندوں کا احساس ذمہ داری بڑھا اور انہوں نے ان مشکلات کا احساس کیا، اور انہیں تسلیم کیا جو نظریہ بافوں کی نظروں سے اکثر اوجھل ہو کر رہتی ہیں اور ان مشکلات کے لئے عملی حل تجویز کرنے پڑے۔ دوسری طرف برطانیہ کے نمائندوں کو ہندوستان اور ہندوستانیوں کے جائز حقوق اور شکایات اور تکالیف کا احساس ہوا۔ اور انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ نظام حکومت میں .... تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اور اس تبدیلی کے موٹے موٹے اصول طے ہوئے اور برطانیہ کے نمائندوں نے ان اصولوں کے متعلق اپنی اور اپنے اپنے سیاسی فرقوں کی تائید اور رضامندی کا اظہار کیا۔ اور جب اس طرح ان مسائل پر غور کیا گیا تو تمام امور جنہیں ناقابل حل قرار دیا جاتا تھا آسانی سے حل ہو گئے اور بڑی بڑی مشکلات آہستہ آہستہ کم ہوئیں اور آخر غائب ہو گئیں اور جو باقی رہ گئیں ان کے متعلق یہ احساس قوی ہوتا گیا کہ ان کا حل بھی ناممکن نہیں۔

ان کمیٹیوں کے اجلاس ۲۴ نومبر سے لیکر ۲۳ دسمبر تک اور پھر ۲۹ دسمبر سے لیکر ۱۴ جنوری تک گویا کل ڈیڑھ مہینہ ہوتے رہے۔ اور گو کمیٹیوں نے صبح شام کام کیا اور نمائندوں نے اپنے ذاتی آرام و آسائش اس عظیم الشان کام کی تکمیل کے لئے بالکل قربان کر دیئے لیکن پھر بھی مقام حیرت ہے کہ اس قدر قلیل عرصہ میں اتنا کام کس طرح سرانجام پا گیا۔

شروع جنوری تک فیڈرل کمیٹی کا کام اس مرحلہ تک پہنچ گیا تھا کہ لبرل پارٹی کی طرف سے لارڈ ریڈنگ یہ اعلان کر سکے کہ ان کی پارٹی اس اصل کو تسلیم کرتی ہے۔ کہ آئندہ حکومت ہند ایک ذمہ دار حکومت ہو اور ملک کے سامنے جوابدہ ہو لیکن یہ رضامندی دو شرائط کے ماتحت ہے اول یہ کہ دفاع ہند اور امور خارجہ کو فی الحال اس اصول کے اطلاق سے محفوظ کیا جائے اور مالیات کے معاملہ میں مناسب قیود عائد کی جائیں۔ اور دوسرے یہ کہ ہندو مسلم مسئلہ کا خاطر خواہ تصفیہ ہو جائے۔

سر سیموئیل ہور نے قدامت پسند فریق کی طرف سے صرف اتنا تسلیم کیا کہ ہم اس اصول کے مخالف نہیں ہیں لیکن اس مرحلہ پر ابھی ہم اس کی تائید نہیں کر سکتے۔ ہم پہلے اس امر پر اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں کہ مکمل نظام کی ہیئت کیا ہوگی۔

لیکن لارڈ ریڈنگ کے اعلان سے یہ اطمینان ہو گیا کہ حکومت ہند کے متعلق ذمہ واری کا اصول تسلیم کر لیا جائیگا۔

ان کمیٹیوں کی رپورٹیں کمیٹی کے اجلاس میں پیش ہوتی رہیں اور مختلف نمائندوں نے مختلف پہلوؤں سے ان پر بحث و تنقید کی جو نوٹ کی گئی۔

آخر جب یہ تمام رپورٹیں مع اس بحث و تنقید کے کانفرنس کے سامنے پیش ہوئیں اور ان پر عام بحث ہوئی اور یہ قرارداد منظور ہوئی کہ یہ رپورٹیں مع تنقیدی نوٹوں کے ہندوستان کے آئندہ نظام حکومت کے ترتیب دئے

سینما

فلم سازی کی صنعت پر بولتی چالتی تصاویر کا اثر

تہذیب حاضرہ میں سائنس کی جن ایجادوں نے عالمگیر دلچسپی پیدا کی۔ ان میں سینما سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ وہ خاموش تصاویر جو تھیٹروں میں سفید پردہ پر متحرک نظر آتی ہیں۔ دنیا بھر کی اقوام کے لئے یکساں ...... لطف انگیز اور سبق آموز ہیں۔ سلسلہ تلغراف، ٹیلیفون لاسلکی اور ریڈیو نے وقت اور فاصلہ کی حدود کو شکست دیکر اقوام عالم کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ اور دنیا میں یک جہتی پیدا کرنے کے لئے پریس یعنی اخبارات نے نہایت مہتم بالشان کام کیا۔ لیکن رنگ و نسل اور مذہب و ملت کے اعتبار سے مختلف قوموں کے افراد کو جس سحر کارانہ کشش کے ساتھ سینما نے مسحور کیا ہے۔ وہ اُسی کا حصہ ہے۔ آج ہم سینما کو پورے معنوں میں عالمگیر زبان کہہ سکتے ہیں۔ چارلی چیپلن کے ڈرامے سے اگر برنارڈ شا ایسی خاص شخصیت لطف اندوز ہوسکتی ہے۔ تو افریقہ کے "زولو" لوگ بھی اس کی مضحک حرکات پر قہقہہ زن ہوتے ہیں۔ فلم پر ڈوگلس فیئربینکس کے عشقیہ کارنامے ان لوگوں کے خون میں بھی ایک ولولہ انگیز حرکت پیدا کر دیتے ہیں۔ جن کے کان ابھی انگریزی الفاظ سے آشنا نہیں ہوئے۔

سینما کی اسّی فیصدی تصویریں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تیار ہوتی ہیں اور اگرچہ وہ مغربی تہذیب و تمدن کی حقیقی رُوح کی آئینہ دار نہیں ہوتیں۔ تاہم اس میں کلام نہیں کہ عالمگیر اتحاد و ارتباط کی تحریک میں اُنہوں نے نہایت گرانقدر حصہ لیا ہے۔ یہ حقیقت کسقدر دلچسپ ہے۔ کہ سینما کی متحرک تصاویر کی خاموشی دنیا بھر کی مشترکہ زبان تھی۔ اور جونہی ان میں صوتی[1] عنصر داخل ہوا اُن کے طلسم کی ہمہ گیری ٹوٹ گئی۔ یہ ظاہر ہے کہ بولتی چالتی تصویروں کی حیثیت عالمگیر نہیں ہوسکتی۔ اُن کی اپیل اس زبان تک محدود رہیگی جس میں وہ تیار کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "ٹاکی[2]" کے منظرِ عام پر آتے ہی "ہالی ووڈ[3]" میں اُن ایکٹروں اور ایکٹرسوں پر رعشہ طاری ہوگیا۔ جو انگریزی سے نابلد ہونے کے باوجود سینما کے آسمان کے "درخشندہ ستارے" تھے۔ خاموش تصویریں اپنی مقبولیت کے لحاظ سے بین الاقوامی تھیں۔ اُن کے برعکس بولتی چالتی تصویر کا حلقۂ اثر محدود ہے۔ وہ ایک "تنگ قومیت" کی ترجمان ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں۔ کہ جب سے "ٹاکی" کا رواج ہوا ہے یورپ کے تقریباً ہر ایک ملک میں اسی کی بنا پر ہنگامے رونما ہو چکے ہیں۔ "پریگ" جرمن زبان کا ایک فلم دکھایا گیا۔ زیکوسلافی لوگ اس کے متحمل نہ ہوسکے۔ اُنہوں نے تھیئٹر کو بم سے اُڑا دیا

پولینڈ کے دارالحکومت وارسا میں بھی ایک جرمن فلم خوفناک فساد پر منتج ہوا۔ ابھی حال کا ذکر ہے۔ کہ پیرس میں انگریزی زبان کا فلم دکھایا جا رہا تھا۔ پیرس کے جتنے "اہلِ زبان" گیلری میں موجود تھے۔ وہ اس "غیر" زبان سے اسقدر برافروختہ ہوئے۔ کہ انہوں نے شور برپا کردیا۔ اور آخر منتظمین کو کھیل بند کرنا پڑا۔ سرویا کے شہر سراجیو کا واقعہ ہے کہ وہاں سامعین کے کانوں میں جیسے ہی ایک غیر مانوس زبان کے الفاظ پڑے اُنہوں نے جوشِ غضب میں تھیئٹر کی کرسیاں توڑ ڈالیں۔ جنوبی امریکہ کے متعدد شہروں میں اجنبی زبان کے فلموں کی بنا پر فساد ہو چکے ہیں۔ ناظرین کو غالباً معلوم ہوگا کہ

"All Quiet on the Western Front"

(محاذِ مغربی پر کامل سکون) کے عنوان سے جرمن مصنف ریمارک کی کتاب عالمگیر خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ یہ ناول ۱۹۲۹ء کے اپریل میں شائع ہوا۔ اور اسی ماہ میں اس کے نصف درجن ایڈیشن نکل گئے۔

ہالی ووڈ میں جو امریکن فلم سازی کا مرکز ہے، اس امن آموز ناول کو ایک اعلیٰ درجہ کی انگریزی "ٹاکی" میں متشکل کیا گیا۔ جب جرمنوں نے اس ٹاکی کو اپنے تھیئٹروں میں سُنا اُن کے جذبات مشتعل ہوگئے۔ اور فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اور تو اور خاص انگلستان میں تعلیم یافتہ لوگوں کو امریکن لہجہ و تلفظ سے اسقدر چڑ ہے۔ کہ وہاں ابھی تک امریکہ کی بولنے والی تصاویر کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔

---

[1] آواز کا جزو

[2] ٹاکی۔ بولنے والی تصویریں۔

[3] کیلی فورنیا امریکہ میں ایک مقام جہاں سینما کی فلم تیار ہوتی ہے۔

بین الاقوامی حیثیت سے صوتی تصویریں کس حد تک اتحاد سوز ثابت ہوئی ہیں - اس کی تازہ مثال ہسپانوی زبان کے فلموں سے ملتی ہے - ہالی ووڈ میں ایک ٹاکی تیار کی گئی - جس کے لئے میکسیکو کیوبا اور گواٹیمالا سے ایکٹر منگائے گئے جن کی زبان ہسپانوی ہے - یہ ٹاکی اسپین میں پہنچی - وہاں کے لوگوں پر اس کا وہی اثر ہوا - جو خاص دہلی و لکھنؤ کی بیگماتی زبان بولنے والوں پر اُس شخص کے اردو تلفظ سے ہو سکتا ہے - جو جھنگ کا رہنے والا ہو - خالص ہسپانیوں نے اس نام نہاد ہسپانوی ٹاکی کو قہقہوں میں اُڑا دیا - اور امریکن کمپنی کو سخت نقصان اٹھانا پڑا -

بولنے والی تصویروں کا سب سے بڑا دائرۂ اثر انگریزی داں پبلک تک محدود ہے - ہسپانوی زبان دوسرے درجہ پر ہے - خاص اسپین کو چھوڑ کر میکسیکو سے لیکر جنوبی امریکہ کے سرے تک یہ زبان بولی جاتی ہے - اس کے بعد جرمن اور پھر فرانسیسی زبان ہے - فلم ساز کمپنیوں کو ٹاکی کی صنعت میں زبان کے مذکرہ بالا مدارج کو مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے - لیکن اب تو ہر قوم کو اپنی مخصوص زبان میں فلمیں تیار کرانے پر اصرار ہے -

پرتگال میں ہسپانوی زبان کے فلم دکھائے جاتے تھے - اب ہاں کے لوگ فلموں میں پرتگالی زبان کی شمولیت چاہتے ہیں - ٹرکی یونان اور مصر میں فرانسیسی فلم مقبول تھے - اب ترک ترکی اہل یونان یونانی اور اہل مصر عربی زبان کے فلم کا تقاضا کر رہے ہیں - ناروے اور سویڈن میں جرمن فلموں کا رواج تھا جب سے ٹاکی شروع ہوئی - وہاں کے لوگ جرمن زبان سے بیزار ہیں - اور خاص اپنی اپنی زبانوں کے فلم دیکھنا اور سننا چاہتے ہیں -

ٹاکی کے ذریعہ سینما کی صنعت میں جو انقلاب رونما ہوا - اس کی ابتدا ۱۶ اگست ۱۹۲۶ء میں ہوئی - جب وارنر برادرز نے "ڈان جان" کے عنوان سے بولنے والی تصویر پیش کی - لوگوں نے اس جدت کو بہت پسند کیا لیکن اس کے ساتھ ہی سینما کی عالمگیر دلچسپی کا راز جو خاموشی میں مضمر تھا جاتا رہا - اب بمبئی میں ایک ٹاکی اردو زبان میں تیار ہوئی ہے - بھلا ہندی والے کب تک خاموش رہیں گے - پھر تامل تلیگو - کناری - مرہٹی بنگالی گجراتی سندھی کی باری آئیگی - بعد ازاں پنجابیوں کی "غیرت کا امتحان" ہوگا - اور وہ اعلان کر دینگے کہ ہم ٹاکی سنیں گے تو پنجابی میں -

جان ڈرن کے بعد تقریباً چھ ماہ کے اندر خاموش تصویروں میں صوتی عنصر داخل کرنے کی تیاریاں مکمل ہوگئیں - سینما کے مشہور اخبار "فلم ڈیلی" کا بیان ہے کہ ہالی ووڈ میں ایک سٹوڈیو کو "صوتی" بنانے میں ۳ لاکھ ڈالر سے کم خرچ نہیں آتا - صرف آلۂ صوت کی قیمت ۵ ہزار سے ۱۵ ہزار ڈالر تک ہے - امریکہ میں سینما تھیٹروں کی تعداد گیارہ ہزار ہے - اور اندازہ ہے کہ ان میں بولنے والی تصاویر کے لئے نئے ساز و سامان پر ۵ کروڑ سے ۱ کروڑ ڈالر صرف ہوئے - اور اس اثنا میں وہ مشہور ایکٹر اور ایکٹریس جن کی ایک ہفتہ کی تنخواہ سنکر ایک عامی کا سر چکرانے لگتا ہے - اپنے بیش قرار مشاہرے برابر وصول کرتی رہیں - اور کر رہی ہیں - اگرچہ وہ انگریزی زبان سے واقف نہیں - اور بولتی چالتی تصاویر میں وہ کسی کام نہیں آسکتیں - لیکن معاہدوں کے مطابق سینما کمپنیاں انہیں سالہا سال تک تنخواہ دیتے جائینگی -

اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں، کہ خاموش تصاویر کے مقابلہ میں ٹاکی پر بہت زیادہ خرچ اُٹھتا ہے - ٹاکی کی ایک ریل کے لئے ایک ہزار ڈالر رائلٹی کے طور پر دینا پڑتا ہے - پھر مکالمہ نگاروں کی اُجرت غضبناک حد تک بڑھ گئی ہے - وہ فی ہفتہ ۳ سو سے لیکر ایک ہزار ڈالر وصول کر لیتے ہیں - ان مصارف سے قطع نظر یہ امر نہایت وقت آفریں ہے کہ مختلف ملکوں کے لئے انہی کی زبان میں فلم تیار کئے جائیں - اس کے لئے کثیر سرمایہ کی ضرورت ہے - امریکہ کی پیرامونٹ کمپنی نے اس غرض کے لئے خاص پیرس میں بیس لاکھ ڈالر کے صرف سے ایک عظیم الشان سٹوڈیو کھولا ہے - جہاں ۱۲ مختلف زبانوں میں فلم تیار کئے جاتے ہیں - ٹاکی کا مسئلہ حل کرنے کے لئے روپیہ کے علاوہ ہر مرحلہ پر سائنس کی ضرورت ہے -

نئے آلاتِ صوت میں آواز کو اس طرح منضبط کیا جاتا ہے - کہ مکالمہ صاف سنائی دے - ان آلات میں ایسا التزام رکھا گیا ہے کہ آواز کا فوٹو لیا جائے - اور جونہی تصویر پردے پر منعکس ہوتی ہے - روشنی آواز میں بدل جاتی ہے -

ٹاکی نے فلم سازی کی صنعت کو ایک عظیم آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے - اسے کامیاب بنانے کے لئے سرمایہ، سائنس، کاروباری حسیات، وسعتِ نظر، اور تخیل کی ضرورت ہے -

(ملک یوسف العزیز)



سائنس کی دنیا

موسمی تغیرات پر سائنس کا اقتدار ۴

ماہرین سائنس نے ایک ایسا انکشاف کیا ہے۔ جو صنعتی دنیا میں نہایت وسیع الاثر انقلاب پیدا کر دیگا۔ اس نئی دریافت کی بنا پر بعض صنعتی کارخانوں میں موسمی حالات کو درجۂ اعتدال پر لانے کا عمل شروع ہو گیا ہے اور تجارتی دنیا میں ایک عظیم تبدیلی رونما ہے۔

کیمیائی برف

سائنس کا یہ تازہ کارنامہ کیمیاوی برف کی ساخت ہے۔ موسم گرما میں خوشگوار تغیر پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ مصنوعی برف ہے جو پانی کو منجمد کرنے سے بنائی جاتی ہے۔ کیمیاوی برف اس سے جداگانہ چیز ہے۔ اور جہاں تک برودت کا تعلق ہے کیمیاوی برف کے سامنے مصنوعی برف کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس نئی برف کی مدد سے تازہ ترکاریوں اور پھلوں اور دیگر اشیائے خوردنی کو مدت تک قائم رکھنے کی صنعت میں ایک نیا دور آ رہا ہے۔ امریکہ کے مشہور ظریف مارک ٹوین کا قول تھا۔ کہ جب لوگ آپس میں ملتے ہیں تو سب سے پہلے موسمی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ لیکن اس کیفیت کو بدلنے کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ اگر آج مارک ٹوین زندہ ہوتا تو وہ ان ماہرین سائنس کی جدت کی داد دیتا۔ جن کے طفیل انسان کو موسمی اثرات زائل کرنے کی قدرت حاصل ہو گئی ہے۔

ماکولات پر عمل انجماد کا اثر

آج سے پچیس تیس سال پیشتر لوگ مصنوعی برف کو غیر ضروری بلکہ مضر صحت سمجھتے تھے۔ لیکن اب یہ حالت ہے۔ کہ کم سے کم ۱۰۰ صنعتوں میں عمل انجماد سے کام لیا جاتا ہے۔ یہی لوگ جمی ہوئی اشیائے خوردنی کو چنداں پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کی یہ وجہ تھی۔ کہ گوشت اور سبزیوں اور پھلوں کو برف میں رکھنے سے ان کے ذائقہ اور غذائیت میں فرق آجاتا تھا۔ جدید تحقیقات سے ثابت ہو گیا ہے۔ کہ ماکولات[1] کو آہستہ آہستہ جمانا غلطی ہے۔ ان کا رنگ و بو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ عمل انجماد نہایت سریع ہو۔

ترکاریاں اور پھل سال بھر خراب نہ ہوں

منطقہ حارہ کی بعض ترکاریاں اور پھل اسقدر نازک ہیں کہ وہ چند دن میں خراب ہو جاتے ہیں لیکن اب یہ حالت ہے کہ سٹرابری (Strawberry) ایسا نازک پھل ایک سال تک تازہ رہ سکتا ہے۔ اب کارخانوں، دفتروں اور مکانوں کے اندر خوشگوار درجۂ حرارت پیدا کرنے کے لئے نہ پنکھوں کی ضرورت ہے نہ مصنوعی برف کی۔ حال میں نیویارک کی ایک تفریح گاہ میں پہلے دن رقص و سرود کی محفل گرم رہی۔ اور دوسرے دن برفانی ملکوں کے کھیلوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ کیمیاوی برف کا معجزہ ہے۔ یہ برف منجمد پانی نہیں بلکہ کاربن ڈائکسائڈ کی ٹھوس صورت ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں۔ کہ آبی برف کا درجۂ حرارت صفر ہے۔ منجمد کاربن ڈائکسائڈ اس آبی برف سے ۱۴۴ گنا ٹھنڈی ہے۔ یہ اسقدر سرد ہے کہ اگر آپ اسے ایک لمحہ کے لئے چھو جائیں تو فوراً چھالے پڑ جائیں جس طرح برف سے آبلے پڑ جاتے ہیں۔ اگر کسی ترکاری یا پھل کو آبی برف میں رکھا جائے۔ تو برف آہستہ آہستہ اس کے رس کو منجمد کر دیتی ہے۔ جس سے اس کا ذائقہ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ کاربن ڈائکسائڈ والی کیمیاوی برف کی حالت میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس سے پھل پر فوراً ایک قسم کی کھرسی جم جاتی ہے۔ اور وہ اندر سے بجنسہٖ تازہ رہتا ہے۔

کیمیائی برف کی ایک اور خوبی

کیمیاوی برف میں ایک اور خوبی ہے اگر ایک صندوق میں جو اس سے ٹھنڈا کیا گیا ہو۔ پندرہ بیس قسم کی مختلف اشیائے خوردنی کو منجمد کیا جائے۔ تو ان کی خوشبو باہم نہیں ملتی۔ بلکہ ہر چیز اپنی انفرادی حالت میں مقید رہتی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ میں کیمیاوی برف کی مدد سے پالک، مٹر، سٹرابری اور گرم ملکوں کے نازک پھل اپنی ابتدائی بُو، رنگ اور ذائقہ کے ساتھ ایک سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت تک قائم رکھے جاتے ہیں۔ اور غیر موسمی

---

[1] کھانے کی چیزیں۔

اشیاء کا نرخ اُن کی افراط کے باعث گراں نہیں ہوتا - ان اشیائے خوردنی کو صفر سے پچاس درجۂ حرارت کم پر منجمد کیا جاتا ہے - اور پھر انہیں لگاتار صفر سے ۲۲ درجۂ حرارت پر رکھا جاتا ہے -

آئس کریم بنانے کا امریکن طریقہ

اب امریکہ میں آئس کریم یعنی ملائی کی برف آبی برف سے تیار نہیں کیجاتی - بلکہ کیمیاوی برف کی مدد سے اسے کامل ایک ماہ تک قائم رکھ سکتے ہیں - اور اس کے ذائقہ میں کوئی فرق نہیں آتا -

پانی ۳۲ درجۂ حرارت پر جم کر برف بن جاتا ہے - لیکن کاربن ڈائکسائڈ مرہی چیز ہے - جس کی وجہ سے سوڈا واٹر میں بلبلے اُٹھتے ہیں - اور جس کے جوش اور اُبال سے پانی کا ذائقہ تیز اور خوشگوار ہوجاتا ہے - یہ وہی گیس ہے جو عملِ حرارت سے پیدا ہوتی ہے - دوسرے لفظوں میں ہوا اور پانی کی طرح اس کا ذخیرہ غیر محدود ہے - چونے پر پانی ڈالنے سے یہی کاربن ڈائکسائڈ پیدا ہوتی ہے - اندازہ کیا گیا ہے - کہ دنیا بھر میں ایک ارب بیس کروڑ ٹن کوئلہ ایک سال میں جلایا جاتا ہے - اور اسی سے ۴ کروڑ ٹن کاربن ڈائکسائڈ گیس پیدا ہوتی ہے - صنعتی کارخانوں میں ایک ٹن کاربن ڈائکسائڈ بنانے پر مختلف حالات کے باعث ۴ روپیہ سے لیکر ۴۰ روپیہ تک خرچ آتا ہے - ارباب صنعت اس کوشش میں ہیں کہ مالی لحاظ سے اس پیداوار کو ایک خاص مقررہ معیار پر لایا جائے - ۵ سو گیلن آئس کریم جمانے کے لئے ایک ہزار پونڈ آبی برف اور ۲۲۵ پونڈ نمک درکار ہے - آئس کریم کی یہی مقدار ۹۰ پونڈ وزنی کاربن ڈائکسائڈ سے تیار ہوسکتی ہے -

ایک اور فائدہ

اس ضمن میں ایک امر قابلِ ذکر ہے - کاربن ڈائکسائڈ کی یہ خصوصیت ہے - کہ جو اشیاء خوردنی اس میں رکھی جائیں - یہ اُن پر فادِ زہر کا اثر رکھتی ہے - اس سے گوشت اور مچھلی کے اندر مختلف قسم کے جراثیم ہلاک ہوجاتے ہیں - کاربن ڈائکسائڈ کے تجارتی اور صنعتی امکانات کو مدِنظر رکھ کر بہت سے کارخانے اسے وسیع پیمانہ پر تیار کر رہے ہیں - اور اس کا استعمال روز بروز ترقی ہے -

تھیٹر کو سرد رکھنے کا طریقہ

نیویارک کے اکثر تھیٹروں میں درجۂ حرارت کو اعتدال پر رکھنے کے لئے یہی برتی جاتی ہے - گرمیوں میں ایک بڑے تھیٹر کو سرد رکھنے کے لئے تعداد سو پونڈ وزنی آبی برف کے پانچ ہزار ٹکڑے ... درکار ہیں ان ٹکڑوں سے ہوا ٹکرا کر تھیٹر میں داخل ہوتی ہے - ایسا ہر برفانی قطعہ ۳۲ انچ لمبا ... چوڑا اور ۱۱ انچ موٹا ہوتا ہے - ایسے پانچ ہزار قطعوں کو برف کے کارخانہ سے تھیٹر تک لانے کے لئے دو دو ٹن کی ڈھائی سو موٹر لاریوں کی ضرورت ہے - آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں - کہ تھیٹر کے اندرونی حصے کو خوشگوار حد تک سرد رکھنے کے لئے کسقدر محنت اور روپیہ کی ضرورت ہے - اس کے مقابلے میں یہی کام صرف پانچ سو ٹن کاربن ڈائکسائڈ سے بخوبی ہوسکتا ہے - اور ہو رہا ہے - اس وقت کم از کم ۳ سو سینما تھیٹروں، ۳ ہزار کارخانوں اور دو سو صنعتوں میں کاربن ڈائکسائڈ کی مدد سے حسب منشا موسمی کیفیت پیدا کی جاتی ہے - نیویارک کے چڑیا گھر میں مصنوعی سردی کے ذریعے سے برفانی ملکوں کے جانوروں کے عادات کا مطالعہ کیا جارہا ہے -

مکان کو گرم یا سرد رکھنے کی سہولتیں

ایک انجنیئر کا بیان ہے - کہ عنقریب مستقبل میں ہر شخص اپنے مکان میں اپنی مرضی کے مطابق موسمی تبدیلی پیدا کر سکیگا - اب بٹن دباتے ہی بجلی کی انگیٹھی گرم ہوجاتی ہے - آئندہ برفانی حالت پیدا کرنے کے لئے صرف بٹن دبانے کی ضرورت ہوگی - اور یہ کام اتنا آسان ہوگا جتنا اب خالص پانی کی بہم رسانی ہے -"

۱۹۳۰ء کا موسم گرما اہلِ امریکہ کے لئے بہت تکلیف دہ اور صبر آزما تھا - ریلوے حکام نے مسافروں کی سہولت کے لئے کاربن ڈائکسائڈ کی مدد سے ریل کا سفر نہایت خوشگوار بنا دیا تھا - موجودہ حالت میں لوگ زیادہ تر کول گیس کی مدد سے انگیٹھیاں اور چولھے گرم کرتے ہیں - عنقریب سردی پیدا کرنے کے لئے کاربن ڈائکسائڈ گیس کام آئیگی - اب چائے قہوہ اور دودھ کو دیر تک گرم رکھنے کے لئے تھرموس بوتل سے کام لیا جاتا ہے - آئندہ چیزوں کو مہینوں سرد رکھنے کے لئے بھی خاص برتن بنائے جائینگے - - -

نسوانی دُنیا

مشرق میں نسوانی تحریک پر ایک نظر

جاپان چین، ہندوستان، مصر، ٹرکی اور شام میں نسوانی تحریک نے بہت قلیل مدت میں جو ترقی کی ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت حوصلہ افزا ہے۔

اس تحریک کی حقیقی ابتدا مشرقِ قریب میں ہوئی۔ جب جنگِ فرنگ کے دوران میں ترکانِ احرار ایک جاں گسل کشمکش میں مبتلا تھے۔ اور اُن کی عورتیں میدانِ کارزار میں طبی خدمات سرانجام دے رہی تھیں۔ جنگ کے بعد مصطفٰے کمال نے جمہورِ ترکیہ کی صدارت پر متمکن ہوتے ہی ایک تاریخی اعلان میں پردہ اور کثرتِ ازدواج کی رسوم کو یک قلم موقوف کر دیا، اور عورتوں کو مردوں کے ساتھ کامل قانونی مساوات کا درجہ دے دیا۔ ممکن ہے بعض اصحاب اس نئے دَور کو ایشیا کی سابقہ روایات کے کسی قدر منافی سمجھیں۔ لیکن اس معاملہ پر احساسِ تناسب اور وسعتِ نظر کے ساتھ غور کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے لازمی تھا۔ کہ ملکی استعمار میں عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کریں۔ ٹرکی میں لطیفی خانم سلمٰے اکرم اور خالدہ خانم نسوانی تحریک کی روحِ رواں ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے عورتوں کے لئے مساوی حقوق کی مہم جاری کی۔ ۱۹۱۶ء میں ترکی یونیورسٹیوں میں عورتوں کے لئے داخلہ کھُل گیا۔ اور انہوں نے جدید علمی مواقع سے یہاں تک فائدہ اٹھایا۔ کہ آج پبلک زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جہاں عورتیں کامیابی سے شامل نہ ہوں۔ تجارت کے میدان میں عدالت کی کرسی پر فوجی کیمپ میں صنعتی درسگاہوں میں سینما اور تھیئٹر میں عورتوں نے اپنی صلاحیت کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے۔ آج ایک سیاح استمبول میں ترکی عورتوں کو دیکھتا ہے۔ اور بے اختیار کہتا ہے۔ کہ واقعی "یورپ کے مردِ بیمار" میں زندگی کی نئی لہریں موجزن ہیں ایشیا کی نسوانی تحریک میں مصر دوسرے درجے پر ہے۔ مصری خواتین کو قومی اور بین الاقوامی سیاسیات میں گہری دلچسپی ہے۔ وہ عالم گیر تحریکوں کا وسعتِ نظر سے مطالعہ کرتی ہیں۔ اور اپنی بہنوں کو تعلیم دینے کے لئے سرگرم و متواتر مساعی میں مصروف ہیں۔

حکومتِ مصر نے اپنے میزانیہ کا صرف ۲ فیصدی تعلیم نسواں کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ مصری عورتیں اس میں معتدبہ اضافہ کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ وہ لڑکیوں کے لئے عام اور جبری تعلیم پر زور دیتی ہیں۔ انہوں نے اپنے ملک میں ہسپتال اور شفاخانے کھول رکھے ہیں۔ اُن کی رہنما احسان احمد شاکر ایک مشہور مقالہ نگار اور علومِ غربیہ کی جامع خاتون ہیں۔ چند سال ہوئے۔ آپ نے بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے ارادہ کیا۔ قدامت پسندوں نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ لیکن آپ کے عزم میں کوئی لغزش نہ آسکی۔ آپ نے بیروت (شام) میں چار سال تک پڑھنے کے بعد ڈگری حاصل کر لی۔ بعدازاں آپ نے امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں حصولِ تعلیم کی غرض سے وظیفہ طلب کیا۔ لیکن صیغۂ تعلیم نے انہیں پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا۔ نسوانی تحریک کی لہریں استنبول سے اٹھکر ملک شام تک جا پہنچی ہیں۔ دمشق میں انجمنِ خواتین کی صدر مس نازک عبید ایک نہایت مستقل مزاج اور قابل کارکن ہیں۔ آپ کی شریک کار مادام جُولیا نے عورتوں کی اصلاح و ترقی کے لئے ایک ماہوار رسالہ جاری کر رکھا ہے، جو شام کی حدود سے نکل کر عراق، ایران، ٹرکی، مصر، عرب اور فلسطین تک نہائیت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سیاسیات سے متعلق ایک ہفتہ وار جریدہ بھی آپ کی زیرِ ادارت شائع ہوتا ہے۔ جس میں قومیت۔ فرانسیسی اور برطانوی حکم برداری جمعیت اقوام کے فیصلے مسئلہ موصل۔ کُردی، ترکی۔ ایرانی قضیہ۔ معاملاتِ ہند۔ ہندوستان کے قومی مسائل۔ چین و جاپان کے حالات معرضِ بحث میں آتے ہیں۔

مشرقِ بعید میں بھی نسوانی تحریک نے قابلِ تحسین ترقی کی ہے چین میں اس تحریک کا مرکز کانٹن ہے۔ جہاں مشہور چینی قوم پرست ڈاکٹر سن یت سین کی بیوی انجمن خواتین کی رہنما ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنے زمانۂ اقتدار میں ایک اعلان کے ذریعہ عورتوں کو مردوں کے ساتھ مساوی حقوق عطا کئے تھے۔ اس اعلان کی نقل کانٹن کے ہر اسکول میں رکھی جاتی ہے۔ اور اسے روزانہ پڑھا جاتا ہے۔ کانٹن کی اکثر چینی عورتوں نے مردوں کا لباس اختیار کر لیا ہے۔ پیکنگ میں نظامِ حکومت کے قریباً ہر شعبہ میں عورتیں ملازم

ہیں۔ محکمۂ پولیس اور صیغۂ سراغ رسانی بھی اِن سے خالی نہیں۔ خواتینِ چین کا پہلا مشترکہ اجلاس سنہ ۱۹۲۰ء میں ہوا۔ اِس سے پہلے عورتوں کو کسی سیاسی جلسہ میں شریک ہونے کی ازروئے قانون اجازت نہ تھی۔ عورتوں نے اِس کے خلاف اسقدر شدید صدائے احتجاج بلند کی کہ حکومت نے اِس قانون کو منسوخ کر دیا۔ جاپان میں صنفِ نازک نے چند سال سے حیرت افزا ترقی کی ہے۔ جاپانی زبان میں بیوی کو "آکوساما" کہتے ہیں جس کے معنی ہیں "گھر کی رانی"۔ اب جاپانی عورت گھر کی چار دیواری میں محصور نہیں رہی۔ بلکہ اس نے شہریت کے میدان میں علوئے ہمت سے قدم رکھا ہے۔

طبابت خواتینِ جاپان کا مرغوب پیشہ ہے۔ جاپان میں ۱۲ عورتیں ڈاکٹر ہیں ۲۵ ہزار نرسیں ہیں۔ پانسو دندان ساز ہیں۔ اور ہزار ہا دوا ساز ہیں۔ اور وہاں ہر محکمے میں ملازمت کا دروازہ عورتوں کے لئے کھلا ہے، بلکہ وہاں عورتیں موٹر ٹیکسی چلاتی ہیں۔ اور کم سے کم ایک عورت صیغۂ بحری میں کپتان ہے۔ خواتینِ جاپان کی لیڈر مسز سوزوکی ہیں۔ جنہوں نے چاول کی تجارت سے اتنا روپیہ کمایا۔ کہ جب آپ کا بنک ٹوٹا تو سارے ملک کا مالی توازن متزلزل ہو گیا۔ واضح رہے۔ کہ آپ کا بنک کسی بدنظمی کی بنا پر نہیں ٹوٹا بلکہ اِس لئے کہ چین میں جہاں آپ کے چاول کی کھیت تھی خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اور مال فروخت نہ ہو سکا۔ جاپان کے پایۂ تخت ٹوکیو میں لڑکیوں اور عورتوں کے بیس سے زیادہ ماہانہ رسالے ہیں۔ جاپانی عورتوں کو مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ چونکہ جاپان میں ۹۸ فیصدی خواندہ لوگ ہیں۔ اِس لئے وہاں نئے خیالات کی نشوونما و ترویج نہایت آسان ہے۔ نسوانی رسائل میں صرف سینے پرونے اور کھانا پکانے کی باتیں نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان میں سیاسیات، مذہب، جنگ، مجلسیات۔ نسلی مسائل۔ اقتصادیات۔ حفظانِ صحت۔ محبت۔ مناکحت اور ازدواجی تعلقات پر نہایت خوش کن صاف بیانی کے ساتھ بحث کی جاتی ہے۔ انجمنِ خواتینِ جاپان کا عقیدہ عالمگیر اتحاد و امن ہے۔

وہ عورتوں اور مردوں کے لئے یکساں اخلاقی معیار قائم کرنے کی متمنی ہیں۔ یہ امر نہایت حوصلہ افزا ہے۔ کہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں ایشیائی خواتین بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں عورتوں کی تحریک ترکی، مصر، شام، جاپان اور چین کی طرح ہمہ گیر پیمانہ پر منضبط نہیں۔ لیکن جنہوں نے لاہور میں خواتینِ ایشیا کا گزشتہ اجلاس دیکھا ہے۔ وہ بہ وثوق کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہاں بھی غیر معمولی بیداری کا احساس موجود ہے۔ اور وہ دن دُور نہیں جب ہندوستان کی عورتیں اپنی دوسری مشرقی بہنوں کی طرح میدانِ عمل میں پیش پیش نظر آئیں گی۔

بیگم ڈاکٹر الیف، ڈی محمود

معلّم سے

تو اے معلّم متاعِ علم و ادب کی نیّا کا ناخدا ہے
جہاں میں تہذیب تیرے دم سے ہی۔ تو شرافت کا دیوتا ہے

زہے تری منکسر مزاجی۔ زہے تری بوریا نشینی
انہی کی برکت سے آئے دن تو کئی سکندر بنا رہا ہے

جو تیرے ظلِّ کمال پرور میں آتے ہیں بے تمیز بچے
تو اُن کو تو بہترین انسانیت کے سانچوں میں ڈھالتا ہے

فلک کی جس دم سے فرشِ خاکی پہ آفتابی کرن پڑی ہے
اُسی گھڑی سے جہاں میں اخلاق کے جواہر لٹا رہا ہے

یہ مدرسہ پایۂ تخت تیرا۔ یہ چھوٹے بچے ہیں فوج تیری
یقین ہوتا ہے دیکھ کر یہ کہ تو بھی چھوٹا سا بادشاہ ہے

جہاں کی خدمت ہی کام تیرا۔ اور آدمی ساز نام تیرا
خدا نے تجھ سا حسیں مقدّر۔ تو ہی بتا دے کسے دیا ہے؟

بجا ہے ہر ناز تیری ہستی کو بزمِ امکاں میں اے معلّم
کہ ہر اشارہ تری چھڑی کا۔ کلیدِ اسرارِ کیمیا ہے

صامت شامی

مری اقبال مندی کو پہنچ سکتا نہیں کوئی
فلک پیما بلندی کو پہنچ سکتا نہیں کوئی

زمیں والوں سے میری آشنائی ہو نہیں سکتی
یہاں پر تو فرشتوں کی رسائی ہو نہیں سکتی

یہ سنتے ہی ہوئی لرزش سی پیدا سب ہواؤں میں
ہزاروں بجلیاں جاگ اٹھیں تر دامن گھٹاؤں میں

کہا چشموں نے "ہم مجبور ہیں کچھ کہہ نہیں سکتے
یہی غم ہے بلندی کی طرف کیوں بہ نہیں سکتے"

اڑا بادل مگر کھویا ہوا نے اعتبار اُس کا
ہُوا تحلیل محنت کے اثر سے جسمِ زار اُس کا

کہ حائل ہو گئی کہسار کی دیوار رستے میں
کھڑے تھے روکنے کو سیکڑوں اشجار رستے میں

اگرچہ ہر پرندہ اپنی جرأت آزماتا تھا
مگر کہسار کی رفعت سے سب کو خوف آتا تھا

زمیں کے پست میدانوں سے اتنے میں ندا آئی
کسی انسان کے پیغام کو لے کر ہوا آئی

"کہ اے مغرور! یہ واہی تباہی گفتگو کیا ہے
ہمارے سامنے تیری بلندی کیا ہے تو کیا ہے

ہمارے حوصلے پائندہ تر ہیں کوہساروں سے
زمیں پر ہیں مگر آنکھیں لڑاتے ہیں ستاروں سے

ہمارے تخت اڑتے ہیں سبک دامن ہواؤں پر
ہمارا حکم چلتا ہے سمندر پر گھٹاؤں پر

چھپی ہے زندگانی کی حرارت خاک زادوں میں
نہاں ہے آہن و فولاد کی سختی ارادوں میں

پہنچ جائیگا تیرے سر پہ اک دن کارواں اپنا
تری رفعت پہ لہرائے گا پاکیزہ نشاں اپنا

کریں گے غسل ہم تیرے سنہری آبشاروں میں
پھریں گے صورتِ ابرِ رواں رنگین غاروں میں

ترے سینے پہ آ کر ایک دن آباد ہم ہونگے
تری سیمیں جبیں ہو گی اور انسانی قدم ہونگے

فاخر ہریانوی

حفظانِ صحت

انسان کیلئے مکمل غذا

امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن کے سرکاری رسالہ ہائیجیا نے اُن غذاؤں کی فہرست شائع کی ہے، جن کے اجزا انسان کی طبعی اور دماغی صحت کے لئے لازمی ہیں۔ اس فہرست پر مغربی علمِ طب کے ماہرینِ خصوصی کی مُہرِ تصدیق ثبت ہے۔ اور ہمیں کامل امید ہے کہ یہ ناظرین کی دلچسپی اور سبق آموزی کا موجب ثابت ہوگی۔

مکمل غذا میں کن اجزا کی ضرورت ہے۔	چند اشیاء جن میں یہ ضروری اجزا موجود ہیں۔	اِن ضروری اجزا کی عدم موجودگی کے بعض اثرات
آکسیجن	ہوا	نظامِ عصبی اپنے وظائف کو پورا نہیں کرسکتا۔
پانی	پانی۔ دودھ۔ شربت۔ تقریباً جملہ اشیائے خوردنی۔	پیاس۔ جسمانی علی الخصوص عصبی آلات اپنا کام نہیں کر سکتے۔
پروٹین۔	دودھ۔ گوشت۔ انڈا۔ اناج۔	نشوونما رک جاتی ہے۔ وزن کم ہوجاتا ہے۔
کاربوہائیڈریٹ۔ (حرارت پہنچانے والی اشیا)	میدہ۔ چینی۔ شربت۔ اناج۔ پھل۔ دودھ۔	کام کرنے کی طاقت اور نشوونما کی قوت کم ہوجاتی ہے۔
چربی	مکھن۔ زردئ بیضہ۔ گوشت۔ نباتاتی روغن۔ مغزیات۔ دودھ	ایضاً
فلزاتی اجزاء (مختلف دھاتیں)	دودھ۔ اناج کا چھلکا۔ سبز ترکاری۔ گوشت۔ دھاتوں کے مرکبات	ہڈیوں کی نشوونما رک جاتی ہے۔ نظامِ عصبی بگڑ جاتا ہے۔ آلاتِ ہضم اپنے وظائف کو پورا نہیں کر سکتے۔
وٹامن (جوہرِ حیات)	وٹامن اے:۔ مکھن۔ زردئ بیضہ۔ تازہ ترکاریاں۔ زرد رنگ کے اناج مثلاً چنا، گیہوں، مکئی۔ پھیپھڑا، پھیپھڑے کا تیل۔	آشوبِ چشم۔ عصبی ضعف۔ زکام نزلہ۔ نمونیا (ذات الریہ) کے مقابلہ کی طاقت کم ہوجاتی ہے۔
	وٹامن بی:۔ اناج کا چھلکا اور مغز۔ خمیری مادہ۔ دودھ۔ انڈا۔ پھل۔ ساگ۔ تازہ گوشت۔	سوئے ہضم۔ بعض عصبی آلات کام نہیں کرسکتے۔
	وٹامن سی:۔ تازہ پھل۔ ساگ۔ تازہ ترکاریاں۔ دودھ۔	ماخورہ۔ دانت اور مسوڑھے خراب ہوجاتے ہیں۔ جسم میں خارش ہوتی ہے۔
	وٹامن ڈی:۔ کاڈ لیور آئل۔ یعنی مچھلی کا تیل۔ تازہ سبز چارہ کھانے والی گائے کا دودھ۔ کھلی ہوا میں رہنے والی مرغیوں کے انڈے۔ اور ایسی چیزیں جو بالائے بنفشی شعاعوں سے متاثر ہوں۔	ام الصبیان جس سے بچے لاغر ہوجاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں مڑنے لگتے ہیں۔ خوراک میں ہڈی بنانے والا مادہ یعنی کیلسیم اور فاسفورس جزوِ بدن نہیں بن سکتا۔ اعصاب، رگ و ریشہ اور پٹھوں میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے۔
	وٹامن ای:۔	خوراک میں لوہا جزوِ بدن نہیں بنتا۔

(ادارہ)

اخبار علمیہ

روشنی کی ماہیت

پنجاب کی سائنس کی اشاعت وترقی کی تاریخ میں ۵ اپریل ۱۹۳۱ء کا دن ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جب کہ سر چندر شکھر وینکٹ رامن جو علم الطبعیات میں اپنی عدیم النظیر اور گراں قدر تحقیقات کی بنا پر گذشتہ سال نوبل پرائز حاصل کر چکے ہیں۔ لاہور تشریف فرما ہوئے۔ صبح کو آپ نے علم الطبعیات کے مدرسین پنجاب کی مجلس کا افتتاح فرمایا۔ اور اپنی تقریر میں اس امر پر زور دیا۔ کہ سائنس کے معلم اپنی سرگرمیوں کو صرف کتابی واقفیت تک محدود نہ رکھیں۔ بلکہ طلبہ میں تحقیق وتفحص کا صحیح ذوق پیدا کریں۔ بعد ازاں بلدیہ شہر کی طرف سے آپ کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا اور آپ کے تبحرِ علمی کی داد دی گئی۔ شام کو فورمن کرسچن کالج کے وسیع ایوان میں آپ نے آنریبل ملک فیروز خاں نون وزیرِ تعلیم پنجاب کے زیرِ صدارت "روشنی کی ماہیت" پر ایک سیر حاصل دلچسپ اور بصیرت افروز لیکچر دیا۔ اور اپنے دعووں کی میجک لینٹرن کی تصاویر اور متعدد عملی تجربات سے تشریح کی۔ دوسرے دن آپ نے "بلور کی ہیئت ترکیبی" کے اہم موضوع پر ڈی۔ اے۔ وی کالج میں ایک عالمانہ تقریر فرمائی۔

"روشنی کی ماہیت" پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔ کہ وہ عالمِ محسوسات کا تجزیہ کریں۔ اور جو اصول اس میں کارفرما ہیں۔ اُن کو بے نقاب کریں۔ انسان میں روشنی کا احساس قدرت کا نہایت گرانقدر عطیہ ہے۔ ہم روشنی کی مدد سے اپنے گردوپیش کے حالات سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ کائنات کے اُن خطوں کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں۔ جو کرۂ ارض سے اتنی دُور واقع ہیں۔ کہ انسانی تخیل فاصلہ کا اندازہ کرتے ہوئے چکرا جاتا ہے۔ دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ کہ ماہرینِ سائنس نے روشنی کی حقیقت پر غور کرنا شروع کیا۔ اور وہ ہنوز قطعیت اور یقین کے قریب نہیں آ سکے۔ قدرت خود ہمارے سامنے نہایت دلفریب انداز سے روشنی کے تجربات دکھاتی ہے۔ انسان قوس قزح، طلوع وغروب، لاجوردی آسمان، اور نیلگوں سمندر پر روشنی کے حیرت افزا مظاہرے دیکھتا ہے۔ اور پھر خود روشنی کی ماہیت دریافت کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک سائنس دان یہ سمجھتے رہے کہ روشنی ایتھر (مادہ) کی فضائے بسیط میں ایک حرکت ارتعاش کا نام ہے۔ وہ ایک غیر مرئی چیز ہے۔ جس سے فضا میں مدور[1] لہریں اُٹھتی ہیں۔ آفتاب کی روشنی سات رنگوں سے مرکب ہے۔ بنفشی، لاجوردی، نیلا، سبز، سُرخ، زرد اور نارنجی۔ اگر آفتاب کی شعاعوں کو منشورِ مثلثی سے دیکھا جائے۔ تو یہ رنگ متذکرہ بالا ترتیب میں نظر آتے ہیں۔ کیا واقعی روشنی فضا میں متموج لہروں کا نام ہے؟ کیا وہ سچ مچ ایک غیر مرئی شے ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے پروفیسر رامن نے اس نکتے کی تشریح ایک ایسے دلچسپ انداز میں کی کہ سامعین بہت محظوظ ہوئے۔

آپ نے انگریز افسانہ نویس مسٹر سیٹونس کی ایک کہانی سنائی۔ جس میں مختلف طبائع کے دو اشخاص ہیرو ہیں۔ اُن میں ڈاکٹر جیکل نیکی کا مجسمہ ہے۔ سوسائٹی کے لئے رحمت ہے۔ ہر دم مصیبت زدہ لوگوں کی اعانت پر کمربستہ رہتا ہے۔ اس کے برعکس مسٹر ہائیڈ ایک شریر النفس انسان ہے۔ جو لوگوں کے درپے آزار رہتا ہے۔ داستان کے خاتمہ پر یہ معمہ کھلتا ہے۔ کہ ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ دراصل واحد شخصیت ہے۔ جس طرح لوگ ایک شخص کو غلطی سے دو جداگانہ ہستیاں سمجھتے تھے۔ اسی طرح روشنی کے متعلق سائنس دانوں کے علیحدہ علیحدہ نظریے تھے۔ نیوٹن کا خیال تھا۔ کہ روشنی ایک مرئی شے ہے۔ جس طرح بندوق کی گولی ہوا میں سے گذرتی ہے۔ اسی طرح سے روشنی کی کرنیں فضا کو چیرتی ہوئی منتشر ہو جاتی ہیں۔ اس کے بالمقابل ماہرینِ سائنس کا دوسرا گروہ تھا۔ جو روشنی کو ایک ایسی غیر مادی قوت سمجھتا تھا جو ایتھر میں حرکت پیدا کر دیتی ہے۔ پروفیسر رامن نے تجربات سے بتایا۔ کہ درحقیقت روشنی میں یہ ہر دو خواص موجود ہیں۔ جرمن سائنس دان آئن سٹین نے یہ ثابت کیا ہے کہ روشنی ایک مادی شے کی طرح چیزوں سے ٹکراتی ہے۔ اور خاص حالات میں خمیدہ بھی ہو جاتی ہے۔

آسمان کے لاجوردی رنگ اور سمندر کی نیلاہٹ کا سبب انتشار روشنی

[1] گول۔

ہے ۔ روشنی صاف ہوا اور پانی میں گذرتی ہوئی ان کے ذرات میں باہمی تصادم برپا کردیتی ہے ۔ لیکچر کے خاتمہ پر سوسائٹی نور پر ڈموٹنگ سائنٹفک نالج (مجلس ترقیٔ سائنس) کے جنرل سیکرٹری پروفیسر مہرچند سوری ایم اے نے سر رامن کا شکریہ ادا کیا ۔ اور یہ علمی اجتماع جس میں پنجاب کی درس گاہوں کے معلمین و متعلمین عدالتِ عالیہ کے جج ڈاکٹر اور سوسائٹی کے دیگر برگزیدہ اصحاب نے شرکت کی نہایت کامیابی سے اختتام پذیر ہوا ۔

سلمان خاں

تڑکا

(از لانگ فیلو ۔ مترجمہ عدمؔ)

ہوا کا ایک جھونکا تڑکے تڑکے نیند سے چونکا ۔۔۔ کنارِ آب سے آنکھوں کو جب ملتے ہوئے گزرا
تو بولا کُہر سے ہٹ جا مرے رستے کو خالی کر ۔۔۔ سِمٹ جا، دُور ہو چھپٹ جا، مرے رستے کو خالی کر
ملا جب راستے میں کشتیوں کے بادبانوں سے ۔۔۔ جو باتیں کر رہے تھے بیخودی میں آسمانوں سے
تو ملاحوں سے بولا، اے جوانمردو! اٹھو، جاگو ۔۔۔ یمِ خاموش کو مَوج آفریں کردو، اٹھو جاگو
مخاطب ہو کے جنگل کے پرندوں سے لگا کہنے ۔۔۔ تمہارے سحر زا نغمے ہیں صحنِ دشت کے گہنے
اُٹھو اے ننھے ننھے مُطربو! اب ہوش میں آؤ ۔۔۔ ترنّم ریز ہو کر سارے بن کو وجد میں لاؤ
جو پہنچا لہلہاتے سبزہ زاروں کی بہاروں میں ۔۔۔ درختوں کے زمرد پوش نازک شاخساروں میں
تو بولا، اے حسینو! اپنے طرّوں کو ذرا خم دو ۔۔۔ پری رُو نازنینو! اپنے طرّوں کو ذرا خم کردو
کہ مشرق سے ابھی جھانکیگی شہزادی سویرے کی ۔۔۔ نویدِ صبح دیتی ہے پریشانی اندھیرے کی
وہی جھونکا مگر جب شہرِ خاموشاں میں جا پہنچا ۔۔۔ تو ٹھنڈی سانس لیکر اور جگر کو تھام کر بولا

نہیں تم سو رہو، تم کو ابھی آرام کرنا ہے
تمہیں محوِ سکوں رہ کر سحر کو شام کرنا ہے

عدمؔ

تعلیمات

(۳)

تعلیم جدید کے بنیادی اصول

مشاہدہ گواہ ہے کہ ایسی تحریکیں جن کا دائرہ عمل بہت وسیع ہوتا ہے اور جن کا سوسائٹی کی ترقی پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ پہلے سوچ سمجھ کر یا کامل غور و خوض کے بعد شروع نہیں کی جاتیں بلکہ علی العموم ان کی ابتدا و فورِ شوق یا کسی فوری جوش کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ بعد میں رفتہ رفتہ انہیں خاص اصولوں اور نظریوں کے تحت میں لایا جاتا ہے یہی حالت تعلیمِ جدید کی تحریک کی ہے۔ شروع شروع میں مروجہ نظامِ تعلیم کی مخالفت کے جذبے اور اصلاح کے شوق نے اس کی بنیاد رکھی۔ اس کے بانیوں کا مقصد یہ تھا کہ نظامِ تعلیم کو حیاتِ ملی کی تبدیل شدہ حالت کے موافق بنائیں ان کے خیال میں حالاتِ زمانہ کا تقاضا یہ تھا کہ اسکولوں کی فضا ایسی نہ رہے جس میں بچے بادلِ ناخواستہ پہلے وقتوں کے مسائلِ حیات کے وہ طریقے سن کر یا پڑھ کر یاد کرلیں جو ان کے بزرگوں نے اپنے عہد کے حالات کو مدنظر رکھ کر قلم بند کئے تھے۔ بلکہ اسکول ایسے مرکز بنیں جہاں صحیح معنوں میں بچوں کو درسِ حیات مل سکے۔ جہاں اطفال تجربہ حاصل کریں۔ خود شوق سے مشغولِ کار ہوں۔ خود تجویزیں کریں تدبیریں سوچیں اور پھر خود ہی ان پر عمل پیرا ہوں اور جہاں ایسے مشاغل ہی ان کی تعلیم و تعلم اور تربیت و تہذیب کا ذریعہ بنیں۔ ہر ملک ہر مقام ہر عصر و زمان میں کارآمد زندگی ایسے ہی افعال ارادی سے بنتی رہی ہر اور اس لیئے زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ اخذ کرنے کا طریق بھی عملی زندگی میں قدم رکھنا ہی ہو سکتا ہے۔

بیسویں صدی کے شروع میں اخبارات اور علمی مجالس میں اس قسم کے مکاتب کی ضرورت کا ذکر تو ہوتا تھا۔ لیکن نئے اسکول بہت شاذ تھے۔ جنگ عالمگیر کے بعد اکثر مہذب و تعلیم یافتہ لوگوں کے دلوں میں مروج طریق زندگی کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہو گئے اور آخر کار ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہو گئی جنھوں نے روایتی قواعد و نظام کی بندشوں کو توڑ کر قدیم طریقوں اور پرانی روش کو خیر باد کہدیا۔ اس کا اثر اسکولوں پر بھی پڑا اور تعلیم جدید کی ترویج کا موجب بنا۔ جب نئی قسم کے اسکول کافی تعداد میں قایم ہو گئے تو تعلیم جدید کے اصول معین و منضبط کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ گذشتہ پانچ چھ سالوں سے اس امر کی طرف توجہ منعطف کی جانے لگی ہے۔ یوں تو کسی نہ کسی لحاظ سے ہر نئے اسکول کا رنگ نرالا ہوتا ہے لیکن مندرجہ ذیل اصول پر سبھی کاربند نظر آتے ہیں۔

زندگی کی ہیئت اجتماعی

پہلا اصول جس سے قدیم اور جدید تعلیم کا فرق ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ تعلیم مروجہ کے دلدادہ شاگرد کی عقلی اور ذہنی تربیت پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اسی کو تعلیم کا حقیقی مقصد قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ جسم اور دماغ کے باہمی تعلق کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اس خلافِ فطرت اصول کا لابدی نتیجہ اس تعلیم کی تشنگی کی صورت میں رونما ہے۔ تعلیم جدید کا فلسفہ ہر متعلم کو فرد واحد مانتا تھا۔ اور اسے جسم اور عقل کا ایسا مرکب تصور کرتا تھا جو بحیثیتِ مجموعی عمل کرتا اور نشو و نما پاتا ہے۔ اور جس کی تربیت جزءً نہیں ہو سکتی بلکہ سالماً اور مجموعی طور پر سر انجام پاتی ہے۔ اس فلسفہ کی رو سے یہ قطعاً ناممکن ہے کہ جسمانی نشو و نما یا ذہنی ارتقاء یا اخلاقی تربیت کو علیحدہ علیحدہ کیا جا سکے۔ کیونکہ بچے کی زندگی کے تمام شعبے دراصل ایک ہی شے کی مختلف حیثیتیں ہیں۔ اگر اس کی تعلیم و تربیت مطلوب ہے تو صرف بہیئت مجموعی ہی انجام پذیر ہو سکتی ہے۔ یہ فلسفی عقیدہ تعلیم جدید کی روح رواں ہے۔ یا یوں کہیئے کہ تعلیم جدید ایسی تعلیم کا نام ہے اور نئے اسکول ایسی درسگاہوں سے مراد ہے جن میں بچوں کے بدنی۔ ذہنی۔ اخلاقی اور روحانی افعال کو باہم وابستہ اور ایک دوسرے پر منحصر مانا جاتا ہے

اس فلسفۂ تعلیم کے رو سے یہ ضروری ہے کہ متعلم کا بطور مجموعی مطالعہ کیا جائے بیشک سمجھنے کی خاطر اس کے افعال اور احساسات اور خیالات اور قویٰ وغیرہ پر علیحدہ علیحدہ غور کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ بات کبھی بھولنی نہ چاہیئے کہ طفل مکتب کی زندگی غیر قابلِ تجزیہ ....

اعمال اور واقعات سے ترتیب پائے ہوئے ہے۔ اور اس کی زندگی کا سیر حاصل ہونا انہی سالم اور غیر منقسم اعمالِ حیات کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے پر منحصر ہے۔ ظاہر ہے کہ متعلم کو خود دیکھنے اور سوچنے کے لیئے اپنے دل میں

بچوں کے اعمال و افعال کا تجزیہ .... کرنا پڑے گا لیکن بوقت تعلیم شاگرد کی زندگی کے ہر عمل کو سالم تصور کرنا چاہیئے۔

اس کا ایک اور نتیجہ یہ ہے کہ معلم منطقی طریقہ تعلیم اور طرز خیال اور مقررہ نصاب تعلیم کو ترک کرکے اطفال کی زندگی اور ان کے ذاتی تجربے کو توسیع دینے اور مالامال کرنے کی طرف توجہ کرنے لگے ہیں متعلم کو نہ تو موم کی ناک سمجھتے ہیں کہ استاد نے جدھر چاہا موڑ لیا اور نہ ایسی لوح سادہ تصور کرتے ہیں جس پر استاد نے جو چاہا نقش ہوگیا بلکہ اسے ایسی ہستی تسلیم کرتے ہیں جو اس عالم اسباب میں نہ صرف خود متاثر ہوتی ہے بلکہ ہر آن کوشاں ہے کہ اس پر اپنا اثر ڈالے اور اس کو اپنے حسب حال ڈھال لے۔ وہ اس دنیا میں کوئی مجبور ہستی نہیں بلکہ ایسی فاعل مختار ہے۔ ع

آشکارا ہے جو اپنی قوت تسخیر سے

سابقاً علم نفسیات کے ماہر بچوں کی فطرت کے مختلف پہلوؤں کا جزواً اور فرداً فرداً مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اور ہر شعبے کی جداگانہ تحقیقات کرکے اس کے قانون دریافت کرتے تھے لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی فعل بھی اپنے اجزا کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ ایک ایسا پیچیدہ مرکب ہے کہ اس جداگانہ تحقیقات سے اس کی نوعیت و ماہیت کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے معلم کے لئے بھی یہ امر ضروری ہے۔ کہ اسے یاد رہے کہ تعلیم کا زمانہ بچے کی حیات مسلسل کا ایک حصہ اور اس کی زندگی کی رو ایک لہر ہے اور شاگرد کا کوئی فعل اس کی طبیعت کے کسی خاص پہلو کا کام نہیں بلکہ اس بچے کے جسم دل دماغ اور روح کے تمام قوٰی ظاہری و باطنی کا مشترکہ فعل ہے۔ یعنی اسے کرنے والا سالم بچہ ہے

دوسرا اصول جو تعلیم جدید کو ایک امتیازی شان بخشتا ہے یہ ہے کہ نئے اسکولوں میں زندگی کے تخلیقی پہلو پر زور دیا جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت عملی طور پر بچوں کو ذہن نشین کرا دی جاتی ہے کہ

ع ستر آدم ہے ضمیر کن فکان زندگی

جس طرح مشینوں نے مصنوعات کی دنیا میں اُستادی اور کاریگری کو قریباً معدوم کر دیا ہے اسی طرح مکاتب مروجہ کی تعلیم کی یکسانی نے زندگی میں جدت پیدا کرنے کے خیال کو موہوم بنا دیا ہے۔ تعلیم جدید کے مقاصد میں ایک یہ بھی داخل ہے کہ ہر طفل کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ جس طرح اپنے افعال میں اپنی ذات سے بے ساختہ ایسی ایزاد اور ترمیم کرے جو اسی کی شخصیت کا مظہر ہوں اور اس طرح اس میں ایجاد و اختراع کا ذوق پیدا ہو۔

قدرت نے ہر شخص کو کوئی نہ کوئی ایسا خاص رنگ عطا کیا ہے جو اسی کا حصہ ہے اور اسے کسی نہ کسی قسم کی ایسی فطری قابلیت بخشی ہے جو اسی کے لئے مخصوص ہے۔ لیکن آج کل مکاتب اور زندگی کے حالات افراد کے ان پہلوؤں کی ترقی کے مخالف رہے ہیں نئے اسکولوں میں اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہر بچے کو اپنی خصوصیت کے اظہار کا موقع دیا جائے۔ بعض اپنے صفات خصوصی کا اظہار شعر و سخن کے ذریعے سے کرتے ہیں۔ بعض انشا و تقریر کی شکل میں بعض کو صنعت و دستکاری۔ ورزش۔ نقش و نگار۔ طباخی۔ خیاطی۔ موسیقی۔ مصوری۔ مجسمہ سازی۔ نقالی۔ تمثیل سازی۔ انجنیئری۔ کیمیاگری۔ انتظام و اہتمام وغیرہ میں ایجاد و اختراع کا موقع ملتا ہے۔ غرض ہر بچے کی فطرت میں کوئی نہ کوئی تخلیقی پہلو پایا جاتا ہے۔ جس میں اس کی طبیعت اپنی جولانی دکھا سکتی ہے۔ اور ہر ایک میں کچھ نہ کچھ طبعی صلاحیت و دیعت ہوتی ہے۔ جو اسے اپنے ہم چشموں میں ممتاز کر سکتی ہے۔ نئے اسکولوں میں خاص کوشش کی جاتی ہے۔ کہ ایسے حالات مہیا کئے جائیں جن کی بدولت ہر بچے کو اپنی فطری لیاقت کو کام میں لانے اور اسے درجۂ کمال تک پہنچانے کا موقع میسر آئے۔

تیسرا اصول بچے کے مستقبل کی نسبت اسے حال پر زیادہ توجہ دینا ہے۔ مروجہ تعلیم کا اولیں مقصد اسے سن بلوغ کے لئے تیار کرنا ہے اور اس مقصد کے پیش نظر مروجہ اسکولوں میں شاگردوں کی موجودہ زندگی کو عہد طفولیت کی دلچسپیوں سے مالامال کرنے کی ضرورت نظرانداز کر دی گئی ہے۔ چونکہ ایام طفلی میں بچے کی زندگی نامکمل اور ادھوری ہوتی ہے۔ اس لئے بڑے ہو کر بھی اس کی تشنگی اور خامی دور نہیں ہوتی کیونکہ یہ امر بدیہی ہے کہ کسی شخص کی جوانی اور پختہ سالی اسی صورت میں بہتر حاصل ہوگی۔ جب کہ شروع سے اس کی زندگی گوناگوں مشاغل سے لبریز رہی ہو یعنی اس کا عہد طفلی بچپن کی قدرتی دلچسپیوں سے معمور رہا ہو

چوتھا اصول یہ ہے کہ زندگی عمل پیہم کا نام ہے۔ حرکت۔ تحریک در عمل۔ زیست کی امتیازی خصوصیتیں ہیں۔ اس لئے نئے اسکولوں نے عمل ہی کو تعلیم کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ مروجہ مکاتب میں بچوں کے عمل و حرکت پر طرح طرح کی بندشیں عائد کی جاتی ہیں۔ ان میں خاموشی۔ باقاعدگی سکون اور ظاہری توجہ پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ سب علامات سطحی اور بیرونی ہوتے ہیں۔ دراصل بچوں کے دل سکول کے مقاصد کی مخالفت کرتے ہیں

بے چین ہوتے ہیں۔ خارجی ضبط اور سزا کے خوف کی وجہ سے اس بے چینی کے ظاہری نشان تو نظر نہیں آتے لیکن بچوں کی توجہ منتشر رہتی ہے۔ اور وہ دل لگا کر کوئی کام نہیں کرتے اور جونہی استاد کا دباؤ کم ہوتا ہے ان کے دلوں کی اصلی حقیقت نمایاں ہوجاتی ہے۔ اس کے برخلاف نئے اسکولوں میں آزادئ عمل کا دور دورہ ہے۔ بظاہر تو عدم توجہ ہے لیکن درحقیقت طلبہ جو کچھ کرتے ہیں شوق سے کرتے ہیں تعلیم جدید کے مکاتب میں ہر ایسا عمل یا شغل جس میں لگاتار کوشش کی کی جائے اور جو کسی خاص مقصد کو مدنظر رکھ کر کیا جائے۔ از سرتا پا تعلیم و تربیت کا سرچشمہ ہے۔ وہی زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سکھانے اور وہی تہذیب اخلاق کا ذریعہ ہے۔ اس لحاظ سے وہ علامہ اقبال کے ہمخیال ہیں۔

ع عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

تعلیم جدید کا پانچواں اصول آزادی ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ "بچے کے دست و پا اور حلق و حنجرہ کو قیود سے آزاد کرو کیونکہ یہ اس کے دل و دماغ عقل و روح کو آزاد کرنے کا پہلا مرحلہ ہے۔" اس لئے نئے اسکولوں کے سازوسامان۔ اور نظم و نسق میں ایک عظیم تبدیلی پاتے ہیں۔ ڈسکوں کی یکسانی نشست و برخاست۔ آمد و رفت اور گفتگو پر پابندیاں۔ ڈسپلن کی شدت اور تعلیم کی بیگانگت جو مروجہ مکاتب کے خصوصی نشان ہیں ان میں نہیں پائے جاتے۔ اس کی بجائے نئے اسکولوں میں گھر کی سی بے تکلفانہ فضا پیدا کی جا رہی ہے۔ بھاری بھرکم ڈسکوں کی جگہ ہلکی ہلکی کرسیاں اور چھوٹی چھوٹی میزیں ہیں جو کھیلنے کے وقت ایک طرف کی جاسکتی ہیں اور جنہیں جس طرح چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ بچے آزادی سے چلتے پھرتے۔ بولتے چالتے کھیلتے کودتے۔ ناچتے گاتے نظر آتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب اپنی مرضی کے مالک ہیں جبر و تقید کا نام نہیں۔ چالیس چالیس اور پچاس پچاس بچوں کی جماعتوں کے بجائے بچے اکیلے اکیلے یا پانچ پانچ۔ دس دس۔ بیس بیس کی ٹولیاں بنا کر خوش و خرم کام کرتے نظر آتے ہیں۔ پہلے سی جماعت بندی نہیں۔ خاموشی نہیں۔ جماعتوں میں صرف استاد کی طرف سے سوال نہیں۔ شاگردوں کو کسی مجبوری کا احساس نہیں خارجی دباؤ کا خوف نہیں بلکہ طلبہ خود بخود اکیلے اکیلے اپنے اپنے کام میں منہمک نظر آتے ہیں یا آپس میں مشورے کرتے اور پھر مل کر کام کرتے ہیں انہیں فطرت کے مطابق نشو و نما پانے اور بے تکلف ترقی کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ان کی زندگی کارآمد اور دلچسپ مشاغل سے لبریز اور بچپن کی مسرتوں سے مالا مال ہوتی ہے۔

پروفیسر جمال الدین احمد
(ملتان کالج)

ہندوستان

نحوست ہند پر منڈلا رہی ہے
وطن کہتے اسے شرم آ رہی ہے

مخالف آسماں دشمن زمیں ہے
ہماری کوئی قیمت ہی نہیں ہے

ہمیں اولاد کا غم کھو رہا ہے
غلاموں میں اضافہ ہو رہا ہے

کہیں کیا داستانِ ناتمامی
غلامی اور ہمیشہ کی غلامی

ہم آزادی کی تدبیروں میں خوش ہیں
ہمارے ہاتھ زنجیروں میں خوش ہیں

کریگا کیا ہمیں آزاد کوئی
نہیں اس قید کی میعاد کوئی

فاخر ہریانوی

تنقید و تبصرہ

اتالیق نسواں:- یہ کتاب جس میں عورتوں کی تعلیم و تربیت اور انتظام خانہ داری کو نہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ دس جلدوں میں منقسم ہے۔ پہلی جلد میں حساب، دوسری میں کھانا پکانا۔ تیسری میں سینا پرونا۔ چوتھی میں انشاء مضمون نگاری، پانچویں میں خاکہ کشی۔ چھٹی میں کپڑے رنگنا اور چھاپنا۔ ساتویں میں گوٹہ کناری ٹانکنا۔ آٹھویں میں کڑھت اور چکن دوزی۔ نویں میں اعضائے جسمانی کی تشریح اور دوسری مفید باتیں۔ اور دسویں میں انتظام خانہ داری سکھایا گیا ہے۔ یہ بڑی ضخیم کتاب ہے۔ چنانچہ دس حصوں کی کل ضخامت ۱۱۵۶ صفحہ ہوتی ہے۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ ہے، لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجہ کا ہے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:- منشی احمد علیخان صاحب نمبر ۲۲۹ کوچہ تاراچند دہلی۔

گڑیا کا گھر:- یہ ہنرک البسن کے معرکتہ الآرا ڈرامہ ڈالس ہاؤس کا اردو ترجمہ ہے جو مسٹر عبدالشکور صاحب ایم۔ اے بی ٹی لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی محنت کا رہین منت ہے۔ شروع میں پروفیسر بشیر احمد صاحب ہاشمی ایم۔ اے نے ۲۶ صفحوں پر ایک قابل قدر مقدمہ لکھا ہے۔ کتاب ۲۲×۱۸/۸ کے ۱۸۴ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ یہ تالیف مجالس ادبیہ انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے سلسلۂ مطبوعات میں داخل ہے۔ قیمت معلوم نہیں۔

سیرۃ نبوی اور مستشرقین:- ابنائے تعلیم جدید مستشرقین کے خیالات کو عموماً وحی الٰہی سے بڑھ کر قابل استناد سمجھتے ہیں۔ اسی لئے مغربی خیالات ان کی رگ و پے میں سرایت کر جاتے ہیں۔ اس زہر کا تریاق بجز اس کے کچھ نہیں کہ ان لوگوں کے اعتراضات کی حقیقت بے نقاب کی جائے مستشرقین اسلام، داعئ اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے متعلق وقتاً فوقتاً جن خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں ان سے اردو دان طبقہ کو واقف کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ اسی خیال کو مدنظر رکھ کر جناب مولوی عبدالعلیم صاحب احرار بی۔ اے نے اس کتاب میں مشہور مستشرق ولہا دزن کے اس مضمون کا ترجمہ شائع کیا ہے جو "انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا" میں جناب رسول اکرم علیہ السلام کے متعلق درج ہے۔ اس کتاب میں اختصار کے ساتھ ان تمام اعتراضات کو جمع کر دیا ہے جو مستشرقین عام طور پر سیرت نبوی پر وارد کرتے ہیں۔ یہ کتاب مطبع معارف اعظم گڑھ میں چھپی ہے۔ اور اس میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ صرف اعتراضات کی اشاعت پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ حاشی میں ان کے جوابات درج کر کے متردد لوگوں کے لئے اطمینان قلب کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ صفحات ۱۱۱ قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

بجلی کے کرشمے:- یہ عام فہم مفید رسالہ جناب محمد معشوق خانصاحب بی۔ اے علیگ کی تالیف ہے اور اس کو انجمن ترقی اردو کے سلسلۂ تالیفات میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس رسالہ کی اشاعت سے یہ غرض ہے کہ اہل ہند میں بجلی کا استعمال یورپ میں اسقدر عام ہو گیا ہے کہ کھانا تک اسی سے پکایا جاتا ہے انگلستان میں بجلی کے موضوع پر بہت سے مصنفوں نے عام فہم زبان میں کتابیں لکھی ہیں جن میں مسٹر گیسن کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس رسالہ کا بیشتر حصہ مسٹر گیسن ہی کے رسالوں سے ماخوذ ہے۔ یہ رسالہ اس مضمون کی پہلی کتاب ہے۔ اگر ناظرین نے دلچسپی ظاہر فرمائی تو مؤلف کا ارادہ ہے کہ اس کا دوسرا حصہ بھی شائع کریں گے۔ صفحات ۱۴۳ قیمت ۱۲؍ گو قیمت کے مقابلہ میں اس رسالہ کا حجم بظاہر چھوٹا ہے لیکن مفید ہونے کے لحاظ سے نہایت ارزاں اور گراں قدر ہے۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن یا مؤلف سے جالنہ ضلع اورنگ آباد کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

نیرنگ زمانہ:- یہ اُسی نواب مہابت خاں صوبہ دار کابل کے سوانح حیات ہیں جس نے ایک بغاوت کے دوران میں جو بادشاہ کے خلاف ہوئی جہانگیر بادشاہ کو قید کر لیا تھا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک معمولی سپاہی اور ادنیٰ سوار نے منازل ترقی طے کرتے کرتے ہفت ہزاری منصب کیونکر پایا اور سپہ سالار اعظم کے درجہ تک کس طرح ترقی کی۔ چونکہ مہابت خاں نے سارے دورِ جہانگیری میں اور عہدِ شاہجہانی کے ابتدائی دس سال تک امارت اور فوجی قیادت کی، اس لئے اس کتاب میں ضمناً ان دونوں بادشاہوں کے

*۔ [illegible]

حالات بھی بہت کچھ آ گئے ہیں۔ یہ تالیف دلچسپ اور بیش بہا تاریخی واقعات سے لبریز ہے۔ ۱۸×۲۲/۸ کے ۲۱۹ صفحوں پر ختم ہوئی ہے اور اس کے مؤلف شیخ علی حسن صاحب منصرم ریاست محمود آباد سے مل سکتی ہے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔

تاریخ مغربی یورپ:- تہذیب و تمدن کے موجودہ دور میں ہمارے اہل ملک کو یورپ کی مہذب و متمدن اقوام کی ابتدائی تاریخ اور ان کے عروج و ارتقاء کے واقعات کا علم رکھنا نہایت ضروری ہے۔ "تاریخ مغربی یورپ" ایک بہترین تاریخی مواد ہے جو آج تک اس موضوع پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مشہور امریکن مصنف ڈاکٹر رابنسن کی معرکۃ الآرا تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ جو جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی وکیل کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ اس بیش بہا تصنیف کے بعض موضوعات بحث یہ ہیں:- سلطنت روما کی عظمت و وسعت، رومیوں میں غلامی کا رواج۔ یورپ کا قبول مسیحیت، روما کا زوال۔ یورپ کی مذہبی حیثیت، جرمنی اور برطانیہ مسیحیت کے آغوش میں۔ کلیسا کی تاریخ ارتقاء جناب محمد رسول اللہ کی بعثت، قرآن شریف اور اسلام۔ اسلامی فتوحات، عربوں کا اسپین پر عمل دخل۔ شارلمین کی وسیع سلطنت۔ فرانس اور انگلستان کا عروج۔ جرمنی اور فرانس کی ترقیاں، ہنگری اور آسٹریا کا آغاز، یورپ میں بے دینی کے خلاف معرکہ آرائیاں، صلیبی جنگیں۔ قرون وسطی کی شائستگی جرمن، رومن اور لاطینی زبانیں۔ مطبوعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی صفحات ۴۸۲۔ قیمت عہ/ سائز ۲۰×۲۶/۸۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

میر عالم:- یہ کتاب سلطنت آصفیہ حیدر آباد دکن کے مشہور وزیر اعظم میر عالم کے سوانح حیات میں لکھی گئی ہے۔ جن ایام میں سلطنت آصفیہ میر عالم کی وزارت کے زیر اہتمام تھی ان دنوں لارڈ کارنوالس بنگال کا گورنر جنرل تھا۔ اور دہلی میں شاہ عالم ثانی کی عملداری تھی۔ اس کتاب میں میر عالم کی کامیاب سفارتوں اور اس کے دوسرے کارناموں کے علاوہ نظام علیخاں کے آخری دور اور سکندر جاہ کے اوائل عہد کے تاریخی حالات پر بھی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ریاست حیدر آباد دکن کا ایک نقشہ اور ان عمارتوں کے فوٹو بھی دئے گئے ہیں جو میر عالم نے تیار کرائیں۔ کتاب کے اخیر میں "اشارب" کے زیر عنوان نہایت مبسوط فہرست مضامین بھی درج کی گئی ہے۔ جو حضرات ریاست حیدر آباد کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیں وہ اس بیش بہا تصنیف سے فائدہ اٹھائیں۔ صفحات ۲۳۰۔ لکھائی۔ چھپائی کاغذ عمدہ۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ قیمت درج نہیں۔ کتاب مولف سے اس پتہ پر مل سکتی ہے:-

محمد سراج الدین صاحب طالب، قریب پرانی حویلی حیدر آباد دکن۔

رہنمائے مرغی خانہ:- یہ کتاب مرغیوں کی پرورش اور تجارت کے لئے بہت مفید ہے۔ اس کو پڑھ کر اور اس کی ہدایات پر کاربند ہو کر ملک کے بہت سے نوجوان جن کی زندگی بیکاری نے تلخ بنا رکھی ہے، مرغیوں کی پرورش اور تجارت سے ایک آسان اور مفید روزگار تلاش کر سکتے ہیں۔ بہت مفید کتاب ہے۔ پچاس تصویریں دی گئی ہیں۔ ۲۱۰ صفحے ہیں۔ ایک روپیہ چار آنہ کتاب کی قیمت ہے۔ پتہ:-

پنجاب پولٹری فارم سرگودھا۔

الیوان:- اس نام کا ایک ماہوار رسالہ جناب مجنوں گورکھپوری کے زیر ادارت گورکھپور سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس وقت الیوان کا دوسرا نمبر ہمارے سامنے ہے۔ جہاں تک اس نمبر کا تعلق ہے یہ رسالہ قابلیت سے ایڈٹ ہوا ہے۔ زبان شستہ اور اسلوب انشاپردازی کا اچھا نمونہ ہے۔ ایک علمی و ادبی رسالہ کو جس قسم کے مضامین کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس میں موجود ہیں۔ اس نمبر کے افسانے، سبق آموز ہیں۔ دوسرے مضامین بھی قابل قدر ہیں۔ ہم اپنے معاصر کا دلی خیر مقدم کرتے ہوئے آرزومند ہیں۔ کہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو۔ حجم ۲۰×۳۰/۸ کے ۴۶ صفحات۔ کاغذ لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ چندہ سالانہ چار روپے۔ الیوان اشاعت گھورکھپور کے پتہ سے طلب کیجئے۔

دراکشاسوا:- انگریزی منقیٰ سے تیار کیا ہوا ایک شربت ہے۔ معدہ، جگر اور تپ دق کے لئے مفید ہے۔ ہم نے اسے استعمال کیا ہے، سوء ہضم کی شکایت کو دور کر دیتا ہے۔ قیمت فی بوتل دو روپے اور ایک آنہ۔ سکھ سنچارک کمپنی متھرا سے طلب کیا جائے

ڈینٹلین کریم:- یہ ایک قسم کی کریم ہے۔ دانتوں کے لئے مفید ہے۔ اور گندہ دہنی کو دور کرتی ہے۔ مسوڑوں کی تکلیفیں اس کے روزمرہ استعمال سے دور ہو جاتی ہیں۔ فی ٹیوب ۸/۔ پتہ:-

میسرز بیلی رام اینڈ برادرس انارکلی لاہور۔

ادارہ

دُنیائے ادب

عربی

شخصی استبداد اور جمہوری حکومت

شخصی حکومت کی استبداد پسندی تو اُسے سلطنت کو کمزور کردیتی ہے، کیونکہ جب تک شرف و تحکّم ساری قوم میں مشترک رہتا ہے ملک کی سود و بہبود کے لئے قوم کی متحدہ جد و جہد ترقی و عروج کی کفیل بنی رہتی ہے، تمام افرادِ ملک عضوِ واحد کی حیثیت سے اغیار پر غلبہ حاصل کرنے اور رفاہِ ملکی میں کوشاں رہتے ہیں، ایسی حالت میں قوم کا ہر ہر فرد قومی ترقی کو اپنی قوت، دولت اور عزت کا سرچشمہ یقین کرتا ہے، اس کی نظر میں عزت کی موت ذلت کی ہزار زندگی سے بہتر ہوتی ہے اگر کبھی قومی عظمت خطرہ میں مبتلا ہوتی ہے تو قوم کی قوم ناموسِ ملت کے تحفظ کے لئے پروانہ وار فدا ہونے کو تیار نظر آتی ہے، لیکن اگر اس کے برعکس کوئی فرد واحد جاہ و عروج کا اجارہ دار بنکر اور ملکی معاملات پر حاوی ہوکر قومی عصبیت کو توڑنا چاہتا ہے، تو افرادِ قوم بھی ملکی معاملات میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں، اُن کی ہمت و جرأت جواب دے بیٹھتی ہے ان کا جذبۂ جاں سپاری فنا ہو جاتا ہے، اور قوم چند ہی روز میں ذلت و غلامی کے درجے پر پہنچ جاتی ہے، پھر دوسری نسل میں تو قوم کی سیاسی حالت اور بھی زیادہ مخدوش ہو جاتی ہے، کیونکہ آئندہ نسل کے لوگ اپنے حقوق کے دعویدار نہیں ہوتے بلکہ ان کے دل و دماغ میں یہ خیال راسخ ہو جاتا ہے کہ حکومت کی طرف سے انہیں جو کچھ انعام و اکرام ملا ہے وہ محض اُن کی وفاداری اور سرکار پرستی کا صلہ ہے، اس دور کے آدمی اپنی جان کو بہت کم خطرے میں ڈالنا پسند کرتے ہیں آخر یہی منقلب ذہنیت زوالِ حکومت اور اضمحلالِ شوکت کا باعث بن جاتی ہے،

علامہ ابن خلدون

فارسی

انسان کی حقیقی سعادت

انسان کو چاہیئے کہ طبیعت کے ظلمت کدہ سے نکل کر عقل کی فضائے بسیط میں پرواز کرے اور حیات عقلی کو حیات جسمانی پر ترجیح دے، ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ کمال انسانی کیا ہے؟ جب یہ بات ذہن نشین ہوجائے تو اجنحۂ ہمت سے پرواز کر کے ذروۂ ملکوت کو اپنا ملجا و ماویٰ بنائیں حیات دائمی کی تمنا اور موت سے نفرت احمقانہ باتیں ہیں امتدادِ عمر کی خواہش کا مبنیٰ ہونیادی کامرانی ہے، اور ظاہر ہے کہ ایام پیری میں انسان کے تمام قویٰ رو بانحطاط ہوجاتے ہیں ظاہری و باطنی حواس میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے، اور صحت جو تمام مسرتوں اور کامرانیوں کا سرچشمہ ہے مفقود ہو جاتی ہے عزت ذلت سے بدل جاتی ہے، یہاں تک کہ پیری میں اپنے اہل و عیال بھی اس کی طرف سے متنفر و ملول ہو جاتے ہیں، اس لئے حد اعتدال سے زیادہ عرصہ تک زندگی کی خواہش کرنا عبث ہے، موت کی حقیقت یہ ہے کہ نفس لطیف، خاکی و کثیف بدن کے بوجھ سے مخلصی پاتا ہے، طائر ملکوتی کو قلب کے تنگ قفس سے نجات ملتی ہے اور جس صورت میں کہ نفس انسانی کا مستقر ایک دوسری دنیا ہے عاقبت اندیشی کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان سعادت سرمدی کے حصول میں کوشاں رہے اور چارپایوں کی طرح پانی اور گھاس دانے کا غلام نہ بنا رہے غرض انسان کی حقیقی سعادت یہ ہے کہ وہ اپنے قوائے جسمانی کو لذات عقلی و روحانی کے اسباب مہیا کرنے میں مصروف رکھے

جلال الدین دوانی

انسان کا وہ جذبہ جو اس کو مضحکہ و ظرافت کی طرف رہنمائی کرے اور اپنے جلیس کی تحقیر کا سبق دے، دون ہمتی اور پست حوصلگی سے پیدا ہوتا ہے۔ مضحکہ پسند نوجوان اپنے اوپر ہر قسم کی ترقی کے دروازے بند کر لیتے ہیں، کوئی متنفس فطری کمزوریوں سے خالی نہیں ہے جن مشاہیر کے اعلیٰ اخلاق کی چمک دمک ہماری آنکھوں کو خیرہ کئے دیتی ہے اگر تجسس کرو گے تو ان کے دامن اعمال پر بھی صدہا قسم کے داغ پاؤ گے اسی طرح کوئی بشر سراپا عیب نہیں ہو سکتا کمزوریوں کے ساتھ محاسن بھی ضرور ہوتے ہیں، پس یہ انتہا درجے کی بیہودگی ہے کہ کسی کی خوبیوں کو نظر انداز کر کے عیب جوئی کا شیوہ اختیار کیا جائے بمقتضائے انصاف یہ ہے کہ مذاق اُڑانے والا دوسروں پر نکتہ چینی سے پہلے ذرا اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھ لیا کرے،

(جوسف ایڈیسن)

فرانسیسی

اثر آفریں شخصیت

کرسٹوفر (ایک تمثیلی کردار) کی ذات بھی کس قدر اثر آفریں ہے اس کی شخصیت کا اثر اس کے گردوپیش کے افراد اور ماحول پر پڑتا ہے اور وہ انہیں بالکل تبدیل کر دیتا ہے، یہ شخص کرسٹوفر ایک نئے شہر میں آ کر آباد ہوا جہاں لوگوں میں نہ آثار حیات پائے جاتے تھے نہ جوش تھا نہ ہمدردی لیکن اس کے شخصی اثرات بہت حیرت انگیز ثابت ہوئے، سچ ہے کہ آدمی آدمیوں پر الفاظ کے ذریعہ حکومت نہیں کر سکتا، بلکہ اپنے طرز زندگی سے دوسروں کو متاثر کرتا ہے بعض لوگ اپنی آنکھوں اور اپنے اشاروں سے دنیا کے حالات میں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں کرسٹوفر بھی زندگی بخشتا تھا آہستہ آہستہ موسم بہار کی مرطوب ہوا کی طرح یہ روح اُن پرانے اور دقیانوسی مکانوں کی دیواروں اور بند کھڑکیوں میں سرایت کر گئی اس نے ایسے مردوں اور عورتوں کے دلوں کو نئی زندگی بخشی جنہیں پیہم صدموں نے بالکل گھلا دیا تھا یہاں تک کہ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے، ایک روح دوسری روح پر اسی طرح مسلط ہوتی ہے،

(رومان رولان)

اطالوی

زندگی اور موت

(۱) سونے والو جانتے ہو نیند کیا ہے؟ نیند موت کی تصویر ہے، کاش تم زندگی میں ایسے کام کرو کہ موت کے بعد تم بقا و دوام کی تصویر بن جاؤ ٹھیک اسی طرح جس طرح تم زندگی میں سوتے وقت دوام و بقا کی تصویر بنے ہوتے ہو۔

(۲) ہر برائی کوئی نہ کوئی غم پیچھے چھوڑ جاتی ہے بجز موت کے جو زندگی کے ساتھ خود حافظہ اور یادداشت کو بھی ملیامیٹ کر جاتی ہے،

(۳) اگر دن کے وقت اچھی مصروفیت رہی تو رات کو اچھی نیند آتی ہے اسی طرح اگر زندگی اچھے کاموں میں گزری ہو تو اس سے بہت اچھی موت نصیب ہوتی ہے،

(۴) جب میں اس بات کو بخوبی سمجھ چکا کہ مجھے کس طرح زندگی بسر کرنی چاہئے، تو اسی کے ساتھ یہ بات بھی میری سمجھ میں آ گئی کہ مجھے کس طرح مرنا چاہئے،

(۵) عمر کی چال بڑی دھیمی اور خاموش ہے، برسوں اور مہینوں سے زیادہ تیز رو اور کوئی چیز نہیں جو شخص نیکی کا بیج بوتا ہے وہ دائمی راحت کا پھل کاٹے گا،

(۶) جس طرح غیر مستعمل لوہا زنگ آلود، ٹھہرا ہوا پانی گدلا ہو جاتا ہے اسی طرح کاہلی و بے شغلی دل کے تمام حوصلے پست کر دیتی ہے،

(۷) اگر زندگی حسنات میں صرف کی جائے تو وہ طویل ہو جاتی ہے

(۸) دریاؤں میں جس پانی کو تم چھوتے ہو وہ اُس پانی کا آخری حصہ ہے جو وہاں سے گزر چکا اور اُس پانی کا سب سے پہلا حصہ ہے جو آ رہا ہے یہی حال موجودہ وقت کا ہے،